یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

برہان

۱۰۲ || ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ مطابق جولائی ۱۹۸۸ء || شمارہ ۱

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

ایک ایسے وسیع وعریض ملک میں جہاں روز اوّل سے مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف ثقافتوں سے وابستہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ موجود ہوں ایک دوسرے فرقہ کے لوگوں کے مذہبی جذبات، تہذیبی قدروں اور لسانی احساسات کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے اور اسی طرح کے مخلوط سماجی نظام میں باہمی رواداری کے زریں اصول کو اپنائے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ترقی ناممکن ہے۔

ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی جس قوت اور شدت کے ساتھ فرقہ واریت، تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کو بڑھاوا ملا ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہم دوسرے میدانوں میں اس قدر ترقی نہیں کر پائے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ عدم تشدد کے جس اصول کی بنیاد پر ملک کو آزادی ملی، آزادی ملنے کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر ملک تشدد کی راہ پر چل پڑا۔

درحقیقت فرقہ واریت، تشدد، دہشت گردی، گروہی عصبیت اور لسانی جارحیت کو بڑھانے کے سلسلے میں ملک کی تہذیبی رنگا رنگی سے بہت سے لوگوں کی عدم واقفیت یا جان بوجھ کر انکار کر دینے کی عادت کو بھی زیادہ دخل ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ یہ ملک ایک خوبصورت گلدستہ کی طرح ہے جس میں

رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ ان پھولوں کو اپنے انداز میں مہکنے اور اپنے رنگ و روپ کو قائم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی پھول یہ چاہے کہ دوسرے پھول اس کے رنگ اور خوشبو کو اختیار کرلیں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ نہ کوئی اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والا فرد اپنا مذہب ترک کر کے اکثریت کے خوف اور ڈر سے ان میں شامل ہونے پر آمادگی کا اظہار کرے گا۔ اور نہ کوئی اکثریتی مذہب کا پیرو کار آسانی سے اپنا مذہب اور عقیدہ تبدیل کرنے پر راضی ہوگا۔ ہر فرقہ کی اپنی ثقافت، اپنی شناخت اپنی زبان، اپنی انفرادیت اور اپنی روایات ہیں۔

"قومی ایکتا" (NATIONAL INTIGRETION) کی بات

آج جس زوردار انداز سے کی جارہی ہے اور اس کے لئے تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ اور وسائل تشہیر اختیار کئے جا رہے ہیں اس تناسب سے اس کے نتائج قطعاً سامنے نہیں آرہے ہیں۔ دراصل "قومی یکجہتی" کے کاز کو تقویت اس وقت مل سکتی ہے جب ملک میں بسنے والے تمام فرقے اور اکائیاں اپنی تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ملک کی سالمیت، وحدت اور اس کی مجموعی بہبود و فلاح کے لئے متحد ہوکر سرگرم عمل ہوں اور اس طرح اپنی وطن دوستی کا ثبوت پیش کریں۔ مذہب کا پابند ہونا بُری بات نہیں ہے۔ بُری بات یہ ہے کہ دوسروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارے رنگ میں رنگ جائیں۔ "قومی دھارے" کا مطلب اگر کسی سیاسی رہنما یا جماعت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اقلیتی فرقہ اکثریتی فرقہ میں ضم ہوجائے تو یہ بات اس پر واضح ہوجانی چاہیے کہ اول تو اس ملک کا غیر فرقہ وارانہ سیکولر دستور اس بات کی تائید نہیں کرتا اور اگر بفرضِ محال کوئی دوسرا دستور اس کی تائید بھی کرتا تو یہ چیز

یہاں کے عوام کے لئے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہوتی ۔ اس لئے وہ فرقہ پرست اور تنگ نظر سیاسی تنظیمیں اور عناصر جو ہندوستان کی تہذیبی نیرنگی سے انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کے سبھی بسنے والے بلا امتیاز کسی خاص مذہبی اور معاشرتی رنگ کو اختیار کریں فی الحقیقت "قومی یکجہتی" اور مختلف اکائیوں کے مابین ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں ۔ وہ نہ تو ملک کے دستور کے وفادار ہیں اور نہ ملک کی وحدت و سالمیت کے طرفدار ۔

اگر اس طرح کی فرقہ پرست اور تنگ نظر جماعتوں پر قانونی طور پر پابندی نہ لگائی گئی تو یہ قوتیں کبھی مذہب کا نام لے کر، مذہب کے تقدس کا استحصال کر کے لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر، مذہب کی آڑ میں اور کبھی زبان کی بات کر کے جو حقیر مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ تو حاصل نہ ہو سکے گا البتہ ہر طرف طوائف الملوکی انتشار اور افتراق پھیل جائے گا ۔

انسان دوستی، احترام آدمیت ، خدمتِ خلق ، خیر خواہی ، ایثار و قربانی ، اخلاق و شرافت ، محبت و ہمدردی ، وسیع القلبی و رواداری ، اعلیٰ انسانی اصول اور اخلاقی اقدار ہیں ۔ موجودہ پُر آشوب اور خود غرضی و مفاد پرستی کے دور میں زندگی کے تمام شعبوں اور جملہ محاذوں پر یہ تعمیری جذبات ، پاکیزہ خیالات اور صالح افکار و نظریات کو اجاگر کر کے ان کی افادیت ، اہمیت اور ضرورت عام لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی شدید ضرورت ہے ۔

ہم اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے طریق کار میں مثبت اور سنجیدہ تبدیلی لائیں ، باہمی احترام و اکرام اور اعتماد و اعتبار کی فضا کو بڑھاوا دے کر ایک دوسرے کے جان و مال کا تحفظ اور واجبی حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری کا

ہم میں سے ہر فرد کے اندر پیدا ہو ۔ جبھی ہم ایک مثالی اور فلاحی معاشرہ اور پاکیزہ سماجی نظام کے قیام کی بنیادوں کو استوار کر سکتے ہیں ۔

مذہب و عقیدہ انسانی رشتوں میں دوری پیدا کرنے ، دراڑ ڈالنے ، باہمی منافرت اور تنگ نظری پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان رشتوں کو مزید مستحکم ، پائیدار اور انسانی وحدت کو مضبوط کرنے کے لئے ہوتے ہیں ۔

ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

کاش ملک و قوم کا دانشور طبقہ ، ارباب اقتدار ، صاحب منصب اختیار اور مختلف سماجی ، اصلاحی اور سیاسی ذمہ دار افراد و جماعت اس روشن حقیقت کو سمجھ کر اس کا پالن کریں ۔

کرپشن ، مہنگائی ، گرانی اور موقعہ پرستی نے اپنے تمام سابقہ ریکارڈ کو توڑ دیا ہے ۔ ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ غربت ، افلاس ، بیکاری ، بے روزگاری ، جہالت اور بیماری کے چنگل میں گرفتار ہو کر کس مپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے ۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے تمام تر تعمیر و ترقی کے دعووں کے باوجود اس کے فوائد اور ثمرات سماج کے پسماندہ اور نچلے طبقوں تک نہیں پہونچ رہے ہیں اور عام لوگ آج بھی اپنے آپ کو ذہنی و فکری اعتبار سے مفلس اور غلام ہی سمجھ رہے ہیں ۔ اگر ملک میں بسنے والی اقلیتوں میں جان و مال کے عدم تحفظ کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے تو دوسری طرف مذہبی ، لسانی ، تہذیبی اور سماجی تشخص و امتیاز کی طرف سے خطرات لاحق

ہیں۔ عام لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے، ان کے بنیادی آئین، انسانی اور جمہوری حقوق کا تحفظ و حصول اور مایوس کن رجحانات کے احساسات کو کم کرنے کے لئے زوردار عوامی تحریک چلانے کے ساتھ ساتھ قوم خاص طور پر نئی نسل کی ذہنی و فکری تربیت کی طرف اولین مرحلے میں توجہ دی جانی چاہیئے، جو ہمیں انسانیت، محبت اور جمہوریت کی راہ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے ے

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

مولانا فراہی رح کی تفسیرِ سورۂ فیل

ایک جائزہ

(۲)

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسی فصل میں آگے مولانا فراہیؒ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چڑیاں لاشیں کھانے کے لئے آئی تھیں۔ لکھتے ہیں:

"شعرار کا عام انداز کلام اجمال وکنایہ کا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تصریح وتفصیل نہیں کیا کرتے۔ بعض نے مجملاً چڑیوں کے دیکھنے کا ذکر کر دیا اور اسی قدر بس تھا۔ کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خور چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم ومشہور بات تھی۔ وہ فوج کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب رجیع کے قتل کی پیشین گوئی عمرو بن ربیعہ نے اسی دلیل سے کی تھی۔ بعض شعرار فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی۔ اس وجہ سے وہ بھی ساتھ ہولی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ عمرو بن حارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے:

إذا ما غزوا بالجيش خلق فوقهم   عصائب طير تهتدی بعصائب

جواغ قد ایقن ان قبیله   اذا ما التقی الجمعان أول غالب

[جب وہ فوج لے کر حملہ کرتے ہیں تو چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے اوپر منڈلاتے ہیں۔ وہ گرا چاہتی ہیں۔ کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انہی کا قبیلہ غالب رہتا ہے]

اسی مضمون کو ابونواس نے لیا ہے:

تتأئ الطیر غدوته   ثقة بالشبع من جزره

[جب میرا ممدوح جنگ کے لئے نکلتا ہے تو چڑیوں کے جھنڈ اس کے پیچھے اس یقین کے ساتھ چلتے ہیں کہ اس کے شکار سے اپنا پیٹ خوب بھریں گے] [1]

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کے اس استدلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۳۶ھ میں بصرہ میں جنگ جمل واقع ہوئی تھی۔ حجاز میں اس لڑائی کا حال اسی دن معلوم ہوگیا تھا۔ کیونکہ غول در غول پرندے کٹے ہوئے اعضاء چنگلوں اور چونچوں میں لئے ہوئے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔" [2]

مذکورہ اشعار میں شاعرانہ مبالغہ آرائی ظاہر ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وہ لشکر جنگ کے لئے چلتا ہے تو پرندوں کے جھنڈ اس یقین کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوگا تو

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۶۸-۶۹۔

[2] ارض القرآن سید سلیمان ندوی اول ص ۳۱۵ بحوالہ تاریخ طبری ذکر واقعہ جمل

اس کے شکار سے اپنا پیٹ بھریں گے۔ پرندوں کا لشکر کی کامیابی کا یقین کر لینا حقیقت واقعہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ سمجھ کر استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

واقعۂ فیل سے قبل بھی ایام جاہلیت میں بہت سی جنگیں ہو چکی تھیں جیسے جنگ بسوس، جنگ داحس وغبراء اور جنگ بعاث وغیرہ، جن میں ہزاروں جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد بھی بے شمار جنگیں ہوئیں، اور تاریخ میں ان جنگوں کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔ لیکن کسی جنگ کے بارے میں یہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے اس موقع پر آنے والے مردار خور پرندوں کا تذکرہ کیا ہو اور ان کی شکل وصورت اور قد وغیرہ کا اتنی باریکی سے تذکرہ کیا ہو۔ اگر جنگ کے موقع پر چڑیوں کا آنا ایک معمول تھا اور واقعۃً تھا تو اسے اتنی اہمیت دینے اور ان کی شکل وصورت، رنگ، چونچ کی ہیئت اور قد وغیرہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ روایتوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے موقع پر ضرور کوئی غیر معمولی اور خلاف معمول بات پیش آئی تھی۔ اسی لئے راویوں نے اہمیت دے کر چڑیوں کا تذکرہ کیا۔

قرآنی الفاظ اور اسالیب سے استشہاد:

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے لفظ 'ترمی' سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ترمی کا فاعل ہمارے نزدیک قریش ہیں جو الم تر کے مخاطب ہیں فعل ترمی چڑیوں کے لئے کسی طرح موزوں ہے ہی نہیں، چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگریزے تو گرا سکتی ہیں لیکن اس کو رمی نہیں کہہ سکتے۔ رمی صرف اسی صورت میں ہو گی جب پھینکنے میں بازو

یا ناخن کا زور استعمال ہو یا ہوائے تیز و تند تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔"[1]

مولانا اصلاحی کے آخری جملے سے خود ان کے اعتراض کی تردید ہو رہی ہے۔ ابوقیس بن اسلت یثربی جاہلی کے جو اشعار اوپر گزرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت خدائی فوجوں نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا اس وقت تیز و تند ہوا بھی چل رہی تھی" اس لئے چڑیاں جب اوپر سے پتھر گراتی تھیں تو تیز ہوا کی وجہ سے ان میں رمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مشہور محدث ابن ابی حاتم کی نقل کردہ روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے:

"عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے۔ انھوں نے اول تو آواز دی پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تیز و تند ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر کے مصیبت عظمیٰ بنا دیا۔"[2]

سیرت ابن اسحاق میں نفیل خثعمی کا جو شعر ہے اس میں 'ترمی' کا لفظ موجود ہے:

خشیت اللہ لما رایت طیرًا وقذف حجارۃ ترمی علینا

اسی لیے قرآن نے ایجاز و اعجاز کا نمونہ پیش کرتے ہوئے 'ترمی' کا لفظ استعمال

---

[1] تدبر قرآن ہشتم صفحہ ۵۶۷۔

[2] بحوالہ قصص القرآن سیوہاروی سوم صفحہ ۳۶۸

کیا تاکہ اس ایک لفظ سے پوری صورت حال کی تصویر کشی ہو جائے۔

(۲) ترمیھم کا مخاطب کون ہے؟ اس سلسلے میں مولانا فراہی فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔ یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے گویا واحد کا لفظ ایک ایک کرکے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں ... (کبھی کلام واحد کے صیغے سے شروع ہوتا ہے اور پھر جمع کی ضمیر آتی ہے کیونکہ واحد سے مقصود جمع ہوتی ہے) کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے لیکن اس سے مقصود وہی جمع ہوتی ہے۔" [1]

"خطاب کبھی نبی سے بحیثیت امت کے امام اور ترجمان ہونے کے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے خواہ تمام لوگ یا ان کی ایک جماعت اور کبھی خطاب بذات خود لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں خطاب واحد کے صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد نبیؐ کے واسطے کے بغیر پوری امت ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نبیؐ کے بعد آیا ہے اور کبھی پہلے، یہ التفات کے طریقے پر ہوتا ہے۔" [2]

پھر مولانا نے قرآن کے اس اسلوب کی متعدد مثالیں تفسیر سورۂ فیل اور اسالیب القرآن

---

[1] تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۱۳-۱۴

[2] اسالیب القرآن فراہی صفحہ ۱۵-۱۷ دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ

میں دیکھا ہیں، مثلاً:

ألم تر أن الفلك تجری فی البحر بنعمة الله لیریکم من

آیاته (لقمان - ۳۱)

ألم تر ان الله خلق السماوات والأرض بالحق، ان یشأ

یذهبکم ویأت بخلق جدید (ابراہیم - ۱۹)

إن تدعوهم الی الهدی لا یسمعوا وتراهم ینظرون إلیك

وهم لا یبصرون (الاعراف - ۱۹۸)

وقضی ربك ألا تعبدوا إلا ایاه وبالوالدین إحسانا،

إما یبلغن عندك الکبر أحدهما أو کلاهما فلا تقل لهما

اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا کریما (الاسراء)

مولانا نے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں دی ہیں لیکن ان تمام مثالوں کا استقرار کرنے سے ایک دوسرا ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خطاب کبھی واحد کے صیغے سے ہوتا ہے اور اس سے مراد جماعت ہوتی ہے لیکن وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ اور اشارہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اس واحد کے صیغے کے بعد یا اس سے پہلے جمع کا صیغہ ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واحد کا صیغہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ غالباً قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں کوئی ایسا قرینہ نہ پایا جاتا ہو اس کے باوجود واحد کا صیغہ جمع کے معنی میں ہو۔

یہاں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ سورۂ فیل میں الم تر سے مراد جمع ہے اس لئے اس کے بعد ترمیھم بھی جمع (ترمونھم) کے معنی میں ہے اس لئے کہ ألم تر قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ الم تر کے الفاظ قرآن میں

اکتیس [۳۱] مرتبہ آئے ہیں۔ قرآن یہ اسلوب اس وقت اختیار کرتا ہے جب کسی اہم بات کی طرف اشارہ کرنا اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے:

کسی اہم اور مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا: عاد و ثمود (الفجر۔ ۶) نمرود (البقرہ۔ ۲۵۸) بنی اسرائیل (البقرہ۔ ۲۴۳، ۲۴۶) اصحاب الفیل (فیل۔ ۱)۔

یا اہل کتاب (آل عمران۔ ۲۳) منافقین (النساء: ۶۰، ۷۷، المجادلہ ۸، ۱۴) مشرکین (ابراہیم۔ ۲۸، مریم۔ ۸۳، مومن۔ ۶۹)

شعراء (الشعراء۔ ۲۲۵) کے رویہ کی طرف توجہ دلانا۔

یا اللہ کی صفات کی طرف متوجہ کرنا (ابراہیم: ۱۹، ۲۴ المجادلہ۔ ۷)

یا آثار کائنات کی طرف توجہ مبذول کرنا (الحج: ۱۸، ۶۳، ۶۵ النور ۴۱، ۴۳ الفرقان۔ ۴۵ لقمان ۲۹۔ ۳۱ فاطر۔ ۲۷ الزمر۔ ۲۱)

فخر الرازی نے لکھا ہے:

"المراد من الرویۃ العلم والتذکیر وھو اشارۃ الی ان الخبر بہ متواتر، فکان العلم الحاصل بہ ضروریا مساویا فی القوۃ والجلاء للرویۃ" [۱]

[دیکھنے سے مراد جاننا یا یاددہانی کرنا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جس چیز کی خبر دی جارہی ہے وہ تواتر سے ثابت ہے اس لئے اس سے جو علم حاصل ہو رہا ہے وہ قوت و وضاحت میں رؤیت کے مساوی ہے]

---

[۱] تفسیر کبیر رازی صفحہ ۹۷/۳۲۔

مولانا فراہی نے بھی یہی لکھا ہے کہ :

"کسی امر کا اقرار کرانے کے لئے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے جب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہی بات کا ذکر آتا ہے۔" [۱]

معلوم ہوا کہ یہ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے اسے عام ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا۔

(۳) ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں تو ترتیب کلام یوں ہونی چاہئے تھی۔ "ترمیھم بحجارۃ من سجیل فجعلھم کعصف مأکول وارسل علیھم طیرًا ابابیل" اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں :

"یہ سوال جن لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے ہمارے نزدیک وہ عربیت کے ایک خاص اسلوب بلاغت سے ناآشنا ہیں وہ یہ کہ بعض مرتبہ کسی نتیجۂ خیر یا شر کی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے اس کو فعل کی پوری تفصیل سے پہلے ظاہر کر دیتے ہیں دعاؤں کی قبولیت ظاہر کرنے کے لئے .... قرآن نے یہ اسلوب جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آئے ہیں۔ یہاں سورۂ نوح سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ قال نوح رب إنھم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۳۴

الا خسارا... مما خطیئاتھم اغرقوا فادخلوا نارًا، فلم یجدوا من دون اللہ انصارًا۔ وقال نوح رب لا تذر علی الأرض من الکافرین دیارًا (نوح ۲۱-۲۶) ان آیات پر تدبر کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت نوح کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد ان کی قوم کا انجام رکھ دیا گیا ہے اور ان کی دعا موخر کر دی گئی ہے حالانکہ انجام پوری دعا کے بعد ہی سامنے آیا ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ قبولیت دعا کی مبادرت ظاہر کرنے کے لئے ترتیب کلام میں تقدیم و تاخیر کردی گئی بالکل اسی طرح اس سورہ میں ابرہہ کی فوجوں کا انجام ظاہر کرنے کے لئے ان پر چڑیوں کے بھیجے جانے کا ذکر پہلے کیا اور ان کے پامال ہونے کا ذکر اس کے بعد کیا۔ سورہ کا مزاج چونکہ قریش پر امتنان و احسان کا تھا اس وجہ سے بلاغت کا تقاضا یہی تھا کہ دشمن کی بد انجامی کی تصویر پہلے سامنے آجائے۔" [1]

مولانا اصلاحی نے سطور بالا میں جس اسلوب بلاغت کی طرف اشارہ کیا ہے ہمارے نزدیک سورۂ فیل میں وہ اسلوب نہیں پایا جاتا بلکہ ایک دوسرا اسلوب "تفصیل بعد الاجمال" پایا جاتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔ پہلے قرآن ایک واقعہ اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کے بعد اسی کو تفصیل سے بیان کرتا ہے جیسے سورۂ کہف کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:

"أم حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا، إذ أوی الفتیۃ الی الکھف فقالوا ربنا آتنا من لدنک رحمۃ وھیئ لنا من أمرنا رشدا فضربنا علی اذانھم فی الکھف

---

[1] تدبر قرآن صفحہ ۵۶۵-۵۶۶

سنين عددًا، ثم بعثناهم لنعلم أى الحزبين احصى لما لبثوا أمدًا، نحن نقص عليك نبأهم بالحق، إنهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى ... الخ (الکہف ۹-۳۶)

پہلے قرآن نے اجمال کے ساتھ تبلایا کہ اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی اور ہم نے انھیں سالوں سلائے رکھا۔ پھر انھیں بیدار کیا تاکہ وہ دیکھیں کہ وہ بالان کے کبھی زیادہ دنوں زندہ رہا۔ اس کے بعد پھر سے اصحاب کہف کا قصہ تفصیل سے بیان کیا۔ یہی اسلوب سورۂ فیل میں بھی ہے۔ پہلے قرآن نے اجمال کے ساتھ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الفیل کے "کید" کو ناکام کردیا پھر اس کی تفصیل یہ بیان کی کہ اس نے چڑیوں کو بھیج کر سنگباری کے ذریعہ تہس نہس کرکے کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ اس طرح ان کا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ:

مولانا فراہی نے ایک فصل میں تاویل میں غلط فہمی کے اسباب کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن وہ سراسر عقلی اور بے بنیاد ہے۔ ایک مثال یہاں ذکر کی جاتی ہے اسی پر مولانا کے ذکر کردہ دوسرے اسباب کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعض لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں انھوں نے چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے اس سے بعض سننے والوں کو گمان ہوا کہ یہ پتھر چڑیوں ہی نے پھینکے۔ اور ممکن ہے کہ بعض دیکھنے والوں کو بھی یہ شبہ ہوا ہو اور انھوں نے اپنے خیال کے مطابق واقعہ کو بیان کردیا ہو۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا عذر واضح ہے۔ سنگباری کے جو نتائج ظہور میں آئے وہ عربوں کی سنگباری کے اعتبار سے بہت زیادہ تھے۔ ابرہہ کی پوری فوج کا بھس کی طرح پامال ہوجانا قریش کی سنگ اندازی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ سنگ باری آسمان سے ہورہی ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو تمام فضا چڑیوں سے بھری ہوئی تھی اس وجہ سے خیال ہوا ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ ان ہی چڑیوں کا کرشمہ ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے یہ روایت سنی انھوں نے آیت کو بھی اسی پر محمول کر دیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح تھا کہ یہ آسمانی سنگباری عربوں کی سنگباری کے پردے میں ہوئی۔" [1]

ایک دوسری جگہ بھی اسی قسم کی قیاس آرائی کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

"جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل وصورت، ان کا رنگ، ان کی چونچوں کی زرد گونی، ان کا لاشوں پر گرنا سب کچھ بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی ہوگا۔ باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھیں تو یا تو انھوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کر لیا کہ یہ چڑیاں پھینک رہی ہیں یا ترمیھم کی ضمیر کا مرجع انھوں نے طیراً کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کئے بغیر آیت کی جو تاویل ان کے ذہن میں آئی اسی سانچہ میں انھوں نے قصہ کو ڈھال دیا۔" [2]

---

[1] تفسیر سورۂ فیل صفہ ۸۱

[2] ایضاً صفہ ۶۱

مولانا کے اس طرز تحقیق پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ جب عینی شاہدوں کو نا قابل اعتبار قرار دیا جائے تب تو بڑی آسانی سے کسی بھی واقعہ کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیکھنے والوں نے صحیح دیکھا، بتانے والوں نے صحیح بتایا اور سننے والوں نے صحیح سنا۔ کسی سے کوئی غلطی یا غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اس زمانے کے راویوں سے زیادہ تصریحات اس سلسلہ میں اس لئے نہیں ملتیں کیونکہ اس پر انھیں عین الیقین اور علم الیقین حاصل تھا۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ ہوگا کہ ایک زمانہ میں یہ چیز بھی معرض بحث بن جائے گی کہ چڑیاں سنگباری کرنے کے لئے آئی تھیں یا لشکر ابرہہ کی لاشوں کو کھانے۔

مولانا فراہی کی تاویل پر اعتراضات:

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ترمیھم کا مخاطب اہل مکہ کو مان کر یہ کہنا کہ چڑیاں لشکر ابرہہ پر سنگباری کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں، صحیح نہیں۔ سورۂ فیل کے الفاظ اور اسلوب میں غور کرنے سے بھی اس تاویل کی غلطی واضح ہوتی ہے۔ ذیل میں اسے ہم اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

(۱) سورۂ فیل کی پہلی آیت ہے: ألم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل۔

اس میں 'فعل' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ قرآنی استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ جب 'فعل' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو وہاں عذاب اور سزا کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ عذاب انسانوں کے ذریعے یا ان کی معاونت میں نہیں ہوتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ آندھی طوفان بھیج کر اور اجرام سماوی و

ازشی مسلط کرکے ہلاک کرتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

الفجر۔ ۶: ألم تر کیف فعل ربک بعاد

ابراہیم۔ ۴۵: وتبین لکم کیف فعلنا بھم وضربنا لکم الأمثال

المرسلات۔ ۱۸: کذلک نفعل بالمجرمین۔

الصافات۔ ۳۴: انا کذلک نفعل بالمجرمین۔

شروع کی تین آیتوں میں گزشتہ قوموں کی ہلاکت کا تذکرہ ہے اور موخرالذکر آیت میں جہنم کے عذاب کا بیان ہے۔ یہی معنی سورۂ فیل کی آیت میں بھی پایا جاتا ہے لیکن مولانا فراہی کی تاویل ماننے کی صورت میں عذاب میں انسانوں کی شرکت ومعاونت لازم آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ پر سنگباری کی اور اس کے پردے میں اللہ نے ان کو ہلاک کیا۔

(۲) سورۂ فیل کی تیسری آیت ہے: وأرسل علیھم طیرًا أبابیل

قرآن میں جب ہم "أرسل علی" کے فعل کا استقرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے یاتو غلبہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے یا انعام یا عذاب کے مفہوم میں۔ اول الذکر مفہوم کی مثالیں:

مریم۔ ۸۳: الم تر أنا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزھم ازًّا

النساء۔ ۸۰: ومن تولی فما ارسلناک علیھم حفیظًا مزید دیکھئے الشوریٰ۔ ۴۸۔

الاسراء۔ ۵۴: وما ارسلناک علیھم وکیلا

الانعام۔ ۶۱: ھو القاھر فوق عبادہ ویرسل علیکم حفظۃ

انعام کے مفہوم کی مثال:

ھود۔ ۵۲: یاقوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یرسل السماء

علیکم مدرارًا

[مزید دیکھئے: نوح - ۱۱، الانعام - ۶]

ان کے علاوہ دیگر تمام آیتوں میں عذاب کے معنی میں آیا ہے جیسے:

الاعراف - ۱۳۳: فأرسلنا علیهم الطوفان والجراد ... الخ

" - ۱۶۲: فارسلنا علیهم رجزا من السماء

العنکبوت - ۴۰: فمنهم من ارسلنا علیه حاصبا [مزید دیکھئے القمر - ۳۴، الاسراء - ۶۸، الملک - ۱۷]

الاحزاب - ۹: فارسلنا علیهم ریحًا وجنودًا لم تروها [مزید دیکھئے حم السجدہ ۱۶، الذاریات - ۴۱، القمر - ۱۹]

سبا - ۱۶: فارسلنا علیهم سیل العرم

القمر - ۳۱: انا ارسلنا علیهم صیحۃ واحدۃ

الذاریات - ۳۳: لنرسل حجارۃ من طین

الاسراء - ۶۹: فیرسل علیکم قاصفا من الریح

الکہف - ۴۰: فیرسل علیکم حسبانا من السماء

سورۂ فیل میں بھی "أرسل علی" عذاب کے معنی میں ہے جیسا کہ خود مولانا فراہی نے بھی لکھا ہے: أرسل علیهم، حرف علی میں یہاں غلبہ اور ضرر دونوں کا مفہوم پنہاں ہے۔"[1] فخر الرازی نے بھی فعل 'ارسال' کے عذاب کے معنی میں ہونے کا اشارہ کیا ہے[2]۔ لیکن مولانا فراہی کی تاویل کی صورت میں عذاب کا مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔ مولانا لکھتے

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۹۔

[2] تفسیر کبیر رازی ۳۲/۱۰۱

ہیں کہ لشکر ابرہہ کو اللہ تعالیٰ نے حاصب کے ذریعہ ہلاک کیا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے چڑیاں بھیجیں۔ گویا چڑیاں عذاب کے لئے نہیں بلکہ دفع مضرت کے لئے بھیجی گئی تھیں تاکہ اہل مکہ کو پیش آنے والی تکالیف اور پریشانیاں دور ہو جائیں۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل مکہ کا جینا دوبھر ہو جاتا۔" جبکہ قرآن اُرسل علیٰ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور قرآنی استقراء سے معلوم ہوا کہ قرآن اسے عذاب کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔

(۳) سورۂ فیل کی چوتھی آیت ہے: ترمیھم بحجارۃ من سجیل

اس آیت سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ "ترمیھم" کا مخاطب اہل مکہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اس میں سجیل کی قسم کے پتھروں کا تذکرہ ہے۔ اگر سنگباری اہل مکہ نے کی ہوتی تو "من سجیل" کی قید لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف "ترمیھم بحجارۃ" کہنا کافی تھا۔ حضرت ابن عباس کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ سجیل فارسی الفاظ سنگ اور گل کا معرب ہے۔ عربی زبان میں کنکر پتھر کے لئے متعدد الفاظ آتے ہیں لیکن ان میں سے صرف سجیل کا استعمال خاص معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سجیل کی قسم کے پتھر مکہ و نواح مکہ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر آخر اہل مکہ سنگباری کے لئے کہاں سے لے آئے تھے۔؟

یہ استدلال مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی نے بھی کیا ہے۔ اس پر جناب نسیم ظہیر اصلاحی صاحب نے بڑا مضحکہ خیز تبصرہ کیا ہے۔ جن آیتوں میں حجارۃ من سجیل اور حجارۃ من طین کے الفاظ آئے ہیں انہیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان آیتوں میں عرب بائدہ کا ذکر ہے۔ جن کو ایسی شدید اور تباہ کن آندھی کے ذریعے ہلاک کیا گیا تھا جو اپنے ساتھ سجیل کے قسم کے پتھر لئے ہوئے

آئی تھی اور مسلسل کئی روز تک چلتی رہی۔ یہ قومیں عرب تھیں اور سرزمین حجاز میں آباد تھیں ۔ انھیں ہلاک کرنے والی آندھی کہیں دور دراز سے کنکر پتھر لے کر نہیں آتی تھی بلکہ وہ جن راستوں سے گزرتی تھی انھیں میں پڑے ہوئے کنکر پتھر اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے چلتی تھی اب اگر اس علاقے میں سجیل کی قسم کے پتھر پائے ہی نہیں جاتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آندھیاں بھی اپنے ساتھ سجیل کے پتھر کہاں سے لائی تھیں ۔ ؟" [1]

یہ ایک فاش غلطی ہے ۔ قرآن میں سورۂ فیل کے علاوہ دو جگہ اور حجارۃ من سجیل کے الفاظ آئے ہیں (ہود ۔ ۸۲، الحجر ۔ ۷۴) اور ایک جگہ حجارۃ من طین کے الفاظ ہیں (الذاریات ۔ ۳۳) تینوں جگہ مراد قوم لوط ہے ۔ تاریخ اور جغرافیہ سے ادنیٰ سی بھی واقفیت رکھنے والا جانتا ہے کہ قوم لوط حجاز میں نہیں بلکہ حجاز سے سینکڑوں میل دور شام میں بحر مردار (DEAD SEA) کے کنارے آباد تھی ۔ اس لئے قوم لوط کو قلم کے زور پر سرزمین حجاز میں آباد کر دینا سخت غلطی ہے ۔

نئی تاویل کا سبب :

مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل کا مطالعہ کرتے وقت بارہا یہ خیال ذہن میں آیا کہ آخر مولانا کے ذہن میں یہ عجیب وغریب تفسیر کیسے آئی ۔ جبکہ کوئی روایت ساتھ نہیں دیتی ۔ تفسیر کی کسی کتاب میں ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا اور

---

[1] تحقیقات اسلامی ص ۵۵-۵۶ ۔

امت کی تاریخ میں کسی کی جانب سے یہ رائے سامنے نہیں آئی۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اشعار عرب کے وسیع وعمیق مطالعہ کے نتیجہ میں مولانا کے ذہن میں عربوں کی اخلاقی عظمت، شجاعت وبہادری، شہسواری اور شمشیرزنی کی تصویر مرتسم ہوگئی تھی۔ اس لئے ان کو شبہ ہوا کہ انھوں نے لشکر ابرہہ سے ضرور مقابلہ آرائی کی ہوگی۔ اسی کو بنیاد بنا کر مولانا نے اشعار عرب میں سے مجمل اشعار لے لئے اور انھیں اپنے مدعا پر دلیل بنا دیا، اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر سورۂ فیل پر نظر ڈالی اور جو جو اشکال آتے گئے انھیں قرآن کے مختلف اسالیب، قواعد نحو اور عربی اشعار سے حل کرتے گئے۔ اور جو روایتیں ان کے خلاف ملیں۔ انھیں "بے بنیاد، غلط اور لغو" قرار دے دیا۔ اور اس طرح تانے بانے بنتے بنتے سورۂ فیل کی ایک ایسی تفسیر وجود میں آئی جو حقیقت کے بالکل برعکس تھی۔ مولانا کے اس خیال کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"دنیا کے پردے پر کوئی قوم ایسی نہیں جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو۔ پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کرکے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے حمیتی کا گمان تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی نسبت بھی نہیں کرسکتے تو قوم قریش وبنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کرسکتے ہیں جن کا تمام تر سرمایہ فخر و نازش ہمیشہ شہسواری، شمشیرزنی اور قدر اندازی ہی رہا ہے یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ آنے نہیں دی۔" [1]

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۴۹۔

اہل مکہ کے لشکر ابرہہ سے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں۔ مولانا فراہی کا یہ استدلال سراسر عقلی اور قیاسی ہے۔ تاریخ کے کسی واقعہ کے ثبوت کے لئے محض قیاس کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے تاریخی شہادت مطلوب ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اس سلسلہ میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بلکہ مولانا کی فرض کردہ صورت پر کئی اعتراضات پڑتے ہیں:

(۱) کلام عرب میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اہل مکہ نے ابرہہ سے اپنے مقابلہ کا ہلکا سا بھی تذکرہ کیا ہو۔ بعد میں بھی بہت سی جنگیں ہوئیں لیکن کبھی اہل مکہ نے فوج کو ابھارنے اور جوش دینے کے لئے یہ نہیں کہا کہ "مقابلہ کرو جس طرح تم نے ابرہہ سے مقابلہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔ تمام اشعار میں لشکر ابرہہ کی تباہی کو صرف اللہ کا کرشمہ کہا گیا ہے۔ ذوالرمۃ کے اشعار میں مقابلہ کا جو ذکر ہے اس کے سلسلے میں ہم بتلا چکے ہیں کہ اس میں پہلے ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

عبدالمطلب نے دعا کے وقت کہا تھا:

یارب لا ارجو لهم سواك ویارب فامنع منهم حماك[1]

[اے رب ان کے مقابلہ کے لئے مجھے تیرے سوا کسی سے امید نہیں ہے۔ اے رب ان سے اپنے گھر کی حفاظت فرما]

انھیں کا شعر ہے:

منعت أبرهة الأرض التي حميت من الله ام ثم تخلق لهود الذ[2]

---

[1] نقوش رسول نمبر۔ سیرت ابن اسحاق صـ ۵۹

[2] ایضاً

مغیرہ مخزومی کہتا ہے:

انت حبست الفیل بالمغمس اھلکت أبا یکسوم والمغلس

کردستہم وانت غیر مکروس ندعسہم وأنت غیر مدعس[1]

[تو نے ہاتھی کو مغمس کے مقام پر روک دیا اور تو نے ابو یکسوم اور مغلس کو ہلاک کر دیا۔ تو نے ان کی ہڈیاں اور جوڑ بند توڑ دیئے، تو نے انھیں پامال کر دیا اور روند ڈالا اور ان کا تخریبی منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا]

طالب بن ابی طالب بن عبد المطلب کا شعر ہے:

ألم تعلموا ما کان فی حرب داحس وجیش أبی یکسوم اذ ملئوا الشعبا

فلولا دفاع اللہ لا شئ غیرہ لاصبحتم لا تمنعون لکم سربا[2]

[کیا تمھیں معلوم نہیں کہ داحس کی جنگ اور ابو یکسوم کے لشکر کا کیا انجام ہوا۔ جب انھوں نے وادی کو بھر دیا تھا۔ اس وقت اگر اللہ تعالیٰ انھیں دفع نہ کرتا تو تم قوم کی حفاظت نہ کر سکتے تھے]

ابو امیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے:

حبس الفیل بالمغمس حتی ظل یحبو کانہ معقور[3]

[اس نے ہاتھی کو مغمس میں روک دیا یہاں تک کہ گھٹنوں کے بل اس طرح چلتا تھا جس طرح وہ اونٹنی چلتی ہے جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں۔]

۱؎ سیرت ابن ہشام

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً

یہ اور ان کے علاوہ دیگر تمام اشعار میں صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ اور لشکر ابرہہ کی پسپائی کو اسی کا کرشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اہل مکہ کے مقابلہ کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

(۲) بدویانہ سنگ اندازی کی جو صورت فرض کی گئی ہے تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر اہل حجاز اس طریقے کے عادی تھے تو اس سے پہلے ہونے والی جنگوں میں بھی اس طریقہ جنگ کے اختیار کرنے کا تذکرہ کلام عرب میں ملنا چاہیئے۔ اور اگر انھوں نے پہلی مرتبہ یہ اختیار کیا تھا تو بھی اس کی صراحت ضروری ہے اور کلام عرب میں اس کا بھی حوالہ ملنا چاہیئے۔

(۳) عربوں کی شجاعت و بہادری، ہمت و دلیری، غیرت و حمیت، شہسواری و شمشیر زنی اور حریت پسندی کی داستانیں بجا۔ لیکن محض اس کی بنیاد پر تاریخ گڑھنا اور حقائق کے برخلاف نئی تصویر پیش کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کے لئے ٹھوس تاریخی حقائق مطلوب ہیں۔ تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں فتح مکہ کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے تو اہل مکہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ صرف حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کے دستہ سے بہت معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی۔ اب اگر کوئی اہل مکہ کی شجاعت و حمیت کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ ضرور ہوئی ہوگی تو اسے تاریخ بیانی نہیں، تاریخ سازی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہی حال واقعۂ فیل کا بھی ہے۔ تاریخی ثبوت نہ ہونے کے باوجود محض اہل عرب کی شجاعت کی داستانوں کی بنیاد پر ان کی معرکہ آرائی ثابت کرنا بعید از صواب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مکہ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مکہ پر کسی ناحق شخص کو مسلط نہیں کرے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ پر فتح پائی تو فرمایا:

"ان اللہ حبس عن مکۃ الفیل، وسلّط علیھا رسولہ والمؤمنین وانہ قد عادت حرمتھا الیوم کحرمتھا بالامس"۔ [۱]

[اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روک دیا اور اپنے رسول اور اہل ایمان کو اس پر تسلط بخش دیا۔ آج مکہ کی حرمت اسی طرح ہو گئی ہے جیسے کل تھی]

فتح مکہ کے بعد لوگ جوق درجوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ حضورؐ حق پر ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مکہ پر غلبہ بخش دیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے:

"اترکوہ وقومہ فانہ ان ظہر علیھم فھو نبی صادق"۔ [۲]

[انھیں (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) اور ان کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر وہ غلبہ پا جائیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سچے نبی ہیں]

پیش نظر مقالہ میں مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل کے صرف متعلقہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔ ورنہ واقعۂ فیل کے سلسلے میں دوسری رائیں اور بعض دوسری جزئیات بھی ہیں جن پر بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ہم انھیں قلم انداز کر رہے ہیں۔

مولانا فراہی نے اپنے اسی رسالہ کے آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

---

[۱] صحیحین۔

[۲] صحیح بخاری۔

ہے کہ مناسک حج میں "رمی جمار" کا اضافہ واقعہ فیل کے بعد اس کی یادگار کے طور پر کیا گیا اور اسلام نے اسے باقی رکھا۔ اس پر راقم نے ایک دوسرے مقالہ میں بحث کی ہے جو "مناسک حج کی تاریخ" کے عنوان سے ماہنامہ "حیات نو" اعظم گڈھ کے مئی و جون ۱۹۸۷ء کے شماروں میں شائع ہو گیا ہے۔ واللہ ولی الحق وھو ھادی السبیل۔

ختم شد

معذرت

مجھے اس بات کا بے حد دکھ اور احساس ہے کہ "برہان" کے سابق مرتب جناب مرحوم جمیل مہدی کے انتقال کے بعد میں ذہنی طور پر انتشار کا شکار رہا چنانچہ ماہ مئی ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں جناب سید شہاب الدین ندوی کا جو مقالہ شائع ہوا ہے اسے بین السطور دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ قبلہ قاضی جی مدیر اعزازی ہی ملاحظہ کر سکے تھے۔ اس کے علاوہ مذکورہ شمارہ میں ہی محترم ادیب جناب خلیل احمد صاحب کے مضمون میں بھی بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں جو بہر حال "برہان" کے معیار اور مزاج کے مطابق نہیں" مثلاً" داماد، صاحبزادی اور صاحبزادوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی بڑی خدمت کی الخ"۔ مفتی صاحبؒ کی اولاد کا یہ اولین فریضہ تھا یہ کوئی احسان نہیں۔ احسان تو قوم وملت کے ان اکابر اور بزرگوں کا ہے جنھوں نے ملت کے تعلق سے بے لوث خدمات انجام دیں، وغیرہ۔ نیز سابقہ رسالوں میں جناب اظہر صدیقی یا متفرق معاصر اخبارات نئی دنیا وغیرہ میں غیر موزوں جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیر علمی چیزیں برہان میں شائع ہونا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اس طرح کی تمام تحریروں کو کالعدم سمجھا جائے اور ادارہ کی فروگذاشت کو نظر انداز کر کے معذرت قبول کی جائے۔

(عمید الرحمن عثمانی)

تاریخ اسلام

خلافت راشدہ و بنی امیہ

(آخری قسط)

از جناب عبدالرؤف خاں صاحب ایم۔اے، اودئی کلاں

پروفیسر خورشید احمد فارق صاحب نے اپنی معنون بالا تصنیف میں کئی مقامات پر "جہاد" کی خالص مادی و اقتصادی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے اس کے اعلیٰ و ارفع روحانی مقصد کو سرتاسر معکوس اور منقلب کر دیا ہے۔ مثلاً ص ۱۳۵ پر عنوان "مسلمانوں کی اقتصادی حالت" کے تحت ارقام فرماتے ہیں:

"ابوبکر صدیق رضؓ نے ردّہ بغاوتیں فرو کر کے جب عراقی و شامی سرحدوں پر فوج کشی کی اور کئی نئے محاذ کھل گئے تو سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا، ان کی ترغیب پر حجاز و یمن کے درجنوں مفلوک الحال عرب قبیلے جنگ میں شرکت کے لیے آگئے تھے اور وسائل سے بھرپور دونوں پڑوسی ملکوں کی سرحدیں جنگیں جیت کر فقر و ناداری سے نجات پا چکے تھے...... عمر فاروق کے عہد میں عراق، شام، فارس، میسوپوٹامیہ اور مصر میں بہت سے نئے محاذ کھلے اور بڑی بڑی جنگوں کی تیاریاں ہوئیں تو پھر سپاہیوں کا توڑ پڑ گیا...... (عمر فاروق کی پکار پر) ...... بہت سے عرب جو ناداری کا شکار تھے اور بہت سے قبائلی رئیس جن کے دل میں کارہائے نمایاں کر کے دولت، عزت اور مرتبے حاصل کرنے کی لگن تھی، عمر فاروقؓ کی پکار پر اپنی ریگستانی بستیوں سے نکل آئے اور خلافت کی فوجوں میں ضم ہو گئے"۔ اس سے بیشتر ص ۷۰

پیرا نمبر ۲ پر بھی بہ تغیر خفیف یہی بات سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔

فاضل پروفیسر صاحب نے جہاد اور بدوی قبائل کے اسلامی اسلامی افواج میں انضمام کا وہی مقصد قرار دیا ہے جو مشہور مستشرق سر ہملٹن الیگزینڈر گب، متوفی ۱۹۷۱ء نے اپنے ایک مقالہ "اسلامی تاریخ کی تعبیر"

(An Interpretation of Islamic History)

میں واضح کیا ہے کہ "چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات میں استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لیے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو اُن پر اس کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔[1]

بدوی قبائل کے خلافت کی فوجوں میں ضم ہونے اور اُن کے اسلام قبول کرنے نیز مقصد جہاد کی تعبیر و توضیح میں مذکورہ دونوں بیانات پڑھنے کے بعد قارئین برہان پر یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیئے کہ مستشرقین کے صفِ اول کے اسکالر سر ہملٹن گب

---

[1] مقالہ بعنوان "سر ہملٹن الیگزینڈر رسکین گب"، از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب مشمولہ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، بابت ماہ اکتوبر ۸۲ء ص ۲۷۸۔

اور پروفیسر فارقی صاحب کے طرزِ نگارش میں کتنی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے۔ گویا: ع میری زباں میں رنگ تمہاری زباں کے ہیں

جہاد کے مبینہ مقصد پر خاکسار راقم الحروف اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کے بجائے محترم پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے الفاظ مستعار میں عرض کرنا چاہے گا کہ "تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتا سر معاشی و مادی اندازِ فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دین اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اُس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا .... ہمارے نزدیک یہ رویہ فنِ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے اس لیے کہ اس رویہ سے اُسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر جدید محققین ناز کرتے ہیں[۵]" مورخ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اپنے پیشرو مورخین کے بیانات کو "باندازِ دگر" پیش کردے بلکہ اُسے تمام تر حالات کے تجزیے سے اسباب و علل اور اُن کے اثرات و مضمرات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنی چاہیے جو واقعات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ بہرحال جہاد کے اقتصادی مقصد کی مزید توضیح فرماتے ہوئے ص ۶- ۲۴۵ پر رقمطراز ہیں: "اسلامی معاشرے کو جس ضابطے سے اقتصادی توانائی اور سیاسی عروج حاصل ہوا وہ دربارِ خداوندی میں مورتیوں کے تقرب کے قائل یا رسول اللہؐ کی نبوت سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ و قتال کا ضابطہ تھا۔ اسے رسول اللہؐ کی زندگی میں بے حد اہمیت حاصل تھی وہ جب تک جیے

---

۵ ایضاً ص ۲۷۹-

اس ضابطے پر بڑی تندہی سے عمل کرتے اور کراتے رہے اور اس کی توثیق وتاکید برابر وحی کے ذریعہ ہوتی رہی۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ۔ (بقرہ ۲۱۶) تم پر جنگ وقتال فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔ وَقَاتِلُوْھُمْ حَیْثُ (حَتّٰی) لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (انفال ۳۹) مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہے۔) فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ (توبہ ۵) جہاں کہیں بھی مورتیوں کی تعظیم کرنے والے تمہیں ملیں انھیں قتل کردو۔ وَقَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ۔ (توبہ ۱۲۳) اپنے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو۔ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ (انفال ۶۰) مخالفین سے لڑنے کے لیے جس قدر ممکن ہو فوج اور جنگی گھوڑے تیار رکھو۔ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (انفال ۶۵)[۵۳] اے نبی مسلمانوں کو غیر مسلموں سے لڑنے پر اکساؤ۔ مدینے کے دس سالہ قیام میں رسول اللہ کے فوجی اقدامات کا تناسب فی سال سات سے زیادہ رہا۔ انھوں نے بذات خود عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف تقریباً سوا دو درجن فوجی مہموں کی خود قیادت کی اور علی اقل التقدیر چار درجن مہمیں اپنے سالاروں کی کمان میں بھیجیں، وسائل خورد ونوش کی عام کمی اور قدرت کی طرف سے ملک میں اس غیر مساویانہ تقسیم کے باعث عربوں میں لوٹ مار اور جنگ وقتال کا رجحان پہلے ہی بڑھا ہوا تھا۔ اس ضابطے پر عمل اور اس کی پیہم تاکید اور غنیمت سے حاصل ہونے والے عظیم مالی فوائد کے لیے جنگ وقتال اور جارحانہ ترکتاز اسلامی معاشرے کے مزاج اور خمیر کا جزء لاینفک بن گیا تھا۔" ص ۶۹-۷۰ پر بھی بغیر ازیں بر ترمیم

---

۵۳ آیات شریفہ پر نمبر راقم الحروف نے تحریر کیے ہیں۔ اے۔ رؤف۔

خفیف محولہ بالا عبارت ارقام فرمائی جا چکی ہے۔ البتہ یہاں سورہ براءت کی آیت ۲۹ " قَاتِلُوا الَّذِينَ ...... هُمْ صَاغِرُونَ) کا اضافہ فرماتے ہوئے جنگ و قتال کا اصطلاحی نام " جہاد " بتلایا ہے۔ نیز ص ۱۳ - ۱۱۲ پر بھی جہاد کے اسی مفہوم کا اعادہ بزیر عنوان " جہاد " کیا گیا ہے مگر یہاں یہ اضافہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ " جہاد ہر مسلمان کے لیے مذہبی فریضہ ہی نہیں تھا جس سے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل ہوتی تھی بلکہ اقتصادی خوشحالی اور دنیوی سربلندی کا زینہ بھی تھا۔ اسلامی معاشرے کی اقتصادی عمارت کی تشکیل عہد نبوی ہی سے منہزم غیر مسلموں کی دولت اور ان کے بال بچوں کی خدمت سے ہوئی تھی جو غلام بن کر غازیوں کے ہاتھ آئے تھے۔ اس دوطرفہ فضیلت کے باعث جہاد اسلامی نفسیات کا جزء لاینفک اور رسول اللہ ﷺ کے جانشینوں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔"

مذکورہ بالا عباراتِ زیرِ بحث میں فاضل پروفیسر صاحب نے آیاتِ جہاد کو ان کے سیاق و سباق سے کاٹ کر مقصدِ جہاد کی توضیح اس انداز و اسلوب میں پیش فرمائی ہے کہ قاری کے ذہن پر بقول اکبر الہ آبادی بالاستیعاب تاثر قائم ہوتا ہے کہ " بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے " ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مستشرقین کے تتبع اور تاسی میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ یورپین فضلاء کا کہنا ہی یہ ہے کہ غزوات سراپا شوقِ شہادت اور اللہ کے دین کی سربلندی جیسے پاکیزہ جذبات و اعلیٰ مقاصد کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب، نادار، مفلوک الحال اور ننگے بھوکے مہاجرین و انصار کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور ان کی پرانی خوئے الیتاج کے تحت لوٹ مار کر کے عظیم مالی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ تھے۔ علاوہ ازیں اقتباساتِ بالا میں بعض آیات کا ترجمہ بھی محلِ نظر ہے،

مثلاً سورۂ انفال کی آیت ع۳۹ کا یہ ترجمہ "مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں سے لڑو یہاں تک کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب باقی نہ رہے" اس کے بالمقابل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ "اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ اُن میں فسادِ عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے" ہماری رسائی کی حد تک دیگر مشاہیر مترجمین نے بھی تقریباً بہ تغیر خفیف حضرت تھانوی رح کے ترجمہ کے ہم معنی ہی ترجمہ کیا ہے۔ مزید برآں سورۂ براۃ کی آیت نمبر ۱۲۳ کے صرف درمیانی فقرہ قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ (اپنے پڑوسی غیر مسلموں سے لڑو) پر اکتفاء کرلیا گیا ہے جو علمی وقار و متانت کے منافی ہے۔ موصوف کے بیان کردہ ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ہمسایہ غیر مسلموں سے لڑنے کا جبری حکم دیا جارہا ہے۔ جو پڑوسیوں سے متعلق قرآنی تعلیمات اور ہدایاتِ نبوی ؐ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس پوری آیتِ شریفہ کا ترجمہ یہ ہے، "اے لوگو جو ایمان لائے ہو جنگ کرو اُن منکرینِ حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔" (ترجمہ مولانا مودودی علیہ الرحمۃ) اس کی تفسیر میں مولانائے مرحوم فرماتے ہیں کہ "یہاں قریب اور پاس پڑوس سے مراد غیر مسلموں کا وہ علاقہ ہے جو دارالاسلام سے نزدیک ہے یعنی پہلے اِن سے لڑا جائے اور پھر اُن سے جو دُور ہیں" اور منکرینِ حق اور کفار سے مراد وہ منافق لوگ ہیں جن کا انکارِ حق پوری طرح نمایاں ہو چکا تھا اور جن کے اسلامی سوسائٹی میں خلط ملط رہنے سے سخت نقصانات پہنچ رہے تھے۔[۱]

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی اُس آیت کو پیش کردیا جائے جس میں سب سے

---

[۱] تلخیص تفہیم القرآن ص ۵۳۹ ج نمبر ۴۴، ستمبر ۱۹۷۹ء ایڈیشن نیز تفہیم القرآن ۲: ۲۵۲ حواشی ۱۲۱ تا ۱۲۳ بھی دیکھے جائیں۔

پہلے جہاد کی اجازت دی گئی ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ غنیمت حاصل کرنے کے لیے "جارحانہ ترکتاز" کی اجازت فرما رہے ہیں یا صرف مدافعت کی۔
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (بقرہ ۱۹۰) یعنی "اور تم لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو، واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔" یعنی یہ جو فرمایا کہ جو تم سے لڑیں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بوڑھے قصداً نہ ماریئے لڑنے والوں کو ماریئے۔" (موضح القرآن) قرآن مجید میں یہ اول آیت ہے کہ جس میں جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔[۵] (حقانی) اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد جہاد کی پہلی آیت جو نازل ہوئی، وہ یہ ہے: اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۔" (اُن لوگوں کو اجازت دیدی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ اُن پر ظلم کیا گیا) یہ اور دیگر آیاتِ جہاد اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ جہاد کوئی جارحانہ فعل یا مسلمانوں کی طرف سے زیادتی کے طور پر نہیں تھا بلکہ وہ مدافعانہ اور تمام تر دفاعی تھا جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے۔[۶]

دراصل پروفیسر فاروقی صاحب نے مقاصدِ جہاد کے استنباط و استنتاج میں بجائے

---

[۵] ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ۱: ۱۵۰ ج ۲۰۱ مئی ۱۹۸۳ء ایڈیشن نیز ماہنامہ برہان دہلی اپریل ۱۹۸۲ء ص ۲۰۹، حاشیہ ۳ مقالہ خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض از جناب مولوی شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور ۵۰۔

[۶] ملاحظہ ہو "مقالہ" خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض از جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی بابت اپریل ۱۹۸۲ء ص ۲۰۹/۱۷ ج ۳ نیز سیرۃ النبیؐ ۱: ۹۰ مطبوعہ ۱۹۸۳ء۔

مورخانہ دلائل کے ذاتی ذوق پر اعتماد فرمایا ہے اور صرف اُن باتوں کو قبول کیا جن سے اُن کے مبینہ موقف کی تائید ہوتی تھی، موضوعیت سے انحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو علمی روح اور متانت وسنجیدگی اور حقائق و واقعات سے خالی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے تمامتر غزوات وسرایا کو بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے"[۵۷]

مذکورۃ الصدر اقتباسات میں فاضل پروفیسر صاحب نے جہاد کے خصوصی طور پر دو مقصد قرار دیے ہیں یعنی سیاسی بالادستی اور اقتصادی توانائی حاصل کرنا۔ لیکن اِن مقاصد کو اسلامی تعلیمات سے کوئی مناسبت نہیں کیونکہ جب کبھی نبیٔ اکرم علی تحیۃ والسلام سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص غنیمت کے لیے دوسرا ناموری کے لیے اور کوئی اظہارِ شجاعت اور اپنے رتبہ کو بلند کرنے کے لیے جہاد وقتال کرتا ہے تو ان میں سے کس کا جہاد راہِ خداوندی میں خیال کیا جائے گا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ صرف اس شخص کا جہاد اللہ کی راہ میں سمجھا جائے گا جس نے اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جہاد کیا ہو[۵۸] چنانچہ آپؐ کی تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ مالِ غنیمت جو سب سے زیادہ مجبوب ومرغوب شے تھی صحابۂ کرامؓ کے دلوں سے بالکل اتر گئی اور اُن کے اذہان میں مقصدِ جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ رہ گیا۔۔۔۔۔۔ چنانچہ مجاہدین اولین کو جو چیز میدانِ جنگ میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ لے جاتی تھی وہ دوسروں کی دولت ومحنت کے

---

۵۷ سیرت النبیؐ ۵: ۲۹۹ مطبوعہ ۱۹۸۳ء
۵۸ ماہنامہ برہان دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۱۳/۲۱ ۔ مقالہ مذکور نیز سیرۃ النبیؐ ۱: ۶۱۵ مطبوعہ ۱۹۸۳ء۔

ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا لالچ نہ تھی[۵۹] رہا سیاسی عروج و استیلا ر تو یہ بھی دینِ حق کی سربلندی کے لیے ہے نہ کہ ذاتی اغراض و خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے۔ جہاد کے سلسلہ میں لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم کی مصداق قارئینِ برہان کی سمع خراشی قدرے زیادہ ہی ہوگئی ہے جس کے لیے راقم الحروف معذرت خواہ ہے۔ موصوف کی تصنیف میں نہ صرف جہاد بلکہ دیگر واقعات کے پس پردہ بھی صرف معاشی و مادی محرکات کو ہی نمایاں مقام حاصل ہے جس سے ذہن پر یہ تاثر پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اُس عہد میں "بے قید جنسی میل ملاپ" کے سبب معاشرے میں نفسانی شہوات اور نان و نوش و تن و توش کا غلبہ زائد از ضرورت تھا جس میں لوگ صرف اسیرِ مرغ و ماہی ہو کر رہ گئے تھے اور اُن کی زندگی کی تمام تگ و پو محض شکم پروری کی حد تک محصور تھی جس میں زندگی کے اعلیٰ روحانی مقاصد کا یکسر فقدان و بحران تھا۔

تاریخِ اسلام، خلافتِ راشدہ و بنی امیہ کے فاضل مصنف حضرت امام حسن رضؓ کی سراری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ، "اُن کی چہیتی کنیزوں کے بارے میں بھی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اُس زمانے میں سراری رکھنے کا عام رواج تھا اور خود اُن کے والد علی حیدر رضؓ کی سترہ سراری تھیں اس لیے غالب قرینہ ہے کہ امام حسن رضؓ کے بھی سراری رہی ہوں گی"۔ (ص ۲۵۸) ہمارے انتہائی ناقص و محدود مطالعہ میں اب تک یہی آیا تھا کہ تاریخ واقعات و حقائق کے تحقیقی مطالعہ کا نام ہے نہ کہ ظنین و قرائن پر منحصر تحریر کا۔ مگر مذکورہ تحقیق پڑھ کر معلوم ہوا کہ تاریخ میں

---

۵۹ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از حضرت علی میاں صاحب ادام اللہ فیوضہم ص ۷۰ - ۱۶۹ نیز ۲۲ - ۱۲۱ و ۱۶۲

"غالب قرینہ" کو بھی بڑا دخل ہے اور ظن و تخمین کی بیساکھی کا سہارا لے کر آسانی سے کسی بھی تاریخی کردار کی شکل و صورت آسانی سے مسخ کی جا سکتی ہے۔ غرض مدعا یہ کہ جب امام موصوف کی سراری کے ضمن میں عصری تواریخ سے کسی قسم کی معلومات بہم نہیں ہوتیں تو پھر ظنی طور پر یہ فرمانا کہاں تک درست ہے کہ اُن کے والد کے سترہ سرادی تھیں" اس لیے غالب قرینہ ہے کہ امام حسن رضؓ کے بھی سرادی رہی ہوں گی"۔ شاید اسی کا نام مضمون آفرینی ہے۔ ۵

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے — مضمونِ بلند لامکاں سے لائے

بہر حال ایک مورّخ کے لیے آزادیٔ رائے کے باوجود حقائق مقدس ہونے چاہییں۔

تبرّا کی شروعات کے تحت فرماتے ہیں کہ "تبرّا کی ابتدا خود علی حیدر رضؓ نے کی تھی جس کا جواب امیر معاویہ رضؓ نے بھی تبرّا سے دیا تھا ...... (۵۵۰) اس سے پیشتر ص ۳-۲۶۲ پر بھی اس سلسلہ کی یہ عبارت موجود ہے، "تحکیم کے بعد علی حیدر رضؓ نے نماز وتر میں دعائے قنوت کے بعد امیر معاویہ رضؓ، اُن کے مشیرانِ خاص پر لعنت بھیجنا شروع کر دی تھی اور اس کے جواب میں امیر معاویہ رضؓ نے بھی علی حیدر رضؓ اور اُن کے بعض ممتاز مقربوں پر مسجدوں میں لعنت بھیجنے کا حکم دیدیا تھا"۔

لیکن اس کے برعکس شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ "اموی خلفاء نے ایک بُری عادت یہ جاری کی تھی کہ وہ خود اور اُن کے تمام عمال خطبہ میں حضرت علی رضؓ پر لعن طعن کیا کرتے تھے اور اِسے خطبہ کا جزء بنا دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اِسے بالکل بند کر دیا اور تمام عمال کے نام فرمان جاری کر دیا کہ حضرت علی رضؓ کے متعلق جو ملامت آمیز الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ بند کر دیں اور اس کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت داخلِ خطبہ کریں، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ جو آج تک جاری ہے"۔ ۵۱

---

۵۱ تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۲۱۹، مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔ تاریخ الخلفاء حصہ دوم ص ۱۷۱۔

(باقی صفحہ ۱۱۱ پر دیکھیں)

علاوہ ازیں علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) صاحب البدایہ والنہایہ نے اِس واقعہ کی تردید کی ہے اور بالصراحت لکھا ہے اِنَّ ھذا لم یصح - بالفرض یہ دعا کسی حد تک تسلیم بھی کر لی جائے تو بغیر لعن کی تھی - کیونکہ یہ بات حضرت علی رضؓ کی علوشان سے بعید تر ہے کہ عورتوں کی طرح بیٹھے ہوئے حریف کو کوسا کریں[11] ایک دفعہ جب آپ رضؓ سے جمل اور حنین کے مقتولین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو جواباً فرمایا کہ بجز طرفین کے مقتولین جنتی ہیں بشرطیکہ اُن کے دل صاف ہوں[12] پھر حیات اور زندہ لوگوں کے بارے میں نا ملائم الفاظ کہنے کی ابتداوہ کیوں کر کر سکتے تھے اور واقعہ ہے کہ نہ تو حضرت علی رضؓ نے حضرت معاویہ رضؓ پر لعن کیا اور نہ حضرت معاویہ رضؓ نے امیرالمومنین حضرت علی رضؓ پر[ع۵] ابولولو کے قاتلانہ حملہ کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر رضؓ نے اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے ایک چھ رکنی پینل مقرر کر دیا تھا تاکہ یہ پینل بعد از مشاورت اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلے - چنانچہ بقول فاضل پروفیسر صاحب "پینل کے ارکان خلافت کے لیے اپنی اپنی فضیلت، جہادی خدمات اور اہلبیت کا پُرزور اظہار کرنے لگے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے -" (ص ۱۴۵)

(حاشیہ بقیہ نمبر ۱۰) از علامہ سیوطیؒ - ناشر ادارہ درسِ اسلام دیوبند -

[11] تاریخ ابن خلدون ۱: ۵۷۸ حاشیہ ۱ مطبوعہ دیوبند -

[12] مقدمہ ابن خلدون (اردو) جلد اول ص ۳۸۳ بحوالہ طبری -

[ع۵] بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرات شیخین رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ پر سب و شتم اور طعن و تشنیع کی مذموم رسم کا آغاز عبداللہ ابن وہب ابن سبا المعروف بہ ابن السودا نے کیا تھا جو ایک یہودی الاصل غالی شیعی تھا - برائے حوالہ دیکھیے مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم - اے - آئی - ای - ایس ص ۱۳۹ -

جب حضرت علی رضؓ کو اپنے منتخب ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو وہ اپنے "گھر گئے اور اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب اور دوسرے ہاشمی بزرگوں سے شکایت کی .... (اور کہا) عمرؓ نے وصیت کردی ہے کہ خلیفہ وہ فریق ہوگا جسے عبدالرحمٰن کی تائید حاصل ہو۔ بخدا اگر عمر جیتے رہے تو میں بتاؤں گا جیسی انھوں نے ہماری حق تلفی کی ہے اور اب اور پہلے جیسی جیسی ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کرتے رہے ہیں اور اگر مر گئے جیسا کہ پورے آثار ہیں تو بیتل کے باقی رکن یقیناً خلافت سے ہمیں محروم کردیں گے اور اگر انھوں نے ایسا کیا اور یقیناً وہ ایسا کریں گے تو میں بھی انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔" (ص ۱۴۶)

بینہ مزاجی کیفیت کسی مغلوب الغضب اور بندۂ حرص و آز شخص کی تو ہوسکتی ہے مگر کاظم غیظ اور فاتح قموص اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب جیسے پروردۂ رسولؐ کی نہیں۔ محولہ بالا اقتباس سے بلا ابہام و تردد یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علی حیدر رضؓ اپنے اندر نہ صرف یہ کہ خلافت پانے کی آرزو رکھتے تھے، بلکہ اس کی حرص و طمع کا جذبہ بھی ان کے دل و دماغ پر محیط تھا، جو کہ ارشاد نبوی ؐ "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے،، کے یکسر منافی ہے اور یہ باور کرنے کا کوئی امکان نہیں کہ حضرت علی رضؓ تک آپ ؐ کا یہ ارشاد گرامی نہ پہونچا ہو۔ رسولِ اکرم ؐ نے بشمول حضرت علی رضؓ تمام صحابۂ کرام رضؓ کی جس طرز پر برسہا برس اصلاح و تربیت فرمائی تھی اُس کے پیش نظر یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ حضرات "حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہوجایا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائیکہ وہ اچانام

حکومت کے لیے پیش کریں، اپنے منہ سے اپنی تعریف کریں اور اپنی ذات کے لیے پروپیگنڈہ کریں [۱۳] اور اس کے دعویدار بنیں۔ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر ہو گی اور اس نے مختلف امتوں، قوموں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہو گا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ صحابۂ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو، فتنہ اور افتراق سے نفور اور نفسانیت و دنیا داری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری [۱۴] خلیفۂ ثانی اور حضرت علیؓ کے باہمی تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے اور وہ اہلِ بیت کا احترام بھی حد درجہ ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے یہاں تک کہ دیوانِ عطا کے رجسٹر میں ناموں کے اندراج کی ابتداء بھی حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے اسماء گرامی سے ہی کرائی گئی۔ ۱۶ھ میں اپنے سفرِ شام کے وقت حضرت عمرؓ نے خلافت کا چارج بھی حضرت علیؓ کے ہی سپرد کر دیا تھا نیز مہمات ملکی میں وہ حضرت علی حیدرؓ سے برابر مشورہ لیتے رہتے تھے۔ اور ان دونوں حضرات کے اتحاد و یگانگت کا آخری مرتبہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت ام کلثومؓ کو جو فاطمہ زہراؓ کے بطن سے تھیں ان (حضرت عمرؓ) کے عقد میں دے دیا تھا [۱۵] پھر کیسے یقین کیا جائے کہ اُن کے آپسی تعلقات میں کشیدگی تھی۔

---

[۱۳] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۱۵۳۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی۔

[۱۴] تاریخ دعوت و عزیمت ۱/۲۸۲-۳۲۷- طبع چہارم از مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم۔

[۱۵] دینِ اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں۔ ص ۴۲۔ پہلا ایڈیشن۔ از مولانائے محترم حضرت علی میاں صاحب ادام اللہ فیوضہم۔

حضرت عثمان غنی رضؓ کی حویلی کا محاصرہ کرنے اور اُن کی شہادت کے واقعہ میں مصری جتھے کے ساتھ محمد بن ابی بکر رضؓ بھی شامل تھے چنانچہ فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ اس مصری جتھے کو جو سب سے بڑا تھا (دو جتھے اور بھی تھے) علی حیدر رضؓ کی اخلاقی تائید حاصل تھی ......" (ملاحظہ ہو موصوف کا مضمون "اعتراضات کے جواب مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی ص۱۰ فروری ۱۹۸۴ء)۔

ہمیں یہ تسلیم کہ خلیفہ کے خونِ ناحق کے دھبّوں سے محمد بن ابی بکر رضؓ کا دامن پاک نہ تھا کیونکہ اولاً یہی محمد بن ابی بکر رضؓ عقب سے عمرو بن حزم انصاری کے مکان سے چھلانگ لگا کر کاشانۂ خلافت میں گھسے تھے۔ لیکن محمد بن ابی بکر رضؓ اور مصری جتھے کو نہ تو حضرت علی رضؓ کی اخلاقی تائید ہی حاصل تھی اور نہ کسی قسم کا اشتراک و تعاون ہی۔ اس کے برعکس حضرات حسنین رضؓ اور آپ رضؓ کا آزاد کردہ غلام تنبر عین دورانِ محاصرہ ایوانِ خلافت کے دروازہ پر بطور گارڈ متعین تھے، بہ این سبب محاصرین عقب سے کود کر داخل ہوئے۔ مغازی کے مشہور عالم عروۃ بن الزبیر رضؓ (پیدائش غالباً ۲۶ھ اور انتقال تقریباً ۹۴ھ) کے اس قول سے کہ " علی اس سے بہت زیادہ متقی تھے کہ وہ قاتلین عثمان کی مدد کرتے اور عثمان بھی اس سے کہیں زیادہ پرہیزگار تھے کہ علی ان کو قتل کرا دیتے"[۱۶] اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ باغیوں کو حضرت علی رضؓ کی اخلاقی تائید حاصل تھی۔ خود حضرت علی رضؓ کو جب اس حادثۂ ناجعہ کا علم ہوا تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے! " خدایا! تو گواہ رہ کر میں عثمان کے خون سے بری ہوں"[۱۷] اور یہ بھی فرمایا کہ

۱۶؎ سیرۃ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین، مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب ص ۲۶۔

۱۷؎ عثمان ذو النورین رضؓ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی ص ۲۶۱، تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطی حصہ دوم قسط ۲ ص ۳۷ نیز تاریخ ابن خلدون جلد اول قسط ۳ ص ۵۱۲۔

کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے میری کمر ٹوٹ گئی۔

اموی معاشرہ کی ایک خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے بزیر عنوان "خلافت کے لیے عبادت و ریاضت" ارقام فرماتے ہیں: جو لوگ خلافت و امارت کے امیدوار ہوتے وہ عبادت و ریاضت اور سادہ پابندِ مذہب زندگی کا مظاہرہ کر کے عوام کا تعاون حاصل کیا کرتے تھے۔ اموی دور میں بہت سے لوگوں نے خلافت، امارت اور سیاسی و اقتصادی سربلندی کے لیے مہمیں چلائیں اور سب نے عبادت و ریاضت نیز روکھی پھیکی زندگی کا مظاہرہ کر کے عوام کی اخلاقی و عملی مدد حاصل کر کے مسلح بغاوتیں کیں۔ اُن میں ایک امیدوارِ خلافت عبداللہ بن زبیرؓ تھے۔ وہ مسجدِ حرم میں پہروں لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے تھے، مہینے میں اکثر دن روزے رکھتے تھے چاہے موسم سردی کا ہوتا چاہے گرمی کا......... دوسرے آرزو مندِ خلافت عبداللہ بن عباسؓ کے لڑکے علی (م ۱۱۸ھ) تھے، وہ اپنی مسجد میں چوبیس گھنٹے کے دوران ہزار سجدے کرتے تھے اور بقول بعض ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے........ اموی حکومت کی بساط الٹ کر عباسی حکومت قائم کرنا ان کا نصب العین تھا..... تیسرے امیدوارِ خلافت امام حسینؓ کے پوتے اور علی زین العابدین کے لڑکے زید (م ۱۲۲ھ) تھے انھوں نے عبادت و ریاضت اور روکھی پھیکی زندگی کا مظاہرہ کر کے مدینے کے باشندوں کو اپنی خلافت کی مہم بازی کے لیے تیار کر لیا تھا...... زید کو مدینے میں مسلح بغاوت کا موقع نہیں ملا تو وہ کوفے چلے گئے، اور وہاں بہت سے لوگوں کو اپنی عبادت و ریاضت اور سادہ زندگی سے متاثر کر کے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور ۱۲۲ھ میں بعمر بیالیس ۴۲ سال اموی فوجوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔" (ص ۶۰۰-۵۹۹)

اقتباس بالا میں عبادت و ریاضت کی تعبیر و تشریح خالص مادی تناظر میں پیش کی گئی ہے جس سے بالصراحت یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں استحقاقِ خلافت کے لیے

ظاہری پارسائی اور خشک زندگی کا مظاہرہ کرنا ضروری تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جن حضرات نے نمائشی زہد و تقدس کا سہارا لیا ان میں اول الذکر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (شہادت ۷۳ھ) نبیرۂ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حواری رسولؐ حضرت زبیرؓ بن العوام کے صاحب زادے اور حضرت عائشہؓ کے حقیقی بھانجے تھے، آپ ہجرت کے بعد مدینۃ الرسول میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے پیدا ہونے والے (۲ھ) شخص تھے جن کی ولادت سے مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی تھی آپؓ اکثر مورخین کے نزدیک خلیفۂ پنجم (۶۴ تا ۷۳ھ) کہلاتے ہیں[۵۱]۔ دوسرے تابعی اور تیسرے تبع تابعی تھے۔ جنھوں نے سیاست کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے طرز پر از سرِ نو ڈھالنے کی عملی جد و جہد اور سرفروشانہ خدمات انجام دیں اور جن کی طرزِ ماند و بود اسلام کے صحیح علم و عمل کا نمونہ تھی اور جو دنیوی اشیاء سے استلذاذ کو بہ نظرِ استحقار و استخفاف دیکھتے تھے۔ بالفرضِ محال اِن حضرات نے "خلافت، امارت اور سیاسی و اقتصادی سربلندی" حاصل کرنے کے لیے ہی "عبادت و ریاضت نیز روکھی پھیکی زندگی کا مظاہرہ" کیا تو حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ کو امارت تو ورثہ میں حاصل تھی ہی جیسا کہ خود موصوف نے اپنی تصنیف کے ص ۱۹۶ پر حضرت زبیر بن العوام کی غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ منقولہ جائداد کے جو تین اعداد و شمار دیئے ہیں انھیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور صرف اُن کے اوسط کو قابلِ قبول سمجھا جائے تو وہ بھی تین کروڑ بائیس لاکھ ہوتا ہے۔ اس میں سے گیارہ لاکھ قرض منہا

---

[۵۱] آپؓ کی خلافت و شہادت کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ابن خلدون جلد دوم قسط ۳ ص ۱۳۷ تا ۱۸۴، تاریخ الخلفاء ص ۸۴ تا ۸۸ جلد دوم، تاریخ اسلام ۲: ۵۰۸ تا ۹۴۹۔ مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ نیز مقالات شبلی ۵: ۳ مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔

کر دیا جائے تب بھی تین کروڑ گیارہ لاکھ میں سے جو کچھ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو ورثہ میں ملا ہوگا وہ آسودگی و فراغ الحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے انھیں کافی تھا۔ باوجودیکہ انھوں نے روکھی پھیکی زندگی بسر کی تو اس کا مقصد سوا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ افسوس کہ ان پاک نفوس کو بھی ہم نے اپنے ہی معیار سے جانچا اور پرکھا ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر   گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

محولہ فوق اقتباس میں حضرت زید بن علی زین العابدین رضی اللہ عنہ کا سنہ شہادت (۱۲۰ھ) بھی شاید سہواً غلط درج ہو گیا ہے۔ کیونکہ آپ کی شہادت کا واقعہ ۱۲۲ھ میں رونما ہوا۔ آپ کی نعش کو چار سال تک دروازۂ دمشق پر مصلوب رکھا گیا اور جب ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک خلیفہ (۱۲۵ تا ۱۲۶ھ) ہوا تو اُس نے حضرت زید کی لاش کو جلا دینے کا حکم دیا[19] دوسری طرف عوام الناس کا عالم بھی کچھ بہتر نہ تھا جیسا کہ عنوان "پابندئ صوم و صلوٰۃ" ص ۵۵۹ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ بہرحال فاضل مصنف نے اُس دور کے اکابر و اصاغر کے زہد و تقشف اور عبادت و ریاضت کو جس تناظر میں پیش کیا ہے اُس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

جبکہ یہ حضرات دنیوی اشیاء سے استلذاذ حاصل کرنے کو بہ نظر استحقار و استخفاف دیکھتے تھے۔

دیگر متنازعہ فیہ اور محل نظر اقتباسات سے اندیشۂ تطویل کے سبب صرف نظر کرتے

---

[19] دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں از حضرت علی میاں ص ۸۴ نیز تاریخ اسلام ۲: ۲۱۶ - مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

ہوئے عرضِ خدمت ہے کہ موصوف نے اپنی تصنیف میں اس نقطۂ نگاہ کو ملحوظ خاطر
رکھا ہے کہ تاریخ صرف بڑے لوگوں کے سوانحی حالات بیان کرنے کا نام نہیں ہے
بلکہ اس میں معاشرتی زندگی کے تمام پہلو محتوی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ موصوف نے
معاشرہ کے کسی پہلو کو روشن کرنے میں پہلوتہی سے کام نہیں لیا جس کے لیے وہ مبارکباد
کے مستحق ہیں تصنیف میں "عنوان" عثمان غنیؓ پر اعتراضات اور اُن کا جائزہ"
خاصہ کی چیز ہے۔ اندازِ بیان اور ایجازِ بیان کے اعتبار سے بھی پوری تصنیف
نہایت شستہ و شگفتہ ہے۔ شروع میں اصلاحِ سہو و خطا (Errata) دینے
کے باوجود تقریباً سنو دیگر مطبعی اغلاط ہنوز محتاج اصلاح ہیں جنھیں آئندہ ایڈیشن میں
درست کرنے کا پروفیسر صاحب نے وعدہ فرمایا ہے۔ ص ۱۸ پر "پانی سر سے اونچا ہونا"
محاورہ تعقید لفظی کے ساتھ اس طرح مستعمل ہوا ہے، "لیکن جب سر سے اونچا پانی ہو گیا
تو انھوں (حضرت عثمانؓ) نے ابوذرؓ کو شام جلاوطن کر دیا۔" اس محاورہ کو مفکر اسلام
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے جو اردو اور عربی زبان و
ادب کے شہرۂ آفاق ادیب و فاضل بھی ہیں، اس طرح استعمال فرمایا ہے: "قریش جب
حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اور آپؐ کے
اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی[1]"۔ بہرکیف اردو ادب میں ہمارے
لیے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانِ خیال قابلِ تقلید و سند ہیں ص ۱۲-۱۱ پر اصطلاح
"نسل کشی" کا استعمال بھی ندرت لیے ہوئے ہے فرماتے ہیں (حضرت عمرؓ) نے
گھوڑے پالنے اور اُن کی نسل کشی کے لیے ایک دوسری چراگاہ ریزرو کرالی جس کا نام
شرف تھا"، اس معنی میں اب تک افزائشِ نسل تو دیکھنے سننے میں آیا تھا مگر "نسل
کشی" کا استعمال پہلی دفعہ باصرہ نواز ہوا ہے جو غالباً فارسی مصدر "کشتن" بمعنی

---

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۱۱

"بونا" سے مشتق معلوم پڑتا ہے۔ فارسی سے نابلد قاری کے لیے یہ اصطلاح خوبصورت ہوتے ہوئے بھی سریع الفہم نہیں۔ ممکن ہے وہ اسے خودکشی، ضمیرکشی، دخترکشی اور نفس کشی وغیرہ پر قیاس کر ڈالے۔ بہر حال یہ سبقت قلمی ہے۔ ص ۵۵ پر یہ فقرہ بھی قدرے گنجلک ہے، "ام فردہ کے چار لڑکے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑے محمد بن اشعث کا فرزند نصف صدی بعد ہمعصر مذہبی اکابر کے تعاون سے عبدالملک بن مروان اور حجاج کے خلاف ہولناک بغاوت کرکے مشہور رہوا۔" اس فقرہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ محمد بن اشعث کا سب سے بڑا فرزند کون تھا لہذا "فرزند" کے بعد عبدالرحمٰن ثبت ہونا چاہیے تھا جو کہ ابنِ اشعث کا سب سے بڑا فرزند تھا۔ ص ۱۹۴ پر یہ فقرہ بھی مبہم ہے، "خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سلیمان نے اپنے بھائی ولید کے اکثر گورنروں اور سالاری کے عہدوں پر فائز کیا۔" ص ۱۹۷ پر بیرونی بستیوں قبا پہنچیں"، کی بجائے "بیرونی بستی قبا پہنچیں"، ہونا چاہیے۔ ص ۳۵۶ پر لفظ "صلح" بجائے اسم مؤنث اسم مذکر استعمال ہوا ہے۔ یعنی "عبدالملک کے صلح سے منحرف تین بڑے حریف تھے"۔ حکیم مومن خاں مومنؔ نے اسے صیغہ مؤنث میں استعمال کیا ہے۔

پھر کوئی ملنے کی طرح نہ ہوئی　　　صلح اب کے کسی طرح نہ ہوئی

ص ۵۵۹ پر گاؤں (دیہہ، موضع) کا املا گانو، اور ص ۶۰۵ پر گاؤں تحریر کیا ہے گو دونوں املا درست ہیں تاہم کوئی ایک املا اختیار کرنا بہتر تھا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں جبکہ ص ۱۱۹ و ۱۳۲ پر علی الترتیب گاؤن (GOWN) یعنی لمبا چغہ یا جبہ اور بیل (OXEN) یا گائے (Kine) کا جمع بھی گاؤں ہی ثبت فرمایا ہے۔ ص ۶۱۴ پر "ہالے" کا املا خائے حطی سے اختیار کیا ہے جبکہ اُردو فارسی شعراء نے ہائے ہوز سے تحریر فرمایا ہے۔ مثلاً ع قمر سے دور نہ رہتا جو ہالہ کیا کرتا مصحفی
نیز ۔ ے

مگر زروئے صفحۂ حسنِ تو بر دارد کہ امشب کشیدا زہالہ جدول صفحہ رورا (غنی)

الحاصل "تاریخ اسلام - خلافتِ راشدہ و بنی امیہ" کی بعض تصریحات پر احقر نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض ایک طالب علمانہ کاوش ہے نقد و تبصرہ جو ایک بلند پایہ علمی معیار کی چیز ہوتی، اہلِ نظر علماء و فضلاء کا کام ہے خاکسار کے پاس نہ تو اس قسم کی علمی استعداد و صلاحیت ہی ہے اور نہ مطلوبہ کتب کا ذخیرہ ہی چنانچہ جیسی اور جتنی معاون کتب و رسائل و جرائد تک رسائی حاصل ہو سکی اُن سے زلہ ربائی کر کے اس خردہ گیری کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جس میں امکانی حد تک اپنی ضعیف و ناقص رائے زنی سے احتراز کیا ہے کیونکہ سطحی خواندگی کے بل پر جو رائے بھی دی جائے گی وہ یقیناً ناقص ہی ہوگی بقول سعدیؒ۔ ع دہم ضعیف رائے فضول چرا کند۔
چنانچہ مجھے صدق دل سے اس امر کا اعتراف ہے کہ خورشید کجا ذرۂ آوارہ کجا۔
امید کہ پروفیسر خورشید احمد صاحب فارق اس آہو گیری میں جو کچھ درست ہو اس کی پذیرائی کرتے ہوئے اِس فرو مایہ تہی علم کو اپنی آہِ سحر گاہی و دعائے نیم شبی میں گاہے ماہے یاد فرماتے رہیں گے۔ ع

وز زبانِ تو تمنائے دعائے دارد

(ختم شد)

لہ موصوف کے تبصرہ کے سلسلہ میں خاکسار کو دو تین الطاف نامے نظر نواز ہوئے تھے جن میں مطبعی اغلاط کی درستی کا وعدہ فرماتے ہوئے ازراہِ لطف و کرم یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ تبصرہ کرنے کی اب ضرورت نہیں مصنف کی نظر میں اغلاط آگئی ہیں۔ اے۔ رؤف۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم

۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء کو راقم الحروف شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ کے ساتھ مطالعاتی دورے پر بالاکوٹ پہنچا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید احمد بریلویؒ اور شاہ محمد اسمٰعیل دہلویؒ شیر سنگھ کی فوج کے مقابلے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ بھارت کے نامور عالمِ دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس موضوع پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔

دریائے کنہار کے کنارے جامع مسجد کے قریب ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں ہیں۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہاں سید احمد بریلوی کا دھڑ دفن ہے۔ ان کا سر دریائے کنہار میں بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا تھا۔ وہاں کسی شخص نے اُسے پہچان کر دریا کے کنارے دفن کر دیا۔ ان دونوں مقامات میں بارہ میل کا بُعد ہے۔

سید احمد بریلویؒ کے مزار کے سرہانے سنگِ مرمر کی لوح نصب ہے۔ اور اس پر عربی عبارت کے علاوہ اُردو زبان میں یہ الفاظ منقوش ہیں:

سیّد احمد شہید

نے ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعۃ المبارک گیارہ اور ۱۲ بجے کے درمیان سکھوں کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ میں

شہادت نوش فرمائی۔ سرزمین بالاکوٹ آپ کے خون کی امین ہے۔

سید صاحب کے مزار مبارک سے جانب قبلہ پانچ چھ میٹر کے فاصلے پر امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کا انتقال جہلم میں ہوا تھا لیکن ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت بالاکوٹ لے جائی گئی۔ راقم الحروف کی نگرانی میں ان کے بارے میں عرفان حفیظ بٹ نے ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا ہے اور راقم نے ان کا ایک اہم خط جو انھوں نے چمرکنڈ سے اقبال شیدائی کو پیرس بھیجا تھا، ماہنامہ المعارف لاہور میں شائع کرادیا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مدفن

حضرت مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی

امیر المجاہدین چمرقند (یاغستان)

بسلسلہ حضرت سید احمد بریلوی شہید و شاہ اسمٰعیل شہید

تاریخ وفات ۵ رمئی سنہ ۱۹۵۱ء

سید احمد بریلوی کے مزار مبارک سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے اوپر ایک چار دیواری کے اندر شاہ محمد اسمٰعیل شہید صاحب تقویۃ الایمان محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر کے سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدفن

حضرت مولوی شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی

بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی

رحمۃ اللہ علیہم

ولادت شنبہ ۲۸ ؍ شوال ۱۱۹۶ھ

شہادت جمعہ ۲۴ ؍ ذی قعد ۱۲۴۶ھ

اے ذبیح اللہ اسمٰعیل ما — شد ندایت صور اسرافیل ما
خون خود را در کہ و کہسار ریخت — لیک بیخ حریت در ہند بیخت

احقر العباد سید اسد علی انوری فرید آبادی

ایں کتبہ را در ماہ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ نصب کرد

بالاکوٹ سے ہمارا قافلہ مظفر آباد پہنچا۔ وہاں سپریم کورٹ آف آزاد جموں وکشمیر کے احاطے میں وادیٔ کشمیر کی معروف شخصیت اور آزاد کشمیر کے صدر میر واعظ محمد یوسف کا مقبرہ ہے۔ اس کے قریب ہی اب ایک اور سابق صدر خورشید حسن خورشید کو دفن کیا گیا ہے۔ میر واعظ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی دوست تھے۔ میر واعظ کے مزار پر ابھی باقاعدہ کتبہ تو نہیں لگا، البتہ ایک لوح پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد یوسف میر واعظ کشمیر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کا سنگِ بنیاد جناب بریگیڈیر محمد حیات خاں صاحب صدر آزاد جموں وکشمیر نے بتاریخ ۱۶ ؍ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ۸ ؍ جولائی ۱۹۸۲ء اپنے دست مبارک سے رکھا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور کو دار العلوم کورنگی (کراچی)

میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ؒ کے ذاتی احاطہ قبور میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ ان کے لوح مزار کی عبارت راقم الحروف نے لکھی تھی جسے ان کے فرزند جنید احمد نے سنگ مرمر کی ایک سِل پر کندہ کرا کے قبر کے سرہانے لگا دیا ہے۔ وہ عبارت یوں ہے:

هو الباقی

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی ؒ

مُدیر ماہنامہ برہان دہلی

پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ڈائریکٹر شیخ الہند ؒ اکیڈمی

رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

ولادت آگرہ — وفات کراچی

۱۹۰۸ء — ۳ رمضان ۱۴۰۵ھ/ ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء

علامہ سیماب اکبر آبادی کی قبر کا ذکر الواح الصنادید میں آچکا ہے، لیکن اس وقت وہاں کتبہ نصب نہیں تھا اور ایک قریبی مکان کی دیوار پر ان کی تاریخ وفات لکھی ہوئی تھی۔ اب ان کا عالیشان مقبرہ تیار ہو گیا ہے۔ ایک بلند چبوترے پر ان کا مزار سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے۔

یا غفور یا حمید

۱۳۷۰ھ

مرقد منور منزل راحت جاودانی علامہ سیماب اکبر آبادی

1951ء

قد رحمہ وذٰلکَ الفوز المبین

۱۳۷۰ھ

دے گیا داغ جدائی آخر — وہ معظم وہ مکرم سیماب
فخرِ علم و ادب استادِ زماں — فن کے اسرار کا محرم سیماب
قادری لکھ دو یہ تاریخ وفات — نہ رہا شاعرِ اعظم سیماب

۱۹۵۱ء

پروفیسر حامد حسن قادری

پیدائش ۱۸۸۰ء — وفات ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء

اکبر آباد (آگرہ) — کراچی (۱۱ بجے دن)

رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۸ء میں ملتان پر فوج کشی کی۔ حاکم ملتان مظفر خاں نے بڑی بے جگری کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن اُسے ہزیمت اٹھانا پڑی اور وہ دادِ شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ مظفر خاں کو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی درگاہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ اس کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

آخری آرامگاہ

رکن الدولہ صفدر جنگ حاجی نواب مظفر خاں سدوزئی شہید

شجاع ابن شجاع حاجی — امید ملتان زہے مظفر
بروز میدان بہ تیغ و بازو — چہ حملہ آورد چوں غضنفر
چوں سرخرو شد بسوئے جنت — بگفت رضوان بیا مظفر

تاریخ شہادت ۲۳ رجب ۱۲۳۳ھ

مطابق ۲ جون ۱۸۱۸ء

اسی درگاہ کے احاطے میں مسجد کے عقب میں رنگین ٹائلوں سے مزین ایک قبر ہے۔ صاحبِ قبر نواب شہنواز خاں، نواب زکریا خاں والئی لاہور کا فرزند ہے۔ یہ وہی ذات شریف ہے جس نے پہلی بار احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ شہنواز خاں، نواب معین الملک ناظم لاہور کے مقابلے میں مارا گیا تھا۔ اس کے مزار کے سرہانے ایک ٹائل پر یہ عبارت درج ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

چوں شہنواز خاں بملتان شہید شد

خمدار تیغ قتل برو ماہ عید شد

جستم چو سال مشہد آں غازی شہید

گفتا خرد کہ حاکم ملتان شہید شد

۱۱۳۳ھ

(باقی)

اعلان

۲۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو مفکر ملت کے تاریخی اور شاندار افتتاح کے دوران شرکاء نے اجتماعی طور پر یہ تجویز پاس کی تھی کہ آئندہ ہر سال اس موقع پر مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی رح کی یاد میں ایک روزہ علمی سمینار کا اہتمام کیا جائے۔

چنانچہ امسال حسب پروگرام سردیوں کے آغاز میں سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس مبارک اقدام اور نیک کام کی تکمیل کے لئے قارئین کرام دل سے دعا فرمائیں۔ سمینار میں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں اور حیات و خدمات پر مقالہ نگار حضرات روشنی ڈالیں گے۔ چونکہ وقت کم ہوگا اور مقالات زیادہ ہوں گے اس لئے کوشش اس بات کی کی جائے کہ مقالات زیادہ سے زیادہ جامع اور علمی سطح کے ہوں۔

اس سلسلے میں مختلف عنوانات اور دعوت نامہ عنقریب ارسال کیا جائے گا۔ مقالات قبل از وقت دفتر برہان میں پہونچنا ضروری ہیں تاکہ انھیں چیک کیا جاسکے۔

(منیجر)

ابوحیان توحیدی

حیات وخدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۵)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

مثالب الوزیرین: یہ رسالہ مختلف ناموں سے مشہور ہے۔ ابن خلکان نے "مثالب الوزیرین"[60] حاجی خلیفہ نے "قلب الوزیرین"[61] اور یاقوت نے "اخلاق الوزیرین" کے نام سے یاد کیا ہے[62]

اس کا مخطوطہ قسطنطنیہ کے کتب خانے میں پایا گیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں محمد بن تاویت الطنجی نے ایڈیٹ کر کے مجمع العرمی دمشق سے شائع کیا۔ اس کتاب کی وجہ تالیف ان تین وزراء (ابوالفضل ابن العمید، ابوالفتح ابن العمید، صاحب بن عباد) کی بدسلوکی اور توحیدی کی ذات کے سلسلے میں ان کی ناقدرشناسی ہے۔ اس تصنیف میں ابوحیان توحیدی نے ان وزراء کی زندگیوں کے تاریک گوشوں کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان وزراء کے خلاف ابوحیان توحیدی نے نہ صرف یہ کہ اپنے خیالات کے اظہار پر اکتفا کیا ہے بلکہ ان کے بارے میں حق پسند جلیل القدر معاصر علماء کی رائے بھی نقل کی ہے۔ ابوحیان توحیدی نے صرف ان کی خامیوں ہی کو نہیں گنایا ہے بلکہ اگر ان میں کوئی اچھائی یا خوبی دیکھی تو اس کی بھی تعریف کی ہے۔ ابوحیان نے کتاب کے آغاز ہی میں غیبت کے موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور کسی ظالم کے ظلم کا پردہ چاک کرنے یا کسی منافق کے نفاق کو واضح کرنے کو غیبت وچغل خوری کے دائرے سے الگ قرار دیا ہے۔ آخر میں قارئین سے اس کتاب کے مطالعہ کی اپیل کی ہے۔

رسالۃ الکتابۃ: اس رسالے میں توحیدی نے خوشخط لکھنے کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ ابوحیان توحیدی خود بھی اچھا خطاط تھا۔ اس لیے اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اس میں عربی خط اور اس کے اقسام پر بڑی محققانہ بحثیں ہیں۔

المقابسات: ڈاکٹر ذکی مبارک کہتے ہیں "المقابسات کا شمار دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے، پہلی بار ہندوستان میں شائع ہوئی۔ پھر مزید اصلاح و ترمیم کے بعد مصر سے شائع ہوئی۔ کتاب المقابسات عام فہم لوگوں کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد نہیں۔ بلکہ اس سے حقیقی معنوں میں پورا فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں جو اسلامی فلسفہ کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوں[۶۳]۔"

یہ ابوحیان توحیدی کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ پہلی بار ۱۳۰۵ھ میں مرزا محمد شیرازی کے اہتمام میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا ایک اور ایڈیشن حسن السندوبی نے ۱۹۲۹ء میں مصر سے شائع کیا[۶۴]۔ المقابسات کے بارے میں ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

"یہ کتاب چھوٹے بڑے ایک سو چھ مقابسات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ یہ چند فی البدیہہ لکچر ہیں جو مختلف موقعوں پر ان علمی مجلسوں میں دیے گئے تھے جو یحییٰ بن عدی نصرانی اور ابوسلیمان منطقی سجستانی کی صدارت میں منعقد ہوئے تھے۔ یہ علمی مجلسیں کبھی تو ابن عارض کے محل میں منعقد ہوتیں، کبھی وراقوں کے بازار میں یا پھر سجستانی کے کسی شاگرد کے یہاں۔

ان مجلسوں میں ہر طبقہ کے نمائندے اور ہر مذہب و ملت کے افراد (خواہ وہ کسی عقیدے کے ماننے والے ہوں) شریک ہوتے۔ شرکاء میں فلسفی، طبیب، ریاضی داں، ہیئت داں، مؤرخ، شاعر، ادیب اور متکلم غرضیکہ ہر صنف کے اصحاب کمال نظر آتے ہیں جو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے دنیا کے دور دراز کے علاقوں سے آتے تھے۔ عام طور پر ان مجلسوں میں فلسفہ و تصوف کی بحثیں زیادہ ہوتیں۔ طالبانِ علم اپنی بیاضیں کھول کر بیٹھتے اور صدرِ محفل جو جواب دیتا اسے نوٹ کر لیتے۔ جس مسئلے پر اتفاق نہ ہوتا تو صدر اپنی رائے دیتا جسے لوگ تسلیم کر لیتے ہے[۵]

فلسفہ و حکمت کے میدان میں یہ بہت ہی اہم کتاب ہے۔ بعد کے فلاسفہ نے مختلف فلسفیانہ بحثوں میں ابوحیان توحیدی کی ذات کی طرف رجوع کیا ہے اس کتاب کے ذریعہ اس دور میں فلسفہ کے میدان میں ہونے والی سرگرمیوں اور ترقیوں کا بہت حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسائل کیسے ابھرتے ہیں اور اختلافات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔

الاشارات الالٰہیہ: اس کتاب کا پورا نام "الاشارات الالٰھیۃ والانفاس الروحانیۃ" ہے۔ اس کتاب میں روحانیت کی جلا اور درجات کی بلندی کے لیے غذا فراہم کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نسخہ دمشق کے "مکتبہ ظاہریہ" میں تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند قدیم ترین باقی ماندہ نسخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔ جلد اول کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی نے دریافت کر کے ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے شائع کیا۔ الاشارات میں ۵۴ رسائل ہیں جو مختلف قسم کے اوراد و وظائف اور مواعظ و نصائح پر مشتمل ہیں۔

اس کتاب کا اسلوب اس کی دوسری کتابوں کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی تحریر کافی عمدہ اور بہتر ہے۔ اس کے اندر ابوحیان نے انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات اور روحانی تغیرات و تقلبات کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں ذاتی شخصیت سے متعلق احوال، زندگی کے تجربات، مختلف اوقات میں طاری ہونے والی الگ الگ کیفیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے اندر ابوحیان نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان جب دنیوی مشکلات و پریشانیوں سے گھبرا جاتا ہے تو از خود اپنے آپ کو ایمان و یقین کے دامن میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں ایسے شخص کی مایوسی و ناامیدی کا بھی تذکرہ ہے جسے دنیا و اہل دنیا کی تلخیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اس شخص کی حالت زار کا تذکرہ ہے جو مسلسل ناکامیوں کی بدولت ٹوٹ چکا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کی صحیح عکاسی وہی کر سکتا ہے جو ان حالات سے گذرا ہو۔ یہ ابوحیان کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ جب کہ اس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی [۶۶] اسی لیے اس نے دنیوی معاملات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے روحانیت اور تصوف کی طرف رغبت دلائی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسان کو حقیقی عزت و کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دے۔ اس نے مناجات و سرگوشی کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ذکر و اذکار، اوراد و وظائف کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی تاکہ ان کی نیتیں حصولِ آخرت کے لیے خالص ہو سکیں۔

یہ کتاب چون [۵۴] رسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں سب سے بڑا رسالہ آٹھ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ ہر رسالہ دعائیہ کلام سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کے اندر وعظ و نصیحت اور علائق سے کنارہ کشی کی تعلیم ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ بعض دوسرے رسائل بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں:

رسالۃ فی علم الکتابۃ

رسالۃ الحیوان
رسالۃ العامہ المعروفۃ بروایۃ سقیفۃ
المناظرہ بین ابی سعید السیرافی ومتی بن یونس القنانی
کتاب النوادر
تقریظ الجاحظ

ان کے علاوہ ابوحیان توحیدی کی طرف منسوب کی جانے والی ایسی کتابوں کی فہرست بھی ہے جو غیر معروف ہیں اور جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہیں۔

رسالۃ الحنین الی الاوطان
رسالۃ فی ضلالات الفقہاء،
کتاب المحاضرات والمناظرات
الامتناع
التذکرۃ والتوحید
کتاب الحج العقلی اذا ضاق الفضاعن الحج الشرعی
ریاض العارفین
رسالۃ فی اخبار الصوفیۃ
الرسالۃ البغدادیۃ
رسالۃ الحیوٰۃ
رسالۃ فی بیان ثمرات العلوم
رسالۃ الی ابی الفضل ابی العمید
کتاب الرد علی ابن جنی فی شعر المتبنی
رسالۃ لابی بکر الطالقانی
الرسالۃ فی ضلالات الفقہاء فی المناظرۃ

حواشی و تعلیقات

۱ العصر العباسی — الدکتور شوقی ضیف۔ دارالمعارف بمصر چوتھا ایڈیشن۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۶

۲ امراء البیان۔ ڈاکٹر کرد علی۔ قاہرہ۔ ۱۹۳۷ء
ج۔ ۲۔ ص۔ ۴۹۰

۳ " " " ۴۹۱

۴ معجم الادباء — یاقوت الحموی۔ دارالمستشرق بیروت۔ لبنان ۱۹۲۲ء۔ ج۔ ۱۵۔ ص ۵

۵ ابوحیان توحیدی۔ سیرتہ و اثارہ — ناشر مکتبہ الخانجی۔ عبدالرزاق محی الدین۔ مطبعۃ السعادۃ۔ مصر ۱۹۶۹ء ص۔ ۷

۶ امراء البیان۔ کرد علی۔ ج ۲۔ ص۔ ۴۸۸

۷ لسان المیزان

۸ النثر الفنی (فی القرن الرابع) ڈاکٹر ذکی مبارک بیروت۔ دار الجیل ۱۹۷۵ء۔ ج۔ ۲۔ ص ۱۳۳

۹ امراء البیان — کرد علی۔ ج۔ ۲۔ ص

۱۰ النثر الفنی (فی القرن الرابع) ذکی مبارک۔ ج۔ ۲۔ ص۔ ۱۳۴

۱۱ معجم البلدان۔

۱۲ ابوحیان توحیدی — عبدالرزاق محی الدین — ص۔ ۱۱

۱۳ بغیۃ الوعاۃ — جلال الدین عبد الرحمٰن السیوطی مطبعۃ السعادۃ۔ مصر
۱۴ ۱۳۲۶ھ۔ ص ۱۲۶
۱۵ لسان المیزان۔ حافظ ابن حجر العسقلانی۔ حیدر آباد۔ ۱۳۳۱ھ
ج۔ ۶۔ ص۔ ۳۷۳
۱۶ طبقات الشافعیۃ۔ المطبعۃ الحسینیۃ — مصر
ج۔ ۴۔ ص۔ ۲۔ ۳
۱۷ " " " " ص۔ ۳۔
۱۸ " " " " ص ۴
۱۹ لسان المیزان۔ العسقلانی — ج۔ ۶۔ ص۔ ۳۶۱
۲۰ طبقات الشافعیۃ۔ للسبکی۔ ج ۶۔ ص۔ ۳۰
لسان المیزان۔ العسقلانی۔ ج۔ ۶۔ ص ۳۶۹
۲۱ معجم الادباء۔ ج ۱۵۔ ص۔
۲۲ التوحیدی۔ عبدالرزاق محی الدین — ص۔ ۶۹
۲۳ لسان المیزان۔ ج ۶۔ ص۔ ۳۶۱ — ۳۶۳
۲۴ التوحیدی۔ عبدالرزاق محی الدین۔ ص۔
معجم الادباء۔ ج۔ ۸۔ ص۔ ۱۴۲
۲۵ " " " ص۔ ۱۴۳
۲۶ بغیۃ الوعاۃ۔ السیوطی۔ مصر۔ ص۔ ۱۲۲
۲۷ وفیات الاعیان — ابن خلکان۔ ج۔ ۱۔ ص۔ ۱۳۰
مکتبۃ المیمنۃ۔ مصر ۱۳۱۰ھ
۲۸ " " ابن خلکان۔

۲۹ امراء البیان۔ ج۔ ۲۔ ص ۴۹۲
۳۰ معجم الادباء۔ ج۔ ۹۔ ص ۱۳۳
۳۱ میزان الاعتدال۔ ج ۳۔ ص۔ ۳۰۵
۳۲ معجم الادباء۔ ج۔ ۱۵۔ ص۔ ۵
۳۳ وفیات الاعیان۔ ج ۱۔ ص۔ ۷۵
۳۴ الصداقۃ والصدایق۔ ص۔ ۳۰۔ بحوالہ مطالعات
۳۵ الامتاع والموانسۃ۔ ابوحیان توحیدی۔ ایڈیٹ ڈاکٹر احمد امین احمد الزیف، لجنتہ التالیف والترجمہ۔ مصر ۱۹۴۴ء۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳
۳۶ " " ج ۱۔ ص۔ ۲۹۶
۳۷ " " ج ۱۔ ص۔ ۱۲
۳۸ " " ج ۱۔ ص۔ ۱۲
۳۹ معجم الادباء یاقوت الحمدی۔ ج۔ ۱۵۔ ص۔ ۱۰
۴۰ طبقات الشافعیہ۔ تاج الدین ابونصر عبدالوہاب بن عامر بن عبدالکافی السبکی۔ ج۔ ۴۔ ۱۹۶۴ء
۴۱ التوحیدی۔ عبدالرزاق۔ ص۔ ۱۲۸
۴۲ البصائر والذخائر۔ ابوحیان توحیدی۔ تعلیق۔ ڈاکٹر ابراہیم کیلانی مطبعۃ الانشاء۔ دمشق۔ ج ۱۔ ص۔ ۱۴۹
۴۳ المقابسات
۴۴ التوحیدی۔ عبدالرزاق۔ ص۔ ۱۵۶
۴۵ " " ص ۱۶۰
۴۶ النثر الفنی۔ ڈاکٹر ذکی مبارک۔ ج۔ ۲۔ ص۔ ۱۶۳

۴۷ الصداقة والصديق مطبعة الشرقية ۱۳۲۳ھ قاہرہ۔
ص۔۷۳۔ النثر الفن۔ ج۔۲۔ ص۔۱۶۷
۴۸ النثر الفن۔ ذکی مبارک۔ دار الجیل۔ بیروت ۱۹۷۵ء ج ۲۔ ص ۱۷۰
۴۹ " ج ۲ ص۔ ۱۷۱ (۵۰) النثر الفن۔ ج ۱۔ ص۔ ۲۹
۵۱ التوحیدی۔ عبدالرزاق۔ ص ۱۳۹ (۵۲) التوحیدی۔ عبدالرزاق ص ۱۴۲
۵۳ ایضاً " ص ۱۴۳
۵۴ امراء البیان۔ کرد علی۔ ج۔۲۔ ص ـــ
۵۵ مقدمہ۔ الامتاع والموانسہ۔ التوحیدی۔ قاہرہ ۱۹۴۴ء
۵۶ امراء البیان۔ کرد علی۔ ج۔۲۔ ص ـــ
۵۷ مقدمہ۔ الصداقة والصدیق۔ ابوحیان توحیدی
بحوالہ۔ التوحیدی۔ ص ـــ ۳۷۱
۵۸ التوحیدی ـــ عبدالرزاق ـــ ص ۱۸۴
معجم الادباء۔ ج۔ ۱۵۔ ص۔ ۵
۵۹ التوحیدی۔ عبدالرزاق۔ ص ۱۸۴
۶۰ وفیات الاعیان۔ ابن خلکان۔ ج ۲ ص ۶۰
۶۱ معجم الادباء۔ ج ۶۔ ص ۱۸۶ (۶۲) التوحیدی۔ عبدالرزاق ـــ
۶۳ النثر الفن۔ ذکی مبارک۔ ج ۲۔ ص ۱۶۷
۶۴ مطالعات۔ ڈاکٹر بدرالدین بٹ کشمیر ۱۹۸۵ء ص ۶۸
۶۵ " " " ص ۶۸
۶۶ مقدمہ۔ الاشارات الالہیۃ۔ التوحیدی۔ ایڈیٹ عبدالرحمٰن
جامعۃ الفواد الاول۔ قاہرہ ۱۹۵۰ء

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمن عثمانی

برہان

جلد ۱۰۲ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ مطابق اگست ۱۹۸۸ء شمارہ ۲

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر
دفتر برہان ۴۱۴۸ اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ خبر دنیا بھر کے تمام امن پسند ممالک اور انسان دوست افراد جماعت کے لئے انتہائی خوش آئند اور باعث اطمینان ہے کہ آٹھ سالہ طویل ترین اور بے معنی خلیجی جنگ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کے پیش نظر جو ۲۰ جولائی ۱۹۸۷ء کو پاس کی گئی تھی اب ایک سال کی مدت پوری ہونے کے بعد ایران نے اس قرارداد کو بلا شرط تسلیم کر لیا ہے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مذکورہ قرارداد میں سب سے پہلے ایران و عراق کو فوری جنگ بندی کرنے، بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں تک دونوں ممالک کی فوجوں کی واپسی اور جنگ کے دوران قیدی بنائے گئے سپاہیوں کے تبادلے کی بات کہی گئی ہے۔ جنگ بندی کے نفاذ اور مقبوضہ علاقوں سے دونوں ممالک کی فوجوں کے انخلاء کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل جناب کویار ایک نگراں ٹیم مقرر کریں گے۔ اور دونوں ملکوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ تمام متنازعہ امور و معاملات کا تصفیہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی مدد سے کریں۔

آٹھ سال تک مسلسل جنگ کے باوجود ایران و عراق دونوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس جنگ میں قطعی فتح یا شکست کسی بھی فریق کو حاصل

نہیں ہوسکتی۔ یہ بات دونوں کے مفاد میں ہے کہ "جنگ بندی" سے اتفاق کر لیا جائے اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں "جنگ بندی" کی قرار داد کو قبول کر لیا جائے۔

اس جنگ کے آغاز سے اب تک اقوام متحدہ، ناوابستہ تحریک، اسلامی کانفرنس اور عرب لیگ کی جانب سے بھی اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بھی ان دونوں ملکوں سے بارہا اپیل کی گئی تھی کہ وہ فوری "جنگ بندی" کو قبول کر لیں اور اس وسیع پیمانہ پر جو جانی و مالی نقصانات ہو رہے ہیں اسے روک دیں جس سے مجموعی طور پر کسی بھی ملک کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہمیں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا ہے کہ اس خونیں جنگ کا پس منظر کیا تھا، اسباب و عوامل کیا تھے اور کن حالات اور مجبوریوں کے پیش نظر دونوں اسلامی اور پڑوسی ممالک جارحیت پر اتر کر اپنے اپنوں ہی کے گلے کاٹ رہے تھے؟ اور دنیا بھر کے ممالک، ملکی، عالمی اور بین الاقوامی تنظیمات کی "جنگ بندی" کی مسلسل کوششوں کے باوجود کس طرح دونوں ملک باہم دست و گریباں، سامراجی قوتوں کے آلۂ کار اور اسرائیل کے ناپاک مقاصد اور مکروہ عزائم کی تکمیل کرتے رہے۔ ایران، عراق جنگ کی وجہ سے سامراجی اور صیہونی قوتوں اور انسان دشمن عناصر کو یہ موقع ملا کہ وہ اس پورے خطہ میں اپنی عسکری قوت اور اسلحہ سازی میں اضافہ کرے۔ چنانچہ اس سے نہ صرف خلیجی ملکوں بلکہ برصغیر کے اس پورے علاقے کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حال ہی میں بلا جواز ایران کے مسافر بردار جہاز پر امریکہ کا قاتلانہ اور سفاکانہ حملہ جس میں جہاز کے عملہ سمیت دو سو نوے مسافر ہلاک ہوئے سامراجی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس خطہ میں امریکہ کی موجودگی کس قدر نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

غالباً اس دردناک انسانی المیہ سے متاثر ہو کر ہی ایران نے اب بلاشرط عراق سے جنگ بندی کے لئے اقوام متحدہ کی قرارداد پر از سر نو غور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بلاشبہ یہ جنگ دورِ حاضر کی تاریخ میں سب سے زیادہ بھیانک، تباہ کُن اور طویل ترین جنگ تھی جس میں ایک محتاط اندازہ کے مطابق دس لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی اور مجروح ہو کر زندگی بھر کے لئے بیکار اور معذور ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی معیشت اور اقتصادیات پوری طرح تباہ ہو کر رہ گئیں۔ شہر کے شہر ویران اور کارخانے تباہ ہو گئے۔ آٹھ سال کی اس بے معنیٰ جنگ میں جو تباہی اور نقصانات ہوئے اس کی پھر سے بحالی اور تعمیر کے لئے کئی دہائیاں درکار ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد میں "مناسب بین الاقوامی امداد" سے دونوں ملکوں کی معیشت کی بحالی اور تعمیر و ترقی کی بات بھی کہی گئی ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بین الاقوامی امداد اور تعاون کے بغیر دونوں ملکوں کی تباہ شدہ معیشت کی بحالی کا تصور ممکن نہیں ہے۔

یو۔ این۔ آئی کی رپورٹ اور اخباری اطلاعات کے مطابق ایران و عراق کی معیشت کی بحالی پر کم از کم چار سو ارب ڈالر خرچ ہوں گے۔ اس لئے کہ جنگ کے دوران دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی اقتصادی تنصیبات کو تباہ کیا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کے پیداواری مرکزوں پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ تاکہ ایک دوسرے کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کر سکیں۔ ماہرین کا کہنا ہے

کہ یہ جنگ کا منصوبہ بنانے والوں کی ایسی حکمت عملی ہے جس کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے ۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ فوجی ساز و سامان کی مرمت بہت تیزی کے ساتھ ہو جاتی ہے مگر اقتصادی تنصیبات کی تباہی کا جنگ کی پوری کارروائی پر اثر پڑتا ہے کیونکہ ان تنصیبات کو دوبارہ کارآمد بنانے میں کافی وقت لگ جاتا ہے ۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جو ایک سو تہتر بین ملکی جنگیں ہوئی ہیں ان میں یہ حکمت عملی کامیاب رہی ہے ۔

ایک اندازہ کے مطابق دونوں ملکوں کی جنگ سے برباد معیشت کی بحالی میں کم از کم بیس سال لگ جائیں گے ۔ جنگ سے قبل ایران روزانہ تقریباً تیس لاکھ بیرل تیل پیدا کرتا تھا، جزیرۂ خرگ میں اور اس کے ارد گرد عراق کی پیداوار پچاس فیصد سے بھی کم ہو گئی ۔ اسی طرح جنگ سے پہلے عراق دس لاکھ ستّر ہزار سے بیس لاکھ بیرل تک روزانہ تیل پیدا کرتا تھا ۔ مگر شام سے گذرنے والی پائپ لائن کے بند ہونے اور ترکی سے گذرنے والی پائپ لائن کو شدید نقصان پہونچنے پر عراق کے تیل کی پیداوار تقریباً صفر ہو گئی ۔ عراق نے ترکی سے گذرنے والی پائپ کی جلد مرمّت کر کے پانچ سو سے سات سو بیرل روزانہ تیل کی پیداوار شروع کر دی اور پیداوار مستقل طور پر اب بحال ہونے کے امکانات ہیں ۔

بہر حال اب جبکہ ایران نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا ہے تو امید کی جانی چاہیئے کہ فریقین اس بے فیض جنگ کے بھیانک نتائج کا بھرپور احساس کریں گے اور اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ کسی بھی طرف سے

مستقبل میں کوئی ایسا قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے جس سے نہ صرف خلیجی ممالک اس سے متاثر ہوں بلکہ امن عالم اور سلامتی کو خطرات لاحق ہوں۔

خدا کرے دونوں ملکوں کے سربراہ پوری تندہی اور سنجیدگی سے اپنے ملک کے اندرونی مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور متاثرین کو بحال کرنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کریں اور امن عالم کے کاز کو آگے بڑھانے میں اپنا تعاون دیں۔ ع

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

مکتوباتِ عثمانیؒ

مفتیؒ بنام قاضی

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، بمبئی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (متوفی شنبہ ۱۰ر شعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ر مئی ۱۹۸۴ء) رحمۃ اللہ علیہ میرے خاص علمی محسن ہیں، درحقیقت انھوں نے مجھے ملک کے مستند و معتبر محققین و مصنفین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، اگر ندوۃ المصنفین سے وہ میری کتابیں شائع نہ کرتے تو شاید میری کتابوں کی اشاعت اتنے باوقار اور معیاری انداز پر نہ ہوتی، مفتی صاحب مرحوم سے میرا تعلق و تعارف زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، جب کہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں آئے دن علماء کی آمد و رفت مختلف تقریبات میں رہا کرتی تھی، جہاں تک یاد پڑتا ہے مفتی صاحبؒ سے سب سے پہلی خط و کتابت تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، لاہور چھوٹ گیا تھا۔ کسی علمی جگہ کی تلاش تھی میں نے مفتی صاحب کو لکھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جگہ ہو تو مجھے رکھوا دیں، اس کے جواب میں مفتی صاحب نے لکھا کہ وہاں جگہیں پُر ہو چکی ہیں، پھر بھی آپ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کو لکھیں اور میرا حوالہ دیں، اس کے بعد خط و کتابت کی باری نہیں آئی۔ میں ۱۹۵۰ء میں بمبئی گیا۔ اس میں مفتی صاحب کی

شفقت اور خوردہ نوازی کو بڑا دخل ہے۔ اس زمانہ میں مجاہد ملت حضرت مولینا حفظ الرحمن صاحب اور حضرت مفتی صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے اور خان منزل کھانڈیا اسٹریٹ میں مرحوم عبداللہ احمد عرب سمکری صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے، ہم لوگ صبح وشام ان حضرات کی خدمت میں حاضری دیتے اور مختلف موضوعات پر کھل کر تبادلۂ خیال کرتے تھے، ۱۹۶۵ء میں مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین سے میری کتاب "عرب و ہند رسالت میں" میں شائع کی، اسی زمانہ سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ویسے مفتی صاحب زیادہ خط وکتابت کے عادی نہیں تھے اور نہ ہی ان کو اس کے لیے وقت ملتا تھا، ایک مرتبہ معذرت کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ خط وکتابت کے بارے میں میرا مزاج حضرت الاستاذ مولانا شاہ انور صاحبؒ کی طرح ہے۔ اس کے باوجود میرے ہر خط کا جواب دیر سویر دیا کرتے تھے۔ جس میں شفقت، محبت، خلوص، خوردہ نوازی اور تشجیع ہمت افزائی ہوا کرتی تھی، اپنی کتابوں کے لیے دوسروں سے مقدمہ لکھوانے کا میرا ذوق نہیں ہے، ندوۃ المصنفین سے مفتی صاحبؒ نے میری آٹھ کتابیں شائع کیں اور کسی کتاب پر دوسرے کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ ہر کتاب کی ابتداء میں مفتی صاحب کی چند سطریں ہیں جو بہتر سے بہتر مقدمہ سے بڑھ کر ہیں، یقین ہے کہ اگر میں کسی دوسرے بزرگ سے مقدمہ لکھواتا تو اس میں وہ خلوص، خوردہ نوازی، اعتراف اور تشجیع کی وہ فراوانی نہ ہوتی جو مفتی صاحب کی چند سطروں میں موجود ہے۔ یہی حال ان کے خطوط کا ہے۔

حق تصنیف کے نام پر رائلٹی یا کتاب کی فروختگی میرے ذوق ومزاج کے خلاف ہے، میں نے کبھی کسی کتاب پر کوئی رقم نہیں لی ہے بلکہ خود میں نے رقم خرچ کی ہے حتی کہ قاہرہ میں جب میری کتابوں کے شائع ہونے کی باری آئی تو دار الانصار کے مالک مرحوم سید اسعد سید احمد نے رائلٹی کی بات کی تو میں نے اُن سے کہدیا کہ

آج تک میں نے اپنے ملک میں کسی سے حق تصنیف کے نام پر کوئی رقم نہیں لی ہے قاہرہ میں کیا لوں گا، آپ شائع کر کے فروخت کریں البتہ مجھے اتنے نسخے دے دیں. یہی صورت میں نے ندوۃ المصنفین سے کتابیں شائع ہونے کے وقت اختیار کی، اور جب پہلی کتاب "عرب و ہند عہد رسالت میں" شائع ہوئی اور مفتی صاحب نے ۲۵۰ روپیۓ عنایت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس کے عوض تاجرانہ نرخ پر اس کے نسخے لے لیے، اس کے بعد ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لیتا رہا، یہ صورت میں نے اپنے مزاج کے تقاضے پر اختیار کی اور اپنا علم فروخت کرنے کے بجائے اس کو فروغ دینے کی راہ نکالی۔ درمیان میں بعض اہم اور مشہور اداروں کے ذمّہ داروں نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی کتابیں ہم کو دیں، اس میں آپ کا فائدہ ہوگا مگر میں نے کہا کہ یہ بات وضعداری اور مروّت و فتوّت کے خلاف ہے کہ مفتی صاحب نے میری کتابیں شائع کر کے اوساطِ علمیہ میں میرا تعارف کرایا ہے اس کے بعد میں دوسرے ادارے سے بات چیت کروں، پھر میں اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کی قیمت چند روپیۓ کی صورت میں وصول کرنا نہیں چاہتا۔

خوش قسمتی سے مفتی صاحب کے جو خطوط میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ان میں پہلا خط ۴ر فروری ۱۹۵۹ء کا اور آخری خط ۱۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کا ہے لیکن اکیس بائیس سال میں یہ خطوط آئے اور تقریباً ایک سال میں ایک خط کا اوسط پڑتا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ خطوط آئے مگر افسوس کہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے، جو رہ گئے ہیں ان میں علم دوستی، فراخ دلی، خوردہ نوازی، شفقت، خلوص اور تعلق کی وہ قدریں ہیں جو ہمارے بزرگوں میں عام طور سے مفقود ہیں، مفتی صاحب کے غیر محفوظ خطوط میں وہ تعزیتی خط بہت ہی اہم تھا جسے آپ نے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ کے وصال پر مجھے لکھا تھا، افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔

(۱) مورخہ ۳ر فروری ۱۹۵۹ء محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، "رجال السند والہند" مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے، ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہو جاتی ہے، مولانا سعید کو مزید تاکید لکھ دوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلاء کو پُر کر دیا ہے، بکھرے ہوئے موتی یکجا ہو گئے ہیں، اور سند و ہند کے ارباب علم و حکمت کا ایک خوب صورت ہار تیار ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

(۲) مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہونچ گیا تھا۔ "برہان" میں جلد شائع ہو گا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمایا کریں۔ کتاب "ندوۃ المصنفین" سے ضرور شائع ہوگی، اس کو مکمل کر لیں[۱] ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہوگی؟ اس کو صاف کر لیں، رائلٹی کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھئے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں۔ پھر بھی خدمت کی جائے گی میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورتِ حال ہے۔ غالباً ۱۸ر کو بمبئی آنا ہو گا، حج کمیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت

---

[۱] "عرب و ہند عہدِ رسالت میں"، میری پہلی کتاب جو ندوۃ المصنفین سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۳۳) مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ء، مخلصم ومحترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمت نامہ ملا، مجھے خود خیال تھا کہ اس دفعہ آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہوسکے گی۔ سچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہوسکا، کاموں کا ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بمبئی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں آنا جانا مشکل ہوگیا تھا، افسوس آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کرلیتا، کتاب کا آخری باب فوراً ارسال فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہوجائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کاتب کو دے دیا گیا ہے، دونوں مضمون محفوظ ہیں، ان شاء اللہ "برہان" ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آرہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں، آپ کے مضمون گرانقدر ہوتے ہیں، واپس کیسے ہوسکتے ہیں، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر وعافیت ہوں گے، والسلام

خانصاحب[1] گاڑی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا کیوں کہ چھوٹا لڑکا ساتھ تھا۔ عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

(۳۴) مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۴ء برادرم ومخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا گرامی نامہ ملا تھا، لفافہ بھی پہونچ

---

[1] جناب اے، اے خان صاحب بمبئی سکریٹری جمعیۃ علماء مہاراشٹر۔

گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے انشاءاللہ
کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم
کوشش کروں گا، فہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے
گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، علمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک
نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے۔ "ابن حزم" والا مضمون جلد
شائع ہو گا، صدارت کا انتخاب ہو چکا ہو گا[1]۔ ابھی یہاں خبر نہیں پہونچی، کتاب کے
سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی ہو گی، اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط، والسلام

عتیق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۵) ۶؍جون ۱۹۶۵ء مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، میں حج کے بعد مکہ مکرمہ ہی
میں علیل ہو گیا تھا، سخت قسم کا فلو ہو گیا تھا، بالکل بے جان ہو گیا، یہاں پہونچ کر
بھی اس کے اثرات رہے، کمزوری اب بھی باقی ہے، شکر ہے کتاب طبع ہو گئی۔
اور عمدہ طبع ہو گئی، آپ کے لیے بطور معاوضہ نہیں بطور ہدیہ ۲۵۰ طے شدہ ہیں،
جیسے ہی گنجائش نکلے گی ارسال خدمت کر دیے جائیں گے، ادارے کی حالت بس
یوں ہی سی ہے[2] مجھے فرصت نہیں ملتی دوسروں کے بس کا کام نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ
ضروری مصارف میں بھی تنگی ہوتی ہے، جس کتاب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، بمبئی میں
ضرور دیکھوں گا، خدا کرے ادارے سے شائع ہو سکے، مدینہ منورہ میں عزیز مولوی خالد سلمہٗ[3]

---

[1] جمعیۃ علماء مہاراشٹر کی صدارت کا انتخاب۔ [2] میں نے اس کے بدلے تاجرانہ نرخ پر
کتابیں لے لی تھیں، اس کے بعد یہی روایت قائم رہی کہ ہر کتاب کے پچیس تیس نسخے لے لیتا تھا۔
[3] عزیزم خالد کمال سلمہٗ، یہ اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔

سے ملاقات ہوئی تھی، وہاں قیام صرف تین روز رہا۔ یونیورسٹی بھی نہ دیکھ سکے، اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۶) مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۵ء مخلصم و محترم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، گرامی نامہ ملا۔ جواب بینا اور بھوپال کے درمیان چلتی ٹرین سے لکھ رہا ہوں، پٹھان کوٹ زنّاٹے سے دوڑ رہی ہے اور قلم ہل رہا ہے، یہ معلوم ہو کر کہ قرعہ میں نام نہیں آسکا، افسوس ہوا، قرعہ ہی ٹھہرا، اس کی کشتی اکثر حالات میں ہواؤں کے خلاف چلتی ہے، صورت یہ ہے کہ گزشتہ سال کے تلخ تجربے کے بعد اس سال کمیٹی میں یہ طے ہوگیا تھا کہ میں اپنے پاس کوئی علیحدہ کوٹا نہیں رکھوں گا، چنانچہ میرے پاس ایک سیٹ بھی پہنچی ہے، سفارش ضرور کرسکتا ہوں اگرچہ وہاں بھی چند ہی سیٹیں ہیں، کمیٹی میں تو زیادہ کی بات ہوئی تھی مگر حکومت نے اندازے سے بہت کم تعداد نشستوں کی کردی ہے، اس لیے وہ صورت باقی نہیں رہی، بہرحال اگر آپ کا حج فرض ہے اور آپ پہلی دفعہ جارہے ہیں تو "مسٹر ڈی، اے قدوائی ڈپٹی سکریٹری اکسٹرنل افیرز نئی دہلی کے نام درخواست بھیجیں، اور اس کی کاپی مجھے بھیج دیں، درخواست ٹائپ شدہ انگریزی میں ہو، میں یہاں ممکن سعی کروں گا، کیوں کہ بحالت موجودہ میری حیثیت سفارشی ہی کی ہے، میرے پاس براہ راست کوئی کوٹہ نہیں ہے۔ قدوائی صاحب کے پاس بھی نہیں ہے، مگر اِکّا دُکّا درخواستوں پر ہم اور وہ مل کر غور کرسکتے ہیں، اور مجھ سے پوچھئے تو سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس سال صبر سے بیٹھے رہیں، اور اگلے سال کا انتظار کریں، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، بھوپال سے غالباً پرسوں واپسی ہوگی۔ مدینہ منورہ سے مولوی خالد کمال سلمہٗ کا خط آیا تھا، جواب لکھوں گا،

علماء ہند کی عربی تصنیفات پر آپ کا مقالہ پا کر کتاب شائع ہوئی تھی، مولوی خالد سیف اللہ کو جدہ میں اس کی ضرورت ہے کیا کرنا چاہیئے۔ فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی

(۷) .... ۱۹۶۵ء محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، ڈاکٹر[ل] صاحب موصوف کو ادارے کے قواعد وضوابط کی کاپی بھیجی جارہی ہے۔ میں ان کو خط بھی لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، لائف ممبر بن جائیں تو اس وقت ادارے کو بڑی مدد مل جائے، جنگ کے بعد سے حالات بہت نازک ہو گئے ہیں، یہاں کی مطبوعات کی اعلیٰ پیمانے پر کھپت پاکستان میں ہوتی تھی، وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ کتابیں منگاتے تھے اور اس طرح ادارہ کی اہم ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں، اب یہ سلسلہ تمام تر منقطع ہے اور مستقبل قریب میں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آتی، ذی استطاعت صاحب خیر اور صاحب ذوق اگر توجہ سے کام لیں تو یہ نازک وقت ٹل سکتا ہے، بہتر ہوگا کہ آپ ہی ڈاکٹر صاحب موصوف کو تازہ مطبوعات کے بعد خط تحریر فرمادیں، ابھی تک آپ کی دوسری کتاب کی کتابت شروع نہیں ہو سکی ہے، اور اس کی وجہ بھی حالت کی ناسازگاری ہے، جیسے ہی موقعہ ملے گا کام شروع کرایا جائے گا، "عرب وہند عہد رسالت میں" پر تبصرہ کا کٹنگ بھی مل گیا تھا، امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی

(۸) ۱۸ر اگست ۱۹۶۶ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، پہلا خط بھی پہونچ گیا تھا، تاخیر جواب کے لیے معذرت خواہ ہوں، سب سے پہلے تو زیارت حرمین شریفین سے بخیریت

ل جناب ڈاکٹر عبداللطیف خاں صاحب مقیم کویت۔

تمام واپسی پر مبارکباد قبول فرمائیں، بہت خوب ہوا کہ مولوی خالد سلمہ، کی موجودگی میں والدین کو یہ سعادت میسّر ہوگئی، ادارے کے حالات ناقابلِ بیان حد تک نازک ہیں، ہر مہینے یہی انتظار رہتا ہے کہ پاکستان سے سلسلہ کھلے اور کام جاری ہو، یہ پورا سال انتہائی پریشانی میں گذرا ہے، اور اب پانی سر سے اونچا ہے، افسوس دوستوں تک کو یہ احساس نہیں کہ ندوۃ المصنفین جیسے بہترین علمی اور مذہبی ادارے پر کیا بیت رہی ہے، جس روز بند ہو جائے گا دنیا حیرت کرے گی، بمبئی میں کام کی اچھی خاصی گنجائش ہے مگر کرے کون؟ غیر ضروری کاموں کے لیے روپیہ جمع ہو جائے گا مگر ندوۃ المصنفین کو "چند لائف ممبر، چند خاص ممبر" اور بہت سے عام ممبر نہیں ملیں گے، یاللعجب! آپ کی کتاب میں تاخیر کا سب سے زیادہ یہی سبب ہے، تمام ضروری کام روک دیے گئے ہیں، کیونکہ کچھ ہے ہی نہیں، اسٹاک ہے جو پڑا ہوا ہے، کتاب کا مسودہ برائے کتابت بہرحال اسی عمدہ کاتب کو دیا جا رہا ہے، توقع ہے چند مہینوں میں کتاب طبع ہو کر سامنے آجائے، یہی فکر ہے کہ کاغذ کہاں سے آئے گا، طباعت کی رقم کا کیا ہوگا؟ میں حالات کی ناسازگاری سے گھبرانے والا نہیں ہوں، مگر عزم و ہمت کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۹) ۲۴ر جولائی ۱۹۶۷ء۔ مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ اگرچہ مولوی محمد ظفر احمد خاں[1] کے نام ہے لیکن میرے ذمّہ ہی جواب کا قرضہ ہے، وہ خط اس وقت سامنے نہیں ہے، کہیں دبا ہوا ہوگا، میری حالت ایسی ہی ہوگئی ہے، کتابت شکر ہے مکمّل ہوگئی ہے، یہاں تک کہ

[1] ندوۃ المصنفین کے قدیم خادم اور آفس انچارج چند سال ہوئے انتقال کر گئے۔ ضیق النفس کے دائمی مریض تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

پرسوں میں نے بھی چند منٹ نکال کر اپنے دو صفحے لکھدیے ہیں، یہ چھوٹی سی بات تھی مگر بڑی تھی کہ میرے پاس ان کاموں کے کرنے کا وقت ہی نہیں، کتاب ان شاء اللہ " دیر آید درست آید" کا مصداق ہوگی، کوشش کی جائے گی کہ پروف آپ دیکھ سکیں، یہ اچھا ہوگا،

حاجی احمد غریب صاحب کی رحلت کا قلب پر غیر معمولی اثر ہے، بڑے صاحب خیر، اعلیٰ درجہ کے منتظم اور تعمیری صلاحیت کے شخص تھے، اجتماعی کاموں سے بھرپور دلچسپی لیتے تھے، افسوس کم عمر پائی، ان کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، میں نے آج ہی فینسی محل کے پتے پر حافظ محمد صدیق صاحب کو خط لکھا ہے، اندیشہ ہے کہ حافظ صاحب بمبئی نہ ہوں اور خط ضائع ہو جائے، اچھا ہو کہ خط محفوظ ہو جائے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، مولوی خالد صاحب سلمہٗ کی کامیابی سے قلبی مسرت ہوئی، صالح اور لائق نوجوان ہیں، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی اولاد میسر ہوئی۔ میں الحمدللہ بخیریت ہوں، دوسری جانب مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کے لیے چھوڑ دی ہے۔

عتیق الرحمن عثمانی، دفتر برہان جامع مسجد دہلی ۶

خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تعزیتی خط بھی میرے پاس محفوظ ہے جس کو آپ نے الحاج احمد غریب صاحب میمنی مرحوم کی وفات کے سلسلہ میں ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق صاحب میمنی مرحوم کے نام لکھا تھا اور اوپر خط میں جس کے محفوظ ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے، اس مکتوب کو بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۲۴ر جولائی ۱۹۶۷ء مخلصم و محترم جناب حافظ محمد صدیق صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کن لفظوں میں حاجی احمد غریب صاحب مرحوم کی تعزیت کی جائے، آپ کے قلب پر تو جو کچھ گذر رہی ہوگی، ہم لوگ بھی اس المناک خبر کو سُن کر دم بخود رہ گئے، بہت سخت اور غیر معمولی حادثہ ہوا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ

صد افسوس ملّت کا ایک سچّا خادم اُٹھ گیا، مرحوم سے پہلی ملاقات غالباً ۴۹ء
میں "محمدی جہاز" پر ہوئی تھی، مرحوم امیر الحج تھے، اور ہم لوگ ایک ڈیلی گیشن
میں حجاز جا رہے تھے، اس کے بعد سے تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت مرحوم
کی ایک ایک خصوصیت رہ رہ کر یاد آرہی ہے، اعلیٰ درجہ کے منتظم، ملّت کے
زبردست بہی خواہ، اجتماعی مصلحتوں کو سمجھ کر بہترین کام کرنے والے، بہت ذی اثر
اور قوم کے معتمد، جس کام کو ہات میں لیتے انجام تک پہونچاتے، خاموشی کے ساتھ امور
خیر میں حصّہ لینے والے، ہندوستان چھوڑنے سے کچھ ہی پہلے مرحوم سے اسی فینیسی محل میں
بہت دیر تک ملاقات رہی تھی، افسوس ایسا مخلص خدمت گزار اور غیر معمولی کارکن
اس قدر جلد ہم سے جُدا ہو گیا، اس درجے کے کارکن جن میں اجتماعی اور اصلاحی کاموں
کی اتنی اعلیٰ صلاحیت ہو کم ہی ہوتے ہیں، مرحوم آج دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے
تعمیری کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے، صابو صدیق مسافر خانہ کی آخری منزل، انجمن
خدام النبی، اور دوسری جمعیتیں سب ہی ان کی خدمات کو یاد کریں گے، آپ کے لیے
اور مرحوم کے بچّوں اور اہلیہ کے لیے یہ صدمہ خاص طور پر جاں کاہ ہے، اللہ تعالےٰ
آپ سب کو صبر و رضا سے نوازیں، ازراہِ کرم ان کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادوں تک
کلمات تعزیت پہونچا دیں۔

اصبر نکن صابرین فانما — صبر الرعیة عند صبر الراس

خیر من العباس صبرک بعدہ — واللہ خیر منک للعباس

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۱۰) ۱۹ / جون ۱۹۶۸ء

مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کرم نامہ پہونچا، "عرب و ہند عہد رسالت"
جتنے نسخے خدمت گرامی میں پیش کئے گئے تھے، اتنے ہی نسخے اس کتاب کے بھی پیش

کئے جائیں گے، میں نے مولوی محمد ظفر احمد خاں سے کہدیا ہے، آپ ان کو وہی پہلے کی تعداد تحریر فرمادیں، شاید ایسا ہوا تھا کہ نقد روپئے کے بجائے آپ نے کتابیں لی تھیں، اس کے بعد یہی صورت باقی رہے گی تو تاجرانہ رعایتی معاملہ ہو جائے گا، افسوس آپ کو زحمت انتظار اٹھانی پڑی، پہلا خط میرے سامنے نہیں ہے، امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

(۱۱) ۹ ستمبر ۱۹۶۸ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تہنیت نامہ ملا تھا، مختلف سفر درپیش رہے، جواب میں تاخیر ہوگئی، آپ کے کلماتِ تہنیت سے قلب پر خاص اثر ہوا ہے، اور ان الفاظ سے تعلق خاص اور روحانی ربط کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا! یہ طلب ایک چیز آئی ہے، جس کی نوعیت کسی رسمی خطاب کی نہیں بلکہ علمی اعزاز کی ہے، اس لیے لائقِ شکر ہے۔ بہت سے اصحاب علم مجھ سے کہیں زیادہ اس اعزاز کے مستحق ہیں، مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے، آپ کا رسمی شکریہ کیا ادا کروں، اسلام اور ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے متعلق تمام مضامین کتاب کی صورت میں آنے چاہئیں، ان پر نظر ثانی فرمالیں، مناسب اضافے بھی ہو جائیں، مسودہ جلد آئے تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کی اشاعت شامل کر لی جائے، "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" پر ارشاد کی تعمیل میں چند لائنیں لکھ دی تھیں، عزیزم مولوی خالد کمال سلمہ، بہت انتظار کر کے گھر واپس چلے گئے، ان کے حالات سے تردد ہے، خدا کرے ویزا وغیرہ جلد آجائے مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔ فقط، والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۱۲)   ۱۷/ اکتوبر ۱۹۶۸ء   مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، - گرامی نامہ ملا - عزیزم مولوی خالد کمال کے بخیریت تمام پہونچنے کی اطلاع ہوئی، نہایت سعادت منداور قابلِ قدر اور نوجوان عالم ہیں، ان کیلئے دعا کرتا ہوں، یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ اسلامی ہند سے متعلق مضامین ایک مستقل تصنیف کے روپ میں مرتّب ہو گئے ہیں - ان کو جلد سے جلد ارسال فرمائیں کتابت فوراً شروع کرادی جائے گی، زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی جارہی ہے، جو کام جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے، ان شاء اللہ ۱۹۶۸ء کی مطبوعات میں آجائے گی، کاتب رامپور میں ہیں، مسوّدہ رجسٹری سے رام پور بھیج دیا جائے گا، جس ٹکڑے میں مزید اضافے کا خیال ہو اس کو بعد میں بھیج دیجئے گا، گھانا اطمینان سے جانا چاہیئے مگر جانا چاہیئے - ایک ضروری کام تھا، آپ اس کو زیادہ بہتر اور سلیقے سے کرسکیں گے "ندوۃ المصنفین" کے اغراض ومقاصد عربی میں عمدہ اور نفیس ٹائپ میں طبع ہوتے چاہئیں، دس بارہ سال ہوئے لیتھو میں طبع ہوئے تھے، شاید مولانا عبدالمجید نعمانی نے ان کو عربی میں منتقل کیا تھا - رائے ہو گی تو عربی، اردو دونوں کی کاپیاں بھیج دی جائیں گی، یہاں یہ کام ٹھیک نہیں ہو سکتا، ٹائپ کا دہلی میں کوئی اچھا پریس نہیں ہے، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب مستقل بیمار رہیں، کوئی نیا کام ان سے نہیں ہوتا، میری بے فرصتی اور ہجوم کار کا آپ کو اندازہ ہے، ضروری مصارف ادا کر دیئے جائیں گے - والسلام - عتیق الرحمٰن عثمانی -

(۱۳)   ۱۱/ مارچ ۱۹۷۰ء   مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ - گرامی نامہ ملا تھا، جواب میں تاخیر ہی ہو جاتی ہے - اس درمیان میں متعدد سفر بھی رہے، کیا عرض کروں پاکستان سے کاروبار بند ہونے سے ادارہ کا ڈھانچہ بگڑ اجا رہا ہے، محض ساکھ ہے کہ گاڑی کھسک رہی ہے، مجموعۂ مقالات دو مہینے

قبل آجاتا تو ۱۹۶۹ء کی مطبوعات میں اس کتاب کو شامل کرلیا جاتا، اب ۱۹۷۰ء کی کتابوں میں شامل ہوگی، بہرحال فوراً بھیجدیں، کتابت میں بھی وقت لگتا ہے، ادھر ۱۹۷۰ء کے بھی تین مہینے گزرنے کو ہیں، ان شاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی، یعنی زیادہ سے زیادہ جولائی تک، اس کے بعد "العقد الثمین" کی کتابت ہوگی، بے شک اس طرح آپ کی کتب گرامی کا پورا سیٹ "ندوۃ المصنفین" سے شائع ہوجائے گا، "العقد الثمین" پر زیادہ توجہ دیں تو بہتر ہوگا[1]۔ تحریر فرمائیں کہ اس کا حجم کتنا ہوگا، شاید مناسب ہو کہ مجموعۂ مقالات میں دو ایک مقالے غیر مطبوعہ بھی شامل ہوجائیں، بعد میں بھیج دیجئے گا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں برکت عطا فرمائی ہے اور خلوص بھی، امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے، پرسوں احمد آباد کا سفر ہے اور شروع اپریل میں شاید کیرالا کا، ایک بڑی مسجد کا افتتاح کرنا ہے، بمبئی سے گزرنا ہوگا، مگر غالباً صرف دو گھنٹے ہوائی اڈے پر ٹھہرنا ہو، بہت دنوں سے بمبئی آنا نہیں ہوا، آپ حضرات سوچ سمجھ کر ایسا پروگرام بنالیں کہ اس بڑے اور اہم شہر سے ادارے کو کچھ لائف ممبر، کچھ معاونین خاص، کچھ معاونین، کچھ محسن خاص مل جائیں تو ایک ہفتے کے لیے بمبئی آجاؤں، اس سفر میں ادارے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۱۴) ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۷ رجب ۱۳۹۰ھ۔ مخلص و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمت نامہ ملا، حالات معلوم ہوئے، قانون فطرت کی رنگینیاں بھی عجیب ہیں، جب قویٰ جاندار اور مضبوط ہوتے ہیں، فرصت ہی فرصت رہتی ہے، اور جس وقت بڑھاپا اپنی تمام ناتوانیوں اور برکتوں کے ساتھ آتا ہے، بے پناہ

---

[1] پہلے خیال تھا کہ العقد الثمین کا ترجمہ شائع کرایا جائے، اسی سلسلہ میں یہ بات ہے، بعد میں یہ ارادہ ترک کرکے خلافتِ راشدہ، خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ کے اسلامی ہند پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

مشغولیتیں ہو جاتی ہیں، بہر حال جو کچھ بن پڑتا ہے ہو جاتا ہے، پوتے کے ورود مسعود پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ علم و عمر کی دولت سے نوازیں، مولوی خالد کمال سلمہٗ کو میری طرف سے تہنیت لکھدیں، "مآثر و معارف" کی کتابت غالباً نصف سے متجاوز ہو چکی ہے، جلد مکمل ہو جائے گی، ایک مہینے کے بعد مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب سے دریافت فرمالیں، آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ایسے کام روز روز نہیں ہوا کرتے، بنا بریں نہایت مناسب ہے کہ "العقد الثمین" ہر حیثیت سے مکمل ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام میں برکت دی ہے، ان شاء اللہ جلد ہو گا، اور بہتر ہو گا، ظ انصاری صاحب کو کتابیں کس پتے پر روانہ کی جائیں۔ فقط، والسلام۔ عتیق الرحمٰن عثمانی

مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب سلام مسنون پہونچاتے ہیں، پاکستان سے کام بالکل بند ہے اس لیے ادارے کی حالت سقیم تر ہے۔ آپ جیسے دوست ہمت بڑھائیں تو بمبئی میں کم سے کم ادارے کے ایک صد معاون بن سکتے ہیں، کچھ ہزار کے، کچھ سو کے، اور بہت سے چالیس روپئے سالانہ کے، ندوۃ المصنفین جیسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوتے، یہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے، فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر برہان، جامع مسجد دہلی۔

(۱۵) ۸ جولائی ۱۹۷۱ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا، ۲۵ کتابیں تو شاید جا چکی ہیں، مولوی محمد ظفر احمد خاں صاحب نے انہی کے متعلق لکھا ہو گا، یوں اُن سے کل دریافت کروں گا، اس وقت وہ یہاں نہیں ہیں، "خلافت راشدہ اور ہندوستان" کے مسودے کا انتظار ہے، آپ کی کتاب شائع کر کے مجھے مسرت ہوتی ہے، افسوس ہے کاروبار کی حالت سقیم تر ہے، ہمارے لٹریچر کا حلقہ پاکستان میں زیادہ ہے، اس حلقے کی

قوت خرید بھی زیادہ ہے لیکن برسوں سے یہ سلسلہ منقطع ہے، گفٹ کے نام پر کچھ پیکٹ چلے جایا کرتے تھے وہ بھی بند ہو گئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے، بہت دنوں سے اس ارادے میں ہوں کہ بمبئی آ کر ادارے کا حلقہ معاونین بنایا جائے، اس مشکل وقت میں اس سے بھی مدد ملے گی، کچھ لائف ممبر، کچھ معاونین خاص، اور ایک تعداد معاونوں کی مل جائے گی، بشرطیکہ ایک ہفتے قیام ہو اور کوئی دوسرا کام ساتھ نہ ہو، اور احباب بھی بھرپور تعاون دیں، آپ کے حالات سے تعلق خاص رہتا ہے، خط لکھنے میں کوتاہ ہوں مکان سے واپس تشریف لے آئیں تو اس پروگرام پر غور فرمائیں، مولوی خالد سلمۂ امید ہے بخیریت ہوں گے، "برہان" کے لیے کوئی نفیس مضمون بھی تحریر فرمائیے۔

عتیق الرحمن عثمانی

(۱۶) ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ گرامی نامہ پہونچا، مبارکباد قبول فرمائیں، شکر ہے بخیریت تمام تشریف لے آئے، پچھلے دنوں بمبئی جانا ہوا تھا اور قیام بھی اندازے سے ہو گیا، مقصد وہی "ندوۃ المصنفین" کی اعانت کی جانب توجہ دلانا تھا، آپ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا وطن تشریف لے گئے ہیں، آپ حضرات کو اب ادارے کی جانب خاص توجہ کرنی چاہیئے، نازک وقت آگیا ہے، ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے، کتاب کی بات یہ ہے کہ اس کی کتابت بہت دنوں سے مکمل ہوئی رکھی ہے جیسے ہی کاغذ کا انتظام ہو گا طبع کرا دی جائے گی، بنابریں اب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آخر میں کچھ اضافے ہو جائیں، مسودہ بھیج دیا جائے گا لیکن دشواری یہ ہے کہ پروف ریڈنگ کے وقت اس کی ضرورت ہو گی، یہ کام ہو جائے تو پھر آپ اطمینان سے اس پر نظر ثانی کر سکتے ہیں، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہوں، آپ حضرات کم سے کم

معاونین کے حلقوں کی توسیع کا کام کرسکتے ہیں، حکیم اصلاحی صاحب وغیرہ سے بھی ذکر ہوا تھا، عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر "برہان" جامع مسجد دہلی ۶

(۱۷) ۷ر اگست ۱۹۷۲ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مکرمت نامہ ملا، گرامی نامے کا جواب یہاں سے بھیج رہا ہوں، ۲۷ر جولائی کو گیا ہے، تعجب ہے وہ خط آپ کو نہیں ملا، ملا ہوگا تو بہت تاخیر سے، اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ "خلافت امویہ اور ہندوستان" کا مسودہ فوراً روانہ فرمادیں، جس طرح بھی ہوسکے گا اس کتاب کو ۱۹۷۲ء کی مطبوعات میں شامل کیا جائے گا۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ فقط، والسلام، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

(۱۸) ۲۴ر اگست ۱۹۷۲ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ۱۶ر اگست کو پہونچ گیا تھا، لیکن مسوّدہ پرسوں ۲۲ر اگست کو پہونچا ہے، پتے پر آپ نے "ندوۃ المصنفین" کے بجائے نیشنل مصنفین لکھا تھا، ہوسکتا ہے اسی وجہ سے تاخیر ہوئی ہو، ان شاء اللہ جلد کتابت شروع کرائی جائے گی، بڑا کام ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، یقیناً آپ نے اس کتاب کی تیاری میں محنت شاقہ برداشت کی ہے، خدا کرے "ندوۃ المصنفین" کسی خدمت کے لائق ہوجائے، بہت دنوں سے بمبئی کے خیال میں ہوں، وہاں ادارے کا بہتر کام ہوسکتا ہے مگر آپ حضرات ہمت نہیں بڑھاتے ہیں، مئی میں "دار المصنفین" کی وجہ سے رُک گیا کہ اس قدر جلد دوسرا کام شاید نہ ہوسکے[۱] امید ہے حالات کا جائزہ لے کر

[۱] دار المصنفین اعظم گڈھ کا ایک وفد اپنے ادارے کے تعاون کے لیے اپریل میں بمبئی گیا تھا۔

تحریر فرمائیں گے، آپ کی صحت وعافیت کے لیے دعار کرتا ہوں اور خود بھی دعار کا محتاج ہوں، فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

(۱۹) ۱۹ار مئی ۱۹۷۳ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بہت دنوں سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں کلکتہ جانا ہوا تھا، وہاں حکیم محمد زماں صاحب کے پاس آپ کا خط پہونچا تھا، جس سے معلوم ہوا تھا کہ ان دنوں مکان پر تشریف لائے ہوئے ہیں، اغلب یہ ہے کہ اب بمبئی واپس ہوگئے ہوں گے، کتاب کی کتابت مکمل ہوگئی ہے، غالباً ۶۵۰ صفحات پر کتابت ختم ہوئی ہے، اب اور کیا کرنا ہے؟ ان شاء اللہ جلد تمام کاپیاں پریس کو دے دی جائیں گی، بمبئی میں ادارے کا کچھ کام ہوجاتا تو اچھا ہوتا، یہ دن معمول سے زیادہ سخت گزر رہے ہیں، فقیہ صاحب، دسونی صاحب، اور حافظکا صاحب وغیرہ مدد کے لیے تیار ہیں، دوسری اہم تربات جس کی وجہ سے خاص طور پر یہ کارڈ لکھا ہے "برہان کے لیے مضمون کی ہے، آپ کے مقالات عام طور پر "معارف میں آتے ہیں، اور "برہان" اُن سے محروم رہتا ہے، کیا یہ علمی رسالہ آپ کے مقالات گرامی کے لائق نہیں ہے؟ ازراہ کرم بواپسی اپنے اس رسالہ کے لیے کوئی نفیس مضمون ارسال فرمائیں، میری دلی خواہش ہے کہ اب آپ دہلی منتقل ہوجائیں، برابر خیال میں ہوں، معمولی سروسامان کا انتظار ہے، حالات اور خیریت سے مع مضمون کے مطلع فرمائیں۔ فقط والسلام،

عتیق الرحمن عثمانی

(۲۰) اار دسمبر ۱۹۷۶ء مخلصم ومحترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ ملا، "دیارِ یورپ میں علم وعلمار" کا مسوّدہ بھی پہونچ گیا، کیا عرض کروں حوصلہ تو بہت کچھ ہے لیکن مزاج کی افتاد اور

وسائل کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہوں، دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر ندوۃ المصنفین ابھی بے نوائی کے عالم میں ہے، ان دنوں میں اور بھی زیادہ دشواری ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے، ان شاء اللہ آپ کی یہ کتاب بھی ادارے سے شائع ہوگی، جیسے ہی موقع ملے گا، اور یہ موقع جلد آئے گا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا جائے گا، یہ معلوم ہو کر کہ "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" پر توجہ سے نظر ثانی ہو رہی ہے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی برکاتِ خاص سے نوازا ہے، قلب کو اس سے اطمینان ہوتا ہے کہ ایک مخلص عالم دین اور لائق مصنف کی محنت "ندوۃ المصنفین" جیسے ادارے کے سیلے سے ٹھکانے لگ گئی، امید ہے آپ ہر طرح بعافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

(۲۱) ۱۹ر جنوری ۱۹۸۲ء، مخلصم و برادرم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ کئی ہفتے ہوئے موصول ہوا تھا، میری طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہو گئی تھی، کھانسی کی شدت کی وجہ سے نیند بھی نہیں آتی تھی، جواب میں تاخیر ہو گئی، معذرت خواہ ہوں، قاضی حیات النبی مرحوم[1] کے سانحۂ رحلت کی اطلاع سے بہت صدمہ ہوا، افسوس آپ اپنے دست و بازو سے محروم ہو گئے، مجھے معلوم تھا کہ وہ آپ کی علمی زندگی کے سکون کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسمی صلاحیتیں اپنی جگہ ہوتی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ باضابطہ مولوی نہ ہو کر بھی بہت سے رسمی علماء سے زیادہ معلومات رکھتے ہوں،

گرامی نامہ سے یہ معلوم ہو کر اور افسوس ہوا کہ مرحوم نہ صرف علمی معلومات رکھتے بلکہ بہت اچھے معاملہ فہم بھی تھے، مرحوم کی جو غیر معمولی صلاحیتیں آپ نے تحریر فرمائی، ان کا

---

[1] متوفی صبح جمعہ ۲۰ر صفر ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء رحمۃ اللہ علیہ،

قدرتی تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اُن کی جدائی کا اعزہ واقربار اور علاقہ کے تمام باشندوں پر غیر معمولی اثر ہو، میں نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی ہے اور ایصالِ ثواب بھی، بلاشبہ یہ صدمہ آپ کے لیے جانکاہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور آپ کو اور تمام متعلقین کو توفیق صبر سے نوازیں، آمین، آدمی چلا جاتا ہے مگر اس کی خصوصیتیں باقی رہ جاتی ہیں، جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید ہوتی ہیں۔

گرامی نامہ سے والد مرحوم کی جدائی کا صدمہ بھی تازہ ہونا ہی چاہیئے تھا، [1] آپ کی صحت وعافیت کے لیے بھی دعار کرتا ہوں، اب آپ جیسے قناعت پسند علمار کم ہی رہ گئے ہیں، میں نے آپ کی زندگی کے مختلف دور دیکھے ہیں اور ہر حالت میں آپ کو مطمئن پایا ہے، فی الحقیقت یہ بہت بڑی نعمت ہے، باقی ضروری باتیں ان شار اللہ کسی دوسرے وقت لکھوں گا۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، دفتر برہان، اردو بازار، دہلی ۶

---

[1] والد ماجد الحاج محمد حسن صاحب متوفی ۱۱ر ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۰ر فروری ۱۹۷۸ء رحمۃ اللہ علیہ۔

مفتی بنام قاضی

(۱) مورخہ ۴ر فروری ۱۹۵۹ء　　　محترم مولانا دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ گرامی نامہ ملا، "رجال السند والھند" مل گئی تھی، اکثر کتابوں پر تبصرے مولانا سعید احمد کرتے ہیں، چنانچہ کتاب ان کو بھیج دی گئی ہے ان شاء اللہ جلد اظہار رائے کیا جائے گا، تبصروں کے لیے صرف تین چار صفحات ہوتے ہیں، کبھی اتنے بھی نہیں اس لیے تاخیر ہوجاتی ہے، مولانا سعید احمد کو مزید تاکید لکھدوں گا، کتاب جب آئی تھی میں نے بھی اس پر چلتی ہوئی نظر ڈالی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب لکھ کر آپ نے ایک بڑے خلا کو پُر کردیا ہے، بکھرے ہوئے موتی یکجا ہوگئے ہیں، اور سندو ہند کے ارباب علم وحکمت کا ایک خوبصورت ہار تیار ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ یہ گراں قدر خدمت قبول فرمائیں، آپ کے کام میں یوں بھی بڑی برکت ہے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں،

فقط والسلام،　　　عتیق الرحمن عثمانی

(۲) ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۰ء　　　محترم مولانا دام مجدہم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ۔ مکرمت نامہ ملا۔ مضمون گرامی بھی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کردی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں، انشاء اللہ جنوری کے "برہان" میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون "برہان" کے معیار پر پورا نہ

اترے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلمہ، کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں، "برہان" کے صفحات ۶۴ ہیں، اور مضامین کی کثرت ہے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔ عتیق الرحمن عثمانی، برہان آفس، جامع مسجد دہلی۔

(۳) مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، گرامی نامہ ملا، مضمون بھی پہونچ گیا تھا، "برہان" میں جلد شائع ہوگا، کاموں کے ہجوم میں حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری خطوط کے جواب بھی رہ جاتے ہیں، آپ کبھی بھی اس کا خیال نہ فرمائیں، کتاب "ندوۃ المصنفین" سے ضرور شائع ہوگی، اس کو مکمل کرلیں[1] ادارے کو اس سلسلہ میں آپ کی کیا خدمت کرنی ہوگی، اس کو صاف کرلیں[2] رائلٹی کا یہاں کوئی سلسلہ نہیں ہے، کسی زیادہ بہتر معاوضہ کی بھی توقع نہ رکھیے، کیونکہ ادارے کے حالات ایسے ہی ہیں، پھر بھی خدمت کی جائے گی، میں سمجھتا ہوں آپ کے سامنے پوری صورت حال ہے، غالباً ۸ ار کو بمبئی آنا ہوگا، حج کمیٹی کی میٹنگ ہے، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام، عتیق الرحمن عثمانی،

(۴) ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ء مخلصم و محترم جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، مکرمت نامہ ملا۔ مجھے خیال تھا کہ اس دفعہ آپ سے اطمینان کی ملاقات نہ ہو سکی، سچ تو یہ ہے اس عرصے میں کئی دفعہ خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر پورا نہ ہو سکا، کاموں کے ہجوم اور ماحول کی ناسازگاری کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ضروری کام بھی رہ جاتے ہیں، بمبئی میں بارش کا اتنا زور تھا کہ کہیں آنا جانا مشکل ہو گیا تھا، افسوس

---

[1] عہد و ہند عہد رسالت میں، [2] کچھ نہیں۔

آپ کو زحمت ہوئی، کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آپ تشریف لائے تھے، ورنہ فون پر ہی معذرت کر لیتا۔

کتاب کا آخری باب فوراً ارسال فرمائیں اور شروع کے صفحات بھی، کتابت فوراً ہو جائے گی، کتابت کی عمدگی اور باضابطگی کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا مسودہ سامنے ہو، مسودہ کاتب کو دے دیا گیا ہے، دونوں مضمون محفوظ ہیں، ان شاء "برہان" ہی میں شائع ہوں گے، بعض مضامین کی طوالت اور تسلسل کی وجہ سے یہ دشواری پیش آ رہی ہے کہ متعدد اہم مضامین دو دو سال بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ مدت سے رُکے ہوئے ہیں۔

آپ کے مضمون گرانقدر ہوتے ہیں، واپس کیسے ہو سکتے ہیں، امید ہے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں گے، خان[1] صاحب گاڑی لے آئے تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تفریح کو چلا گیا تھا، کیونکہ چھوٹا لڑکا ساتھ تھا۔

(۵) یکم ستمبر ۱۹۶۴ء   برادرم و مخلصم مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ ملا تھا، لفافہ بھی پہونچ گیا تھا، پورا مسودہ کتابت کے لیے دے دیا گیا ہے، کاتب پختہ قلم ہے، ان شاء اللہ کتابت مناسب رہے گی، میرا دو چار سطریں لکھنا، بس یہی ایک مرحلہ ہے، تاہم کوشش کروں گا، فہرست اور ابتدائیہ وغیرہ کے ساتھ دو صفحے مزید محفوظ رکھے گئے ہیں، کتاب کا سائز بڑا ہی رکھا گیا ہے، علمی کتابوں کے لیے چھوٹا سائز ٹھیک نہیں رہتا، حالانکہ اس میں کافی کفایت ہوتی ہے "ابن حزم" والا مضمون جلد شائع ہوگا، صدارت کا انتخاب ہو چکا ہوگا، ابھی یہاں خبر نہیں پہونچی، کتاب کے سلسلے میں کچھ خدمت آپ کی بھی ہوگی، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام،   عتیق الرحمٰن عثمانی، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی۔

---

[1] جناب اے، اے خان صاحب، بمبئی۔

آخری مکتوب

حضرت مفتی صاحب مرحوم بہت دنوں سے چاہتے تھے کہ میں بمبئی جیسے ہنگامی اور خالص کاروباری شہر سے نکل کر ندوۃ المصنفین دہلی کے علمی ماحول میں آجاؤں، جب بھی بمبئی تشریف لے جاتے یا ملاقات ہوتی تو کسی نہ کسی انداز میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے، چونکہ حالات کے پیشِ نظر میں ان کی خواہش پوری کرنے سے معذور تھا جس کا علم حضرت مفتی صاحب مرحوم کو بھی تھا، اس لیے آخر تک ان کی یہ خواہش افسوس کہ پوری نہ ہو سکی، اور وہ دنیا سے چلے گئے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے پہلے اجلاس کے موقع پر بمبئی میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور حضرت مفتی صاحب دونوں حضرات نے اس موضوع پر میری موجودگی میں طویل گفتگو کی، مگر بات کسی نتیجہ تک ختم نہیں ہوئی، مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط مرحوم بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ کی جگہ بمبئی نہیں دہلی ہے، وہ اخبار الجمعیۃ سے مجھے منسلک کرنا چاہتے تھے، مگر وہ بھی حالات کے پیش نظر خواہش اور افسوس ہی کرتے رہے۔

گذشتہ سال مارچ میں میرے پاکستان کے سفر کے موقع پر بھی حضرت مفتی صاحب نے اپنی اسی خواہش کا اظہار فرمایا تھا مگر افسوس کہ ان کی تمنّا پوری نہ ہو سکی جس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا، ویسے تو کئی حضرات اس قسم کی خوش کن باتیں کیا کرتے ہیں اور آج بھی مجھے بظاہر دعوت دیتے ہیں مگر ان کی دعوت میں وہ جان نہیں ہوتی ہے، جو ان بزرگوں کی خواہش میں ہوا کرتی تھی۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب کا یہ آخری خط ان کے خلوص، تعلق، علمی قدردانی اور خورد نوازی کی آخری سند ہے۔

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

۱۴ر فروری ۱۹۸۰ء۔

محبی و محترمی جناب مولانا قاضی اطہر صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مکرمت نامہ ۳۰ر جنوری ۸۰ء کو مل گیا تھا۔ دو روز کے بعد میاں حسان احمد اور کبیر احمد سلمہا برائے ملاقات آئے[1] اور گرامی نامہ بھی لائے، اس وقت اُن سے سرسری بات ہوئی کہ اگلے دن جمعہ کے بعد آئیں گے، مگر نہیں آئے، غالباً موقع نہیں ملا، خیال تھا کہ ان دونوں کو ایک وقت چائے ناشتہ پر مدعو کروں، ہمارا آپ کا تعلق رسمی نہیں حقیقی روحانی تعلق ہے، الجھنوں میں گرفتار رہتا ہوں اور صحت بھی ٹھیک نہیں ہے، ۱۹ر اکتوبر ۷۹ء سے عرق النساء کے عارضہ میں مبتلا ہوا تھا، یہ تکلیف کئی مہینے تک قائم رہی۔ بہت دنوں تک تو گھر سے دفتر تک آنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ بجلی کی سکائی کا بہانہ ہوا اور اس طرح کی معذوری جاتی رہی۔

مولوی محمد ظفر احمد صاحب مرحوم قریب کی مسجد میں جہاں چڑھنا نہ پڑے اپنے ساتھ رکشہ میں لے جایا کرتے تھے، افسوس وہ بھی ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے، آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے کہ تقریباً چالیس بیالیس سال سے ادارہ سے منسلک تھے، ان کی دیانت و امانت مسلم تھی، متعلقہ کاموں سے بھی پورا شغف تھا، میرے مزاج سے بھی پوری طرح واقف ہو گئے تھے، واقعہ یہی ہے کہ ان کا بدل مشکل ہی سے ملے گا۔[2] میری صحت اور حالات بھی اب ایسے نہیں ہیں کہ ادارہ کے جزوی اور روزمرہ کے کاموں کو دیکھ سکوں، "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کی کتابت بھی معلوم ہوا ہے کہ آخری مرحلہ میں ہے،

---

[1] حسان احمد بن قاضی اطہر، کبیر احمد بن قاضی حیات الہٰی مرحوم برادر قاضی اطہر۔

[2] مولوی حکیم محمد ظفر خاں شاہجہاں پوری مرحوم دفتر ندوۃ المصنفین کے انچارج اور حضرت مفتی صاحب مرحوم کے معتمد خاص۔

چاہتا تھا کہ صحیح صورت حال معلوم ہو جائے تو آپ کو اطلاع دوں، کتاب کی کتابت منشی وجیہہ اللہ صاحب رامپوری کر رہے ہیں، ان کے لڑکے سے معلوم ہوا تھا کہ عربی کے کچھ ٹکڑوں کی کتابت باقی ہے، دارالعلوم جشن صد سالہ تک سفر کے لائق ہوا تو ضرور ملاقات ہوگی۔

اپنی بے نوائی پر افسوس ورنہ میری دلی خواہش یہی ہے کہ آپ جیسا صاحب کمال جس کو اب فرصت بھی ہے اور فارغ البال بھی ہے دہلی میں قیام کرکے ادارے کی خدمات انجام دے،

ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔

میاں عمید الرحمٰن کی طرف سے سلام مسنون، میاں حسان احمد اور کبیر احمد کو دعائیں، آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعاء کرتا ہوں۔ عتیق الرحمٰن عثمانی۔

مکتوب نمبر: ۲۲ر دسمبر ۱۹۶ ء

محترم مولانا دام مجدہ السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکرمت نامہ ملا، مضمون گرامی بھی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کر دی گئی ہے، بہر حال معذرت خواہ ہوں۔ ان شاء اللہ جنوری کے "برہان" میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون "برہان" کے معیار پر پورا نہ اُترے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں نمایاں ہیں، مولوی خالد سلمہ، کے بھی دو مضمون آئے ہوئے ہیں، "برہان" کے صرف ۶۴ صفحات ہیں اور مضامین کی کثرت ہے، اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، بُرہان آفس جامع مسجد دہلی۔

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

ڈاکٹر محمد یوسف خاں، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآن پاک کے بارے میں ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ وہ منزل من اللہ ہے یعنی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ جس کی تقدس و پاکیزگی کی وجہ سے قسم کھائی جاتی ہے اور جس کے بارے میں وہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس کے ہر حکم و ہدایت کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے ورنہ وہ مومن یا مسلم کہلانے کا حقدار نہیں حدیث وفقہ کے بعض پہلوؤں کے صحت و عدم صحت پر ہم بحث کر سکتے ہیں لیکن دنیائے اسلام کا ہر شخص اور ہر فرقہ جس چیز کے ہر حرف اور نقطے پر ایمان رکھتا ہے وہ کوئی اور کتاب نہیں صرف قرآن ہی ہے۔

اسلام کے سخت ترین مخالف بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو قرآن آج ہمارے سامنے موجود ہے وہ بالکل حرف بہ حرف ویسا ہی ہے جیسا آج سے چودہ سو سال قبل تھا، اس میں ایک شوشہ و نقطہ کی کمی و بیشی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہوتا تو آج اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہوتیں مگر پھر بھی انسانی ذہن قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت کیوں مانگتا ہے؟

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کچھ لوگ اسلام سے کن وجوہات کی بنا پر بے بہرہ ہیں جو اس طرح کے سوال کرنے پر مجبور ہیں۔ کچھ لوگوں کا دین اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت کے کئی اسباب ہیں ان میں سب سے بڑا اور خراب موجودہ دور میں مسلمانوں کی خستہ حالت ہے۔ مسلم حکومتیں اور قومیں بگڑ کر گمراہ ہوگئیں۔ دین کی حقیقت کے ساتھ ساتھ دنیاوی مصلحتوں سے بھی جہل عام ہوگیا، یہاں تک کہ مسلمان خود اپنے دشمنوں کے لئے ایک زبردست حجت و دلیل بن گئے جو ان کی حالت کو پیش کرکے کہتے ہیں کہ اسلام کی نہ دنیا ہی بھلی نہ دین ہی بھلا، اور اسی ایک بات پر دشمنان اسلام نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے اور بہت سے مسلم نوجوانوں کو جتلادیا ہے کہ انہی لوگوں کے ہاتھوں ہی اسلامی چیز کو خواہ عقیدہ ہو یا اخلاق، قانون ہو یا معاشرہ تباہ کرکے کام ہوا ہے اور ہوتا ہے۔

رشید رضا نے ایک معتبر راوی سے سید جمال الدین افغانی کا قول نقل کیا ہے کہ "اگر ہم یورپ کو اپنے دین کی طرف دعوت دینا چاہیں تو ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ یورپ کو یقین دلادیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، یورپ والے قرآن کے اندر سے ہمیں یوں دیکھتے ہیں ——— یہ کہہ کر آپ نے اپنی ہتھیلیاں منہ کے سامنے کیں اور انگلیوں کے شگافوں سے دیکھ کر فرمایا ——— وہ اس طرح قرآن کے اندر سے ہمیں دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کے پیچھے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں جہل، نااتفاقی، کاہلی پھیلی ہوئی ہے .... اور کہتے ہیں کہ اگر واقعی یہ کتاب اصلاح کی ہوتی تو اس کے ماننے والے اس قدر ابتر و پراگندہ ہرگز نہ ہوتے"۔[1]

۱۔ وحی محمدی از سید رشید رضا مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۱۳

سید موصوف کے اس قول سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنا مذہب ہی چھوڑ دیں یہ ایک طنز ہے جو انھوں نے مسلمانوں کے اس قول سے قرآنی تعلیم چھوڑ کر اس حال پر کیا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو سید صاحب موصوف کے اس قول سے سبق حاصل کر کے خود کو سدھارنا چاہیئے کہ ہمیں تبلیغ کی بھی ضرورت نہ پڑے بلکہ لوگ خود بخود ہماری طرف آئیں۔

قرآن فصاحت و بلاغت کا ایک بڑا سرچشمہ ہے۔ مومنوں اور کافروں پر جس کی تاثیر حد اعجاز تک پہونچ گئی۔ قرآن نے اپنی معجزانہ بلاغت سے عرب میں ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دیا تھا حالانکہ اہل عرب خود اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر اس قدر نازاں تھے کہ تمام غیر عرب کو عجمی کہتے تھے۔ علماء اسلام نے قرآن کے تمام معجزوں میں اسی معجزے کو لے کر تمام بنی نوع انسان کو چیلنج کیا تھا اور چونکہ عرب و غیر عرب مبلغ قرآن کے سامنے بے بس ہو گئے تو علماء نے اس کو حضورؐ کی سب سے بڑی حجت و دلیل قرار دیا لیکن اب جبکہ اس کو کئی صدیاں بیت گئیں تو چند متفرق افراد کے سوا کوئی بھی اس حجت یا دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور قرآن کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے جس میں سب سے اہم یہی مباحثہ ہے کہ کیا ثبوت ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

علماء فرنگ کے فہم قرآنی کا دارومدار قرآن کے ترجموں پر ہے۔ کیونکہ اگر انھیں عربی زبان پر کافی عبور حاصل ہے مگر پھر بھی ان کا وہ ادراک و فہم اہل زبان ہونے کی وجہ سے عربوں کی انتہا کو نہیں پہونچ سکتا، اور کوئی بھی مترجم ان معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہے جو قرآن پاک کی اعلیٰ عبارت اور اس کے اسلوب سے خود ظاہر ہوتا ہے۔ ہر مترجم دو کوتاہیوں کا ضرور

شکار ہوتا ہے: اپنی سمجھ کی کوتاہی کا اور اپنی زبان کی کوتاہی کا[1]

اس بات کا اعتراف محمد رشید رضا سے مسٹر مارما ڈیوک پکتھال نے کیا جو قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اسی چیز کا اعتراف فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر ماردریس نے بھی کیا ہے جنھیں فرانس کی وزارت خارجہ اور وزارت تعلیم نے ان باسٹھ لمبی سورتوں کے ترجمہ پر مامور کیا تھا جن میں مطلب کی تکرار نہیں ہے۔ موصوف نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ (۱۹۲۶) میں لکھا ہے:

"قرآن کا پیرایۂ بیان خود اللہ کا پیرایۂ بیان ہے وہ پیرایہ جو اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی حقیقت کا حامل ہے ضرور خدائی پیرایہ ہی ہو سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ شک رکھنے والے اہل قلم بھی اس پیرائے کی ساحرانہ قوت کے آگے جھک جانے پر مجبور ہو چکے ہیں"[2]۔

قرآن پاک، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام پر غیر مسلموں نے بہت سے اعتراض کیے ہیں۔ یہ اعتراضات، اتہامات اور مغالطے کہیں آیتوں کے غلط ترجمے، کہیں احادیث کا غلط مفہوم، کہیں ظلم وستم کی فرضی داستانیں بنا کر کیے جاتے ہیں مگر حق گو اور حق پسند انسانوں سے کوئی زمانہ، کوئی ملک اور کوئی قوم خالی نہیں۔ آخر انہی کے ہم مذہبوں نے ان کے اتہامات کی تردید کر دی ہے۔

جو الزام یورپ کے متعصب پادریوں اور سرگرم وقائع نگاروں نے اسلام اور داعی اسلام پر لگائے ہیں، آج ان کی تحقیق پر پتہ چل گیا کہ یہ الزام خود ہماری روسیاہی کا باعث ہیں۔[3]

۱- وحی محمدی از سید رشید رضا مترجم عبدالرزاق ص ۱۶

۲- " " " " ص ۱۷

۳ بین وز اینڈ بیروز شپ ص ۶

پنڈت دیانند کے متعلق گاندھی جی نے تحریر کیا ہے کہ:

"انھوں نے جین دھرم، اسلام اور مسیحیت اور خود ہندو دھرم کے متعلق بہت سی غلط بیانیاں کی ہیں۔"[۱]

پنڈت ستیہ کیشو پرشاد پروفیسر تاریخ گرو کل کانگڑی لکھتے ہیں:

بے شک دیگر مذاہب کی تردید کرنے میں سوامی جی نے ناانصافی کی ہے اور صحیح ترجمہ و مفہوم کو بگاڑ دیا ہے۔"[۲]

ایک دوسرے ہندو فاضل لکھتے ہیں:

"بانیانِ مذاہب میں سے سب سے زیادہ ناانصافی ظلم اگر کسی پر کیا گیا ہے تو بانیٔ اسلام پر اور کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایک خونخوار اور بے رحم انسان دکھلایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلائی جائے اس کا بڑا سبب یہ ہوگا کہ محمدؐ کی لائف پر تنقید کرنے والوں نے اسلامی تاریخ اور بانیٔ اسلام کی سیرت کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد باتوں کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ اگر وہ اسلامی روایات کو سمجھ لیتے اور سچائی کے اظہار کے لئے اپنے اندر کوئی ہمت و جرأت پاتے تو یقیناً وہ اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے۔"[۳]

۱۔ غازیان ہند صـ ۱۵۸۔

۲۔ رسالہ بھارت متر ۱۹۲۶م

۳۔ رسالہ مولوی۔ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ؛ رسول نمبر صـ ۱۴۱

بہر حال جتنے بھی اعتراضات ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔ جس نے کوئی اعتراض کیا تو وہ صاف تعصب کی بنا پر۔ قرآن پاک کسی انسان کی لکھی ہوئی کتاب نہیں بلکہ منزل من اللہ جو نبی علیہ السلام پر بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آسمان دنیا پر سے نازل ہوتا رہا۔ خدا کے ساتھ قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن مغربی تعلیم نے ہمارے ذہنوں کو محسوسات کی چہار دیواری میں اس حد تک محبوس کر دیا ہے کہ مادہ سے زیادہ کسی اور دنیا پر ایمان بمشکل لاتے ہیں اسی وجہ سے قرآن پر اہل مغرب کے اعتراضات کی بنا صرف سائنس ہی کو سمجھا جاتا ہے جو کسی حد تک صحیح ہے۔ اس لئے کیوں نہ ہم قرآن پاک کی حقیقت کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھیں۔ پورے قرآن کا سائنسی تجربہ کرنے کے لئے ایک طویل مدت چاہئے۔ مگر پھر بھی مثال کے طور پر حیوانات کو لیجئے ان کی دنیا میں سب کام میکانکی طور پر ہوتا ہے، کھانا پانی کے بعد ان کی زندگی کے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ....

مگر انسان ان سے مختلف ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کا دائرۂ حیات کبھی بھی صرف کھانے پینے اور سونے تک محدود نہیں رہا۔ اگرچہ ابتدا میں انسان نیم حیوان ہی تھا مگر جیسے جیسے وہ ہوش سنبھالتا رہا اس کی دلی حالت بھی بدلتی رہی۔ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں رہ رہ کر کلبلاتے رہے۔ بنی نوع کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسان کسی نہ کسی لاینحل مسئلہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے اور انسان کے ان تمام سوالات کا جواب علم نے دیا اور خدا نے یہ علم انسانوں کو حیوانات سے جدا کرنے کے لئے دیا ہے مگر یہ علم صرف کسی چیز کی جانکاری کے لئے نہیں بلکہ ان کے ساتھ قوت فکر و تمیز بھی عطا کی۔ تجارب و مشاہدات

کے متعین اصولوں کی روشنی میں دنیا کی چیزوں سے کام لینا اور پھر ان کے نتائج کو آگے منتقل کرنا اسی قوت کا مرہون منت ہے۔ یہ علم الاشیاء ہم کو قرآن کے ذریعہ ہی ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْن[1]

سورج و چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

قرآن پاک نے چاند اور سورج کے بارے میں ہمیں علم عطا کیا اور خدا کی عطا کردہ یہ انسانی قوت فکر و تمیز ہے جس کے سہارے انسانی ذہن نے ایک عرصہ دراز تک اس (علم) پر غور و خوض کیا اور اس غور و فکر کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج انسان نے چاند پر قدم جما لئے ہیں۔ سائنس کچھ اور نہیں انسانی عقل و غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ ایک غیر ملکی محقق لکھتا ہے:

"سائنس کو اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے اس لئے اب اس میں فروتنی اور انکسار بھی آگیا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف) اب تو دنیائے سائنس کے مشاہیر اس امر پر مصر ہیں اور بڑی شدت سے مصر کہ جہاں تک ادراک حقیقت کا تعلق ہے سائنس صرف جزوی سا علم بہم پہونچا سکتی ہے۔"[2]

اسی بات کو قرآن پاک نے پہلے ہی فرما دیا ہے:

۱۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۳۔

۲۔

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ و لما یاتہم تاویلہ
کذالک کذب الذین من قبلہم فانظر کیف
کان عاقبۃ الظلمین [1]

لیکن پھر بھی کچھ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ یہ سب پہلی نظر میں تو عین عقل کے مطابق معلوم ہوتا ہے حالانکہ ان کا انحصار صرف جذبات پر ہوتا ہے۔ دنیا میں آجکل جتنا فتنہ وفساد برپا ہے محض اس لئے کہ ہر شخص اور ہر قوم اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو بے وقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کے سامنے تسکین جذبات ہی مقصد حیات ہوتا ہے وہ علم وعقل کا مالک ہونے کے باوجود فلاح وسعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے۔ اس کا علم اور اس کی عقل اس کی صحیح رہنمائی کرنے کے بجائے اس کی تکمیل خواہشات کے ذرائع پہونچاتا ہے اسی لئے قرآن کریم نے عقل وعلم کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ہی اس کی حقیقت کو بھی عیاں کیا ہے کہ جب عقل جذبات کے تابع ہو تو انسان سعادت کی راہ سے محروم ہوجاتا ہے:

أفرءیت من اتخذ الٰھہ ھواہ واضلہ اللہ علی علم وختم
علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ
من بعد اللہ افلا تذکرون ٥ [2]

۱- سورۂ یونس آیت ۳۹-

۲- سورہ جاثیہ

اس طرح ان لوگوں کا علم جو تکمیل خواہشات کو ہی مقصد حیات سمجھتے ہیں، جذبات کی چہار دیواری میں ہی سمٹ کر رہ جاتا ہے اور وہ بات کی حقیقت تک نہیں پہونچ پاتے ان کی عقل انھیں حصول مقصد میں غلط راستہ پر بھٹکا دیتی ہے۔ مگر اپنی عقلمندی کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ وہ ٹھیک راہ پر گامزن ہے اگرچہ قرآن پاک نے خود عقل انسانی کے ساتھ ساتھ ادراک و فہم کو بھی مخاطب کیا ہے۔

سائنس عقل ہی کا دوسرا نام ہے مگر اس سائنس سے ادراک و فہم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علم و عقل کا سہارا لے کر سائنس والوں نے ایک چیز بنائی مگر اس کے اثرات و نتائج نہیں دیکھے سائنسی ایجادات کو دیکھ کر ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ علم و عقل آج کل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے مگر جب ان کے نتائج پر ہم غور کرتے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ انسان نے درندگی کی آخری حدود کو بھی چھو لیا ہے۔ ایک ساعت میں لاکھوں انسان خاک و خون کے جہنم میں دھکیلے جا سکتے ہیں۔ پوری بستی و پورا ملک اس طرح ویران و برباد کیے جا سکتے ہیں۔ کاش لم یکن شیئاً مذکورا۔ ہر ملک و قوم میں سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے تمام علم و عقل کے سرمایہ کے ساتھ اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہاتھ لگ جائے جس سے دوسرے ملک کے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جا سکے۔ مغربی ممالک اپنے نظام تمدن سے جس کی بنیاد عقل پر تھی تنگ آکر اب ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جس سے لوگوں کو روحانی تسکین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ان ممالک میں ہر طرف سے اپنے کلچر اور اپنی سیاست کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے اور جگہ جگہ سدھار کمیٹیاں بن رہی ہیں۔ وقت کی تیز آندھی نے انھیں لوگوں کے سامنے جو ہر چیز کو عقل کے ترازو پر پرکھتے

ہیں۔ اس نا فراموش حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ تنہا عقل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی اسی لئے صرف عقل کی بنیاد پر قائم کیا ہوا نظام کبھی بھی انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اور انسان اس کے خلاف کبھی نہ کبھی ضرور بغاوت کرے گا۔ عقل کی بنیاد پر قائم کردہ نظام حیات میں انسان مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جوڈ کا بیان ہے:

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی روحانی مردنی کو کیسے بدلیں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے کچھ زیادہ اس کی امید نہیں نظر آتی اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ نا امید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئے اخلاقی قدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔[1]"

مغربی فلاسفر پیکال لکھتا ہے:

"خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی وروحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العین سے دستکش ہو جائے تو اسے برے راستے خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے، بے راہ روی ختم ہو جائے

۱۔ معارف القرآن از غلام احمد پرویز (جلد دوم) ۲۰۸ ۔ ۲۰۹

اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطوں کی کشش وہ زندگی موت سے بدتر ہے۔[1]

صرف یہی دلائل نہیں بلکہ اب مغرب کے تمام مفکرین کشاں کشاں اس مقام کی طرف بڑھے آرہے ہیں جس کی طرف قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی رہنمائی کی تھی۔ اس طرح یہ ثابت ہے کہ قرآن پاک کی تمام باتیں حرف بحرف صحیح و درست ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرتے مگر وہ دن دور نہیں جب ایسی ہی ذہنیت کے لوگ بھی اس حقیقت کو جھٹلانے میں عار سمجھیں گے۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو علم انسانی کو بلندی کی انتہا تک پہونچاتا ہے جس کے بارے میں اللہ پاک نے خود اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

قال ربنا الذی اعطیٰ کل شیئ خلقہ ثم هدیٰ[2]

پروفیسر سی۔ ایل۔ مارگن نے بھی اپنے مقالہ بعنوان "ارتقاء نفس" میں خدا تعالیٰ کی قوت تخلیق و تہدیہ کا تذکرہ کیا ہے۔[3]

اللہ پاک دوسری جگہ فرماتا ہے:

۱۔ معارف القرآن از غلام احمد پرویز (جلد دوم) ۲۰۸ – ۲۰۹

۲۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۵۰

Creative and Directive power of God ۳

الذی خلق فسوّی ○ والذی قدّر فہدیٰ ○ [۱]

ایک دوسری آیت کریمہ ہے:

الذی خلقنی فہو یہدین ○ [۲]

اس طرح مارگن کے الفاظ صحیح طور پر قرآن کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن علم انسانی کو کتنی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اگر زمانۂ قدیم میں مذہبی محققین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان کی راہیں زیادہ آسان ہوتیں، انھیں ہزاروں سال غلط راستے پر نہ بھٹکنا پڑتا بلکہ ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھتا۔ بہر حال اسی طرح دھیرے دھیرے یہ لوگ اپنے آپ قرآن کے آسمانی ہونے کا ثبوت پا جائیں گے مگر اس کے لئے انھیں صدیوں اندھیرے میں بھٹکنا پڑے گا جیسے کہ ان کی عادت ہے کہ ایک طویل گمراہی کے بعد جو لوگ راہ راست پر آتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیائے سائنس میں اگر آج کوئی نیا قدم اٹھتا ہے تو کل کی مزید تحقیقات اسے غلط ثابت کر کے اس کی تردید کرتی ہے لیکن نبوت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ہر نبی کا تجربہ اور اس کا نتیجہ اساساً و اصولاً ایک ہوتا ہے ان میں کہیں کوئی اختلاف نہیں ہوتا حتیٰ کہ زمان و مکان کی دوری بھی اس پر کچھ اثر نہیں کرتی ہے اس لئے کہ قرآن خود شہادت دیتا ہے:

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراہیم واسماعیل واسحق ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایوب ویونس وھارون

۱۔ سورہ الاعلیٰ آیت ۲۔۳۔

۲۔ سورہ الشعراء آیت ۷۸۔

وسلیمٰن واٰتینا داؤد زبورًا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کرام ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتے آئے ہیں۔ ہر نبی اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کراتے آئے ہیں کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گذرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے۔ وحی ایک نبی کا بے نظیر تجربہ ہے۔ یہ وحی ہی ہے جس کے ذریعہ نبی ایک حد تک غیب کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور یہ حقیقت اس پر آشکارا ہو جاتی ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ اس علم اور ادراک کی حقیقت کو پہونچکر وہ پھر انسان کی طرف لوٹ آتا ہے اور تبلیغ و نصیحت کے دفتر کھول دیتا ہے مگر جب انسان اسے نہیں سمجھ پاتا تو اس سے منکر ہو جاتا ہے۔ مضراب کی چھیڑ سے تاروں سے نکلنے والے ارتعاش سے جو والہانہ کیفیات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اسے نہ تو ہم خود سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کو سمجھا سکتے ہیں مگر ہم اس کے وجود سے کبھی بھی انکار نہیں کرتے ۔ Huxley لکھتا ہے کہ:

"لیکن اگر تم کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے تو اس کا
مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔"[2]

یہ بالکل غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ وحی علم و عقل کی حریف نہیں جیسا کہ چند اعتراض کرنے والوں نے کہا ہے کہ قرآن سائنس کے بالکل خلاف ہے لیکن اہل مذہب کو ان اعتراضات

۱۔ سورۃ النساء آیت ۱۶۳۔

2. Religion without Revelation Julian Huxley P. 6

سے گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سائنس ادراک حقیقت کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے جبکہ وحی کامل و مکمل اور مذہب کسی ایک شعبۂ زندگی کا نام نہیں ہے۔ نہ تو خالی خیال ہے نہ ہی خالی احساس و عمل، بلکہ تمام عالم انسانیت کا ترجمان ہے۔ عقل کا ایک محدود دائرہ تحقیق ہے جس کو اسے وحی سہارا ہی لینا پڑے گا جس سے اہل مغرب اور کچھ اہل مشرق بھی ابھی تک دامن چرائے ہوئے ہیں کیونکہ یہ لوگ مذہب کو علم و بصیرت کا دشمن تصور کرتے ہیں حالانکہ وہ ذرا گہری نظروں سے قرآنی آیات پر غور کریں تو وہ کبھی بھی مذہب کے متعلق ایسی غلط رائے نہ رکھتے۔ قرآن پاک کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآن کا تخاطب ہی عقل و دانش سے ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل و فہم سے کام نہیں لیتے۔

صم بکم عمی فھم لا یعقلون [1]

دوسری جگہ فرماتا ہے:

ان شر الدوات عند اللہ الصم البکم الذی لا یعقلون [2]

اس طرح کی آیات ہم قرآن میں جا بجا پاتے ہیں لیکن اہل مغرب کے ایک غلط تصور (قرآن علم و بصیرت کا حریف ہے) کی وجہ سے قرآن جیسی سراپا علم و بصیرت کی کتاب کو علم و عقل کے خلاف سمجھ لیا گیا ہے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور

۱۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۷۱۔

۲۔ الانفال آیت ۲۲۔

قرآن جیسی پاک و مقدس کتاب پر بہتان ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن سائنسی تحقیقات کی کتاب نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد تکمیل شرف انسانیت ہے جس کی ایک ایک بات عقل و بصیرت پر مبنی ہے۔ قرآن سرتا پا علم و حقیقت ہے اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل و برہان مانگتا ہے۔

قل هل عندکم من علمٍ فتخرجوه لنا ط ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون۔[1]

مگر یہ دلیل ایسی ہو جو ظنی اور قیاسی نہ ہو کر حق و یقین پر مبنی ہو کیونکہ اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔

وما لهم به من علم ان یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً ۰[2]

اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بلا یقین و علم کے کسی چیز کی پیروی نہ کرو۔

ولا تقف ما لیس لک به علم ط ان السمع و البصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولاً ۰[3]

قرآنی آیات کی کہاں تک مثال دی جائے خود قرآن پاک کے الفاظ سے ثابت ہے کہ قرآن نے علم و بصیرت پر کتنا زور دیا ہے لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے

۱۔ الانعام آیت ۱۴۸۔
۲۔ النجم آیت ۲۸۔
۳۔ بنی اسرائیل آیت ۳۶۔

بلکہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ثبوت ہیں کہ قرآن آسمانی کتاب ہے؟ قرآن نے تو اس زمانے میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت کے لئے مایۂ ناز سمجھا کرتی تھی جس کا اعتراف دنیا بھر کے دانشوروں نے کیا مگر عقل کا ایک دائرہ ہے جہاں وہ رک جائے تو اسی کو منزل آخر قرار دیتی ہے، اسی لئے قرآن نے عقل کے ساتھ ادراک وفہم اور تمیز کو بھی ہمارے سامنے زندگی کے اصول کی طرح رکھا ہے۔

(باقی)

عہد عباسی کے نامور مترجم حنین بن اسحٰق العبادی کے دستیاب طبی مخطوطات

از جناب حکیم سید محمد حسان نگرامی ، ذاکر نگر ، نئی دہلی

ابو زید حنین بن اسحٰق العبادی عرب قبیلہ بنی عباد کا فرزند تھا ۱۹۴ھ/۸۰۹ء میں مملکت عراق کے مقام حیرہ میں پیدا ہوا[1] ستر سال تک طبیب، مترجم اور مؤلف کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ طبی کتابوں کے ترجمہ میں اس قدر بلند مقام حاصل تھا کہ عباسی حکمرانوں کے قائم کردہ دار الترجمہ بیت الحکمت کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا اور ترجمہ کے میدان میں بیش بہا کارنامے انجام دے کر رئیس المترجمین قرار دیا گیا[2]۔ اخیر عمر تک تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا بالآخر ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء میں اس عظیم طبیب، مترجم اور مؤلف نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی[3]۔

اگرچہ حنین، مترجم، مصنف اور مؤلف تینوں حیثیتوں سے ایک نمایاں مقام کا مالک تھا لیکن مترجم کی حیثیت سے اسے زبردست شہرت اور فوقیت حاصل

ہے۔ حنین کو بحیثیت مترجم جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فارسی، عربی، یونانی اور سریانی زبانوں میں تبحر مہارت رکھتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی اس کی معلومات بہت گہری تھیں۔ عام طور سے اس سے قبل کے ترجمہ نگار باضابطہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی ترجمہ نگار کا لسانیاتی پہلو مستحکم ہوتا تو وہ فن کے طبی نکات سے بھرپور واقفیت نہ رکھتا اور اگر کوئی فنی نقطۂ سے مکمل ہوتا تو اس کے اظہار و ابلاغ کا لسانی پہلو پوچ ہوتا، اس کے برخلاف حنین بن اسحٰق نے لسانی اور فنی دونوں تعلیم پائی تھی، جن کو وہ اپنے ترجمہ میں برت کر شہرت کے آسمان پہ پہونچ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف افلاطون، ارسطو اور ایٹولیس کی کتابوں کے ترجمے کئے بلکہ طبی سائنس کے تین اہم ترین مصنف بقراط، جالینوس اور دیسقوریدوس کی اکثر کتابوں کے تراجم کئے جو براہ راست طب یونانی اور طب عربی دونوں کے لئے بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اگر حنین نے ان تراجم کے ذریعہ علوم کا احیاء نہ کیا ہوتا تو مشرق میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اتنی تن دہی اور سیر حاصل طریقہ پر حصہ لیتا۔ حنین کے ساتھ ایک پورا گروہ ترجمہ کے کام میں مصروف تھا۔ المتوکل نے اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر ترجمہ کے کام پر مامور کر کے اصطفن بن بسیل، موسیٰ بن خالد اور یحییٰ بن ہارون جیسے مشہور علماء کو اس کے ساتھ کر دیا تھا، یہ علماء جب کام کر کے لاتے تو حنین ناقدانہ نظر سے تمام تفاصیل کو دیکھتا تھا۔

حنین ترجمہ اور تالیف دونوں ملا کر ۱۳۵ اہم کتابوں کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ جن میں ۶۰ ترجمے، جن میں جالینوس کی ۳۹، بقراط کی ۸، ارسطو کی ۷، افلاطون کی ۲، فنلس الاجانیطی کی ۲، اریباسوس کی ۴ اور جو رجیس اور دلیسقوریدوس کی ایک ایک کتاب شامل ہے۔

پیش نظر مضمون میں دنیا کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب حنین بن اسحٰق کے طبی مخطوطات کی تفصیل بھی درج کی جارہی ہے جو تصنیفی اور تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیئے بے حد ضروری ہے۔

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں طبی مخطوطات

پیش نظر فہرست میں حنین بن اسحٰق کے ۵۰ سے زائد طبی مخطوطات، کی تفصیل درج کی جارہی ہے۔ افسوس کہ صرف ۱۰ مخطوطات ہندوستان کی لائبریریوں میں دستیاب ہیں باقی دنیا کی مختلف لائبریریوں کی زینت ہیں ان میں سے بعض اتنے اہم ہیں جن کے مطالعہ سے بقراط اور جالینوس کی بنیادی طب کا ایک بار پھر سائنٹفک جائزہ لینے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ بعض مخطوطات امراض چشم اور اخلاط کے موضوع پر ملتے ہیں جو بہرحال اخلاط کے متنازعہ بحث پر بڑی حد تک معاون ہوسکتے ہیں اور امراض چشم پر آج کی طبی دنیا اہم معلومات کا اضافہ کرسکتی ہے

۱۔ کتاب مسائل حنین : امراض چشم پر اہم ترین تصنیف ہے اس کا مخطوطہ برلین، قونیہ، میونخ، لیڈن کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

۲۔ کتاب ترکیب العین : اس کا مخطوطہ فرائینہ، برٹش میوزیم، لیڈن اور دارالکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۳۔ کتاب العین : اس کا مخطوطہ تیموریہ، لینن گراڈ اور دارالکتب مصریہ کے ذخیروں میں شامل ہے۔

۴۔ کلام جمعہ حنین بن اسحٰق لارسطوطالیس : مخطوطہ دارالکتب مصریہ اور حلب کی خیاط لائبریری کی زینت ہے۔

۵۔ کتاب الاغذیہ : اس کا مخطوطہ خدابخش پٹنہ میں دستیاب ہے۔

۶۔ رسالۃ فی تدبیر الصحۃ : اس کا مخطوطہ طہران کے سنا، اور حلب کے مکتبہ حکیم کی زینت ہے۔

۷۔ کتاب الفوائد فی تنویع الفوائد : اس کا مخطوطہ آصفیہ حیدرآباد اور خدابخش پٹنہ میں محفوظ ہے[9]۔

۸۔ معانی استخرجہا حنین من کتب البقراط وجالینوس : البعول؛ مخطوطہ طہران کے مکتبہ ملی میں دستیاب ہے۔

۹۔ کتاب الکرمہ : اس کے مخطوطات ایا صوفیہ، احمد ثالث، تیموریہ اور دار الکتب مصریہ کے ذخیرے میں شامل ہیں۔

۱۰۔ اختصار کتاب جالینوس فی الادویۃ المفردۃ : احمد ثالث، سرای استانبول اور نور عثمانیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۱۱۔ کتاب اختلاف الاعضاء لجالینوس : مخطوطہ استانبول میں دستیاب ہے۔

۱۲۔ کتاب ترکیب الادویۃ لجالینوس : اس کا مخطوطہ پیرس، احمد ثالث اور اسکوریال کے کتب خانوں کی زینت ہے۔

۱۳۔ اساس الطب : مخطوطات رضا رام پور، نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ اور آصفیہ حیدرآباد میں دستیاب ہیں۔

۱۴۔ کتاب الاخلاط لابقراط : بیروت کے قدیس یوسف کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۵۔ تفسیر جالینوس لکتاب الفصول البقراط فاتیکان؛ رضا رام پور، شتانیشتاپور کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۱۶۔ کتاب النبض للمتعلمین : جاریت اور مجلس طہران کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۷- جوامع مقالات جالینوس فی التدبیر الملطف : اباصوفیا میں محفوظ ہے۔

۱۸- کتاب الاعضاء الآلمہ لجالینوس : اس کا مخطوطہ دار الکتب مصریہ تیموریہ، اسکوریال میونخ اور اڈنبرہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۱۹- کتاب فی علامات البحران اجالینوس : استانبول کے جار اللہ کتب خانہ کی زینت ہے۔

۲۰- کتاب لشفاء الامراض جار اللہ یہ رضا رام پور، اباصوفیا اور مجلس طہران میں اس کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

۲۱- کتاب ترکیب الادویۃ بحسب المواضع الآلمۃ : اس کا مخطوطہ استانبول اور احمد ثالث کی لائبریری میں دستیاب ہے۔

۲۲- ثمار تفسیر جالینوس لکتاب ابقراط فی تدبیر الامراض الحادۃ اباصوفیا میں موجود ہے

۲۳- ثمار کتاب ابقراط فی المولودین لثمانیۃ اشھر : میونخ، پیرس اور اسکوریال کے ذخیرہ کی زینت ہے۔

۲۴- جوامع الاسکندرانیین الستۃ عشر لکتب جالینوس : مخطوطہ رضا رام پور اور اناضول کی منیسا لائبریری میں دستیاب ہے۔

۲۵- مقالۃ فی الدغدغۃ : اباصوفیا اور مجلس طہران کی زینت ہے

۲۶- کتاب ثبت الکتب التی لم یذکرھا جالینوس فی فہرست کتبہ : اباصوفیا میں دستیاب ہے۔

۲۷- کتاب قوی الاغذیہ : نور عثمانیہ کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۲۸- کتاب فرق الطب لجالینوس : جاریت طہران میں دستیاب ہے۔

۲۹۔ جوامع جالینوس فی اسراء النساء : مکتبہ دانشگاہ طہران کی زینت ہے

۳۰۔ کتاب تقدمۃ المعرفۃ : اس کا مخطوطہ پیرس ، اباصوفیا، بلدیہ اسکندریہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۳۱۔ تفسیر کتاب الابیذیمیا لجالینوس : برلین ، دمشق ، آصفیہ کے ذخیرہ میں شامل ہے[۱]

۳۲ ابدال الادویۃ المفردۃ : مخطوطہ اباصوفیا میں محفوظ ہے۔

۳۳۔ آلات الغذاء : اس کا مخطوطہ مکتبہ ملی اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں شامل ہے۔

۳۴۔ تحفۃ الاطباء و ذخیرۃ الاطباء : رباط میں محفوظ ہے۔

۳۵۔ کتاب الحمیات : حکیم حلب اور جار اللہ میں دستیاب ہے

۳۶۔ کتاب فی تدبیر المستقین
۳۷۔ کتاب تدبیر السوداویین
۳۸۔ مقالۃ فی الاجن
۳۹۔ مقالۃ فی الحمام
۴۰۔ مقالۃ فی تولد الحصاۃ
۴۱۔ مقالۃ فی دق النفاس
۴۲۔ مقالۃ فی قرص العود
۴۳۔ مقالۃ فی قرص البنفسج
۴۴۔ کتاب فی البقول

} ان ساری کتابوں کے مخطوطات حلب کے مکتبہ حکیم کی زینت ہیں۔

۴۵۔ کتاب اصلاح الجبن : مکتبہ قاہرہ میں دستیاب ہے۔
۴۶۔ معرفۃ قوۃ الابدان : آصفیہ اور حکیم حلب کے ذخیرہ میں شامل ہے۔
۴۷۔ دفع مضار الابدان : آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔
۴۸۔ کتاب التشریح الصغیر : حکیم سید ظل الرحمن علی گڑھ کے ذاتی کتب خانہ کی زینت ہے۔
۴۹۔ کتاب المزاج : یہ بھی حکیم صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں شامل ہے۔
۵۰۔ شرق الطب : طبیہ کالج قرولباغ دہلی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

مصادر

۱۔ طبقات ابن جلجل ص ۶۸
۲۔ عیون الانباء، ابن ابی اصیبعہ ص ۲۶۸
۳۔ مختصر التاریخ الطب العربی جلد اول ص ۴۴ کمال سامرائی
۴۔ اربیین میڈیسن، ای جی براؤن ص ۸۱
۵۔ بیت الحکمت کی طبی خدمات ــــ وسیم احمد اعظمی
۶۔ دی کیمبرج ہسٹری آف اسلام پی ایچ ہٹ ص ۸۶،
۷۔ ہسٹری آف پرشیا، الگڈ ص ۱۰۴
۸۔ تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی ص ۲۴۶
۹۔ ہندوستان کے کتاب خانوں میں غیر مطبوعہ طبی مخطوطات ص ۳۵
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۴ء

بغداد کی وجہِ تسمیہ

از جناب مقصود احمد صاحب لکچرار شعبہ عربی یونیورسٹی بڑودہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی بات یوں ہی مشہور ہوجاتی ہے اور آگے چل کر وہ سند یا کم از کم ایک رائے کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ بعینہٖ یہی صورت شہر بغداد کی وجہ تسمیہ سے متعلق پیش آئی۔ حمد اللہ قزوینی نے اپنی کتاب "نزہۃ القلوب" جو ۳۹/۱۳۳۹ء کی تصنیف ہے میں نوشیرواں کو بغداد کا بانی قرار دیا اور اس کو اس کے باغ داد (باغِ عادل) سے مشتق بتایا اور عام طور پر یہی مشہور ہوگیا۔ بعد کے مؤرخین نے اس خیال کی تائید کرکے اس کو مزید تقویت بخشی حتیٰ کہ علامہ شبلی جیسے بلند پایہ مؤرخ و محقق نے بھی اس کو تسلیم کرلیا چنانچہ "المامون" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"بغداد کی وجہ تسمیہ میں یہ روایت غالباً زیادہ اعتبار کے قابل ہے کہ اس کے قریب نوشیرواں کا ایک باغ تھا جہاں بیٹھ کر وہ مقدمات فیصل کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ باغِ داد یعنی انصاف کا باغ مشہور ہوگیا۔"

(جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۷ ص ۱۲۶)

ان کے علاوہ سید امیر علی[1] متوفی ۱۹۲۸ء و دیگر مورخین بھی اس سے متفق ہوگئے

---

[1] A Short History of the Saracens، لندن، ۱۹۶۱، ص ۲۱۵

مگر نہ تو نوشیرواں اس کا اصل بانی ہے اور نہ ہی اس کے نام نہاد باغ داد سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بغداد نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا۔ مرحوم پروفیسر عبدالستار صدیقی (۱۹۷۲ — ۱۸۸۵)، سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی، کے مطابق فردوسی نے شاہنامہ میں اس کا ذکر کوئی چار جگہ نوشیرواں سے پہلے کے بادشاہوں کے حال میں کیا ہے یہی نہیں بلکہ پروفیسر صاحب یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں، کہ فردوسی نے خود نوشیرواں کے حال میں بغداد کا نام ایک جگہ بھی نہیں لیا ہے اور نہ ہی کہیں یہ کہا ہے کہ نوشیرواں کسی باغ میں بیٹھ کر دادرسی کیا کرتا تھا۔ فردوسی کے علاوہ مؤرخین میں سے بھی کسی نے نوشیرواں کے حال میں کہیں بغداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار صدیقی کے مطابق "بغداد" باغ اور داد بمعنی باغ عدل سے نہیں بلکہ بغ بمعنی بت یا دیوتا اور داد بمعنی عطیہ سے مشتق ہے اور سنسکرت کے الفاظ "بھگوان" اور "بھگوت" وغیرہ کا پہلا جزو "بھگ" اور یہ بغ ایک ہی لفظ ہے[۱]۔ موصوف کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) "بغداد" بغ اور داد (بت کا عطیہ) سے مشتق ہے۔ عبدالعزیز دواد، الاصمعی، ابن قتیبہ، ابو عبداللہ محمد بن احمد الخوارزمی، الجوالیقی، یاقوت الحموی کے علاوہ فارسی و الوں نے بھی بغ کے معنی بت بتائے ہیں۔ بغ کی صورت اوستا میں بغ اور بگ اور میخی کتبوں میں بغ ہے۔ ایران میں لفظ بغ زردشتی مذہب سے پہلے موجود تھا اور اس زمانہ سے تعلق رکھتا تھا جب وہاں بت کی پرستش کی جاتی تھی[۲]۔

---

[۱] دیکھئے مقالات صدیقی حصہ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳، صفحات ۱۴۳ - ۱۴۷

[۲] ایضاً صفحات ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۲۔

(۲) بغداد کا نام زردشت کے زمانے سے پہلے کا ہے یعنی نوشیروان سے گیارہ بارہ سو برس پہلے کا۔[۱]

(۳) فردوسی نے اس کا ذکر کیخسرو، فریدون اور اردشیر بابکان کے حال میں کیا ہے جو شیروان سے پہلے بادشاہ ہوئے ہیں۔[۲]

(۴) نوشیروان کے حال میں فردوسی نے اس کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[۳]

(۵) پہلوی اور سریانی ماخذوں میں بھی اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے کہ نوشیروان اپنے کسی باغ میں ہفتے کے ایک دن بیٹھ کر مظلوموں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ اول تو یہی مشتبہ ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن ایک باغ میں بیٹھ کر دادرسی کیا کرتا تھا اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو وہ ایسا اپنی دارالحکومت مدائن (طیسفون) میں کرتا ہوگا۔[۴]

(۶) یہ بات عقل سے دور اور بہت دور ہے کہ دارالسلطنت مدائن کے آرام دہ محلوں کو چھوڑ کر وہ ہر ہفتے بغداد جاتا جو مدائن سے کوئی پچیس میل کی دوری پر واقع تھا۔ خود بھی اتنی مشقت اٹھاتا اور عدل خواہ مظلوموں اور مجبوروں کو بھی مصیبت میں ڈالتا۔ اس کے ڈر سے شاید بہت سے مظلوم نوشیروان کے عدل سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہوں۔[۵]

---

[۱] دیکھئے مقالات صدیقی حصہ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۳۔

[۲] ایضاً صفحات ۱۲۵ — ۱۲۶۔

[۳] ایضاً ص ۱۲۷۔

[۴] ایضاً صفحات ۱۲۹ — ۱۳۰۔

[۵] ایضاً صفحات ۱۳۰ — ۱۳۱

مندرجہ بالا دلائل و شواہد کی روشنی میں بغداد کو نوشیروان کے نام نہاد باغ داد کے مقابلے میں بغ اور داد (بت یا دیوتا کا عطیہ) سے مشتق ماننا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ اس کا نام بغداد کیونکر پڑا تو اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا انتہائی مشکل ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ خطہ زمین بغ نامی دیوتا کے کسی پجاری کو کسی بادشاہ سے بطور عطیہ ملا ہوگا اور اس پجاری نے ازراہ امتنان و تشکر اس کا نام اپنے دیوتا کے نام پر "بغداد" رکھ دیا ہوگا اور بعد میں یہ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

حوالہ کتب

۱۔ علامہ شبلی نعمانی، المامون، جلد دوم، اعظم گڈھ، ۱۹۵۷ء۔

۲۔ سید امیر علی، A Short History of the Saracens، مطبوعہ لندن، ۱۹۶۱ء۔

۳۔ عبدالستار صدیقی، مقالات صدیقی، حصہ اول، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم، شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

حضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس قائم کیا تھا جسے اکابر دیوبند کی سرپرستی حاصل تھی۔ آزادی کے بعد مولانا خیر محمد صاحب ملتان تشریف لے آئے اور یہاں انھوں نے از سرِ نو خیر المدارس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے کا شمار ملتان کے اچھے مدارس میں ہوتا ہے۔ موصوف وفات کے بعد اپنے مدرسے ہی میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

مرقد مبارک

اُستاد العلماء مولانا خیر محمد جالندھری نور اللہ مرقدہٗ

بانی مدرسہ عربی خیر المدارس

خلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخِ وفات

۲۰ شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء

بروز پنجشنبہ بوقت چاشت در مدرسہ خیر المدارس

مادہ تاریخ
"منتقل خیر"

آقا بیدار بخت کا شمار نامور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے علوم شرقیہ کی بڑی خدمت کی ہے اور ہزاروں انسانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر کے ان کا مستقبل بنایا ہے۔ ان کا مزار گلبرگ کے قبرستان میں ریلوے لائن کے قریب ہے۔ آقا بیدار بخت کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آقا بیدار بخت

ماہر تعلیم، شاعر، ادیب، دانشور

بانیٔ دار العلوم السنۃ الشرقیہ لاہور

تاریخ پیدائش ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء

تاریخ وفات ۳۰ر اپریل ۱۹۸۱ء

میرے اللہ نے بھیجا مجھے پیغامِ قضا
نالۂ شب کا فلک بوس اثر ہو کے رہا
شان و شوکت سے گریزاں تھا ہمیشہ بیدار
آخر کار وہ خود خاک بسر ہو کے رہا

آقا بیدار بخت کی قبر سے تھوڑے ہی فاصلے پر جانب شمال مغرب، جناب جسٹس ایس اے رحمٰن کی آخری آرامگاہ سے جانب جنوب اندازاً ۳۰ میٹر کے فاصلے پر پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل اور مشہور انگریزی داں پروفیسر سراج الدین کی قبر ہے۔ ان کے لوح

مزار پر یہ مختصر سی عبارت کندہ ہے:

پروفیسر سراج الدین

ولد

میاں معراج الدین

پیدائش ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء

وفات ۲۸ر اگست ۱۹۸۶ء

مولانا سید حامد میاں رح کا انتقال ۳ر مارچ ۱۹۸۸ء کو ہوا موصوف مشہور عالم دین اور مورخ سید محمد میاں صاحب "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے فرزند اور مولانا حسین احمد مدنی رح کے خلیفۂ راشد تھے۔ ان کی قبر پر لوہے کا ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

آخری آرام گاہ

شیخ طریقت شیخ الحدیث

حضرت اقدس

مولانا سید حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

میاں صاحب کے مزار منور سے سات میٹر جانب جنوب مشہور شاعر سلامت جالندھری کی قبر ہے۔ راقم نے انھیں دیکھا ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

یا اللہ

یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شاعر ملت

الحاج سید سلامت علی شاہ سلامت جالندھری

مصنف تصویر انقلاب و درس حیات

تاریخ وفات ۲۷ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء

دل کے شیشہ تو ذرا چشم بصیرت سے تو دیکھ
ریزۂ خاک میں پوشیدہ ہیں لاکھوں گوہر

سلامت جالندھری

میں گذشتہ کئی برسوں سے نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے فرزند قطب صاحب کی قبر کی تلاش میں تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج مرزا غلام مجدد کے ساتھ ان کی قرابت داری ہے۔ میں نے ایک بار مرزا صاحب سے ان کی قبر کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ گاہے گاہے ان کی قبر پہ جاتے رہتے ہیں لیکن محل وقوع کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ اتنے بڑے قبرستان میں ان کی قبر تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ دو تین روز ہوئے میں اپنے ایک استاد کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مجھے اچانک ہی تکیہ کمہاراں میں قطب صاحب کی قبر مل گئی۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

یا اللہ یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا علی رضؓ

مرقد

مرزا غلام قطب الدین ابن سائل

تاریخ وفات ۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ
بمطابق ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

نواب سراج الدین احمد خاں سائل کا انتقال ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی میں ہوا اور وہ قطب صاحب کی درگاہ میں اپنی خاندانی ادوار میں دفن ہوئے۔ ان کی اہلیہ لاڈلی بیگم آزادی کے بعد لاہور چلی آئیں۔ قطب صاحب ان کے فرزند تھے۔ داغ دہلوی کی صلبی اولاد میں ایک بیٹا احمد نامی تھا جو ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ احمد کی وفات کے بعد داغ نے اپنی سالی کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا۔ ان کا عقد سائل سے ہوا۔ سائل کو داغ کی دامادی پر بڑا فخر تھا اور ان کے متعدد اشعار میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ لاڈلی بیگم اپنے فرزند قطب صاحب کی قبر کے سرہانے دفن ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے

۷۸۶

لاڈلی بیگم

دختر

نواب مرزا خان داغ

زوجہ

مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

تاریخ وفات

۲۵ ستمبر ۱۹۶۳ء

بقیہ طبی مخطوطات

۱۰۔ فہرس مخطوطات الطب الاسلامی فی مکتبات ترکیا
ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلی ۱۹۸۴ء

۱۱۔ علی گڑھ کے ذخیروں میں محفوظ غیر مطبوعہ طبی مخطوطات
حکیم سید ظل الرحمٰن صدر شعبہ علم الادویہ حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہمِ قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرایہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۱۰۲ | محرم الحرام ۱۴۰۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کے ہمراہ کئی اعلیٰ فوجی آ
۱۷ اگست کو بھاول پور کے قریب ایک فضائی حادثہ کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گئے۔
اناللہ وانا الیہ راجعون۔

پرواز کے چند لمحے کے بعد ہی طیارہ میں زبردست دھماکہ ہوا اور مرحوم کا صدا
طیارہ آناً فاناً ٹوٹ کر بکھر گیا۔ طیارہ کے تمام مسافر، امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافل، پاک
کے سربراہ جناب جنرل محمد ضیاء، پاکستان کے دو لفٹننٹ جنرل، تین میجر جنرل، پانچ بر
ایک کرنل، ایک اسکوڈران سمیت ۳۷ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

حادثہ کی وجوہات کیا ہیں؟ اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات جاری ہے اور اس سلسلے میں
نے پاکستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون اور سی، آئی، اے کے ذریعہ تحقیقات میں مدد
کی پیش کش کی ہے۔

اس بھیانک حادثہ اور بین الاقوامی سازش کے جو بھی ذمہ دار ہوں حقیقت
ہے کہ صدر ضیاء الحق اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

صدر ضیاء الحق مرحوم ۱۲ اگست ۱۹۲۴ء میں پنجاب کے مشہور شہر جالندھر
ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہرہ دون کے دون اسکول میں ابتدائی تع
کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لیا جہاں قبلہ جناب پروفیسر مولانا سعید
اکبر آبادی مرحوم سابق مدیر "برہان" سے بھی مرحوم صدر کو استفادہ کا موقع ملا او
اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل ضیاء حضرت اکبر آبادی سے تمام زندگی بے حد
متاثر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں دہرہ دون کی رائل ملٹری اکیڈمی سے فراغت کے بعد
فوج میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء تک وہ ایک جونیر افسر تھے جنرل ٹکا خاں

ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر بھٹو نے ان کو جنرل بنا دیا۔ ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء بھٹو کا تختہ الٹ کر خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد چیف ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں مرحوم باضابطہ پاکستان کے صدر بن گئے۔ ۱۹۸۴ء میں مرحوم نے ریفرنڈم کرایا جس کا نتیجہ ان کے حق میں نکلا، اس کے بعد انھوں نے پھر ملک کے منتخب سربراہ کی حیثیت سے صدر کے عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس دوران انھوں نے جو بھی اقدامات اٹھائے وہ اپنے ذہن وفکر کے اعتبار سے پاکستانی عوام کی فلاح وبہبودی کے لئے اٹھائے۔ بلاشرکتِ غیرے پاکستان کے سب سے بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے سیاست داں، ہوش مند قائد اور مدبّر ومنتظم بھی ہیں جنھوں نے اپنی انفرادیت، خودی اور تشخیص کو ہر حال میں قائم رکھا، اور جس کا اعتراف آج مرحوم کی وفات کے بعد ملکی، بین الاقوامی اور عالمی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

مرحوم کی شہادت کی وجوہات سے قطع نظر جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت اور عظمت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ بلاشبہ صدر پاکستان مرحوم برصغیر کی حالیہ سیاسی تاریخ کی اہم ترین شخصیات میں سے تھے۔ پاکستان اور پڑوسی ممالک کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کے لئے ان کی موت ایسا دردناک سانحہ ہے جس کے اثرات طویل مدت تک محسوس کئے جائیں گے۔

یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ ان کی موت کا حادثہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا اتنا ہی اہم موڑ ثابت ہو گا جتنا کہ گیارہ سال پیشتر ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرنا تھا۔ اندرونی وبیرونی مخالفت ومزاحمت اور پاکستان میں متحارب قوتوں کی اقتدار کے لئے رسّہ کشی اور سازشوں کے باوجود مرحوم صدر ایک طویل عرصے تک بڑی شان اور وقار کے ساتھ برسر اقتدار رہے، اور اس دوران مادی، انتظامی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان کے استحکام کے لئے زبردست

کوششیں کیں، اور اسے بین الاقوامی برادری میں ایک ممتاز اور منفرد مقام دلایا۔
صدر ضیاء نے پڑوسی ممالک خاص طور پر ہندوستان کے ساتھ برادرانہ
خیر سگالی کے تعلقات رفتہ رفتہ معمول پر لانے کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا سے
تعلقات اور روابط میں بھی صدر مرحوم نے مناسب، موزوں اور متوازی حکمت عملی
(STRATEGY) اپنائی تھی

وہ اگرچہ بعض توسیع پسند اور طاقت ور ملکوں کے لئے ہمیشہ ان کی راہ میں
ایک رکاوٹ رہے۔ ان ممالک کی اندرونی سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود
کامیابی اور استقلال کے ساتھ ملکی نظم ونسق سنبھالتے رہے۔ پاکستان کی
تاریخ میں اتنا طویل دور حکومت کسی اور حکمراں کو نصیب نہیں ہوا۔ اقتدار کی
اس طویل مدت میں ان کے کٹر سے کٹر سیاسی مخالفین بھی ان کی دیانت وامانت یا
ذاتی نوعیت کے کسی معاملہ میں ان کا نام کبھی ملوث نہیں کر سکے۔ اپنے قریب ترین عزیزو
اقارب اور دوستوں کو بے جا مراعات یا مالی منفعت پہونچائی ہو۔ جالندھر (پنجاب) میں
پیدا ہونے والے اس پیشہ ور سپاہی اور مجاہد کے لئے "پاکستان جغرافیائی وطن نہیں
بن سکتا تھا پاکستان مرحوم کے لئے ایک نظریاتی وطن تھا" مرحوم ضیاء کی ذاتی زندگی میں
اخلاص اور پاکیزگی اور عوامی زندگی میں فرض شناسی اور دیانت داری کا اعتراف دوست
دشمن سب کو رہا۔ یہ اسی "آئیڈیل ازم" کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کو ایک تاریخی وراثت،
ایک نظریہ، ایک فلاحی ریاست اور مثالی مملکت اور نظریات کی بنیاد پر قبول کیا جانے والا
وطن سمجھتے تھے۔

جنرل ضیاء مرحوم کے گیارہ سال پر محیط دور اقتدار کا تجزیہ فی الوقت ممکن نہیں
ہے۔ مرحوم نے ملک کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں جو مثبت، تعمیری اصلاحات
کیں، ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔
اسلام کو بحیثیت ایک نظام (SISTAM) اور پاکستان میں اسلامی شریعت کے

نفاذ اور اس ملک کو اسلام کا نمائندہ ملک بنانے میں جنرل ضیاء الحق ذاتی طور پر بڑے مخلص، اس کے پرجوش حامی اور داعی تھے اور اس تعلق سے وہاں جو کچھ بہتری نظر آرہی ہے وہ مرحوم کی ذاتی کوشش اور خواہش ہی کا نتیجہ ہے۔ نئی حکومت "اسلامی شریعت کے نفاذ" کے تعلق سے کیا پالیسی اپناتی ہے ابھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ صدر مرحوم کی ہلاکت کے پیش نظر فی الحال پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کی گئی ہے اور عام لوگوں کے بنیادی حقوق معطل اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔

اسی طرح مسلم ممالک سے روابط اور تعلقات میں صدر ضیاء کے دور میں قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ مسلم سربراہ کانفرنس میں صدر مرحوم نے خصوصی مقام حاصل کیا۔ وہ امن کمیٹی کے چیرمین (Chairmane) تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ مصر کو دوبارہ کانفرنس کا رکن بنانے کا ذریعہ بنے اور اس سے تعلقات استوار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامی سربراہ کانفرنس کے سکریٹری جنرل کے عہدے پر پاکستان کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ پاکستان غیر جانبدار تحریک کا رکن بنا۔ افغانستان کے مسئلہ کا باوقار اور پرامن حل اور وہاں سے روسی افواج کے انخلاء کے معاملہ میں بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری اور جرأت مندانہ موقف نے صدر مرحوم کو ایک یادگار اور بلند وقار عطا کیا۔ پاکستان نے ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین کو پناہ دے کر اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرکے جو عظیم انسانی کارنامہ انجام دیا ہے، اسے دنیا بھر میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اقوام متحدہ میں اس کی پیش کردہ قرار دادوں پر ۱۲۳ ممالک نے حمایت میں ووٹ ڈالے جو مسلم اور غیر مسلم دنیا اور متعدد اشتراکی ممالک کی جانب سے اظہار اعتماد کا ایک شاندار اور قابل فخر ریکارڈ ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آج کا پاکستان دنیا کی نظروں میں کل کے پاکستان سے بہت بلند مقام پر فائز ہے۔

پاکستان کے سیاسی افق سے صدر ضیاء کے اچانک غائب ہوجانے سے پاکستان کے سامنے کئی اہم ترین موڑ آگئے ہیں اور فی الحقیقت پاکستان مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہوگیا ہے۔ صدر ضیاء کی ہلاکت سے طاقتوں کا ہر توازن اثر انداز ہوا ہے۔ سیاست کی وہ ساری بساط الٹ گئی ہے۔

پاکستان کے تین پیشہ ور سپاہیوں کی ایک ساتھ موت، پاکستان ہی نہیں بلکہ مغربی ایشیا اور وسطِ ایشیا تک سیاست بدل گئی ہے۔ اب افغانستان، ایران، سعودی عرب، عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں سیاست کا رخ بدل سکتا ہے۔ مرنے والے کی نظر بڑی وسیع، ذہن بڑا دراک اور تعلقات بڑے وسیع تھے۔ ان کی سیاست، دانائی، تدبر، فراست اور معاملہ فہمی مسلمہ تھی۔۔۔۔۔۔

بہرحال مرحوم کی المناک فضائی حادثے میں شہادت سے ایک ایسے دور کا خاتمہ ہوگیا جسے مستقبل کا مورخ کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چونکہ صدر مرحوم ایک ہوائی حادثہ کا شکار ہو کر اللہ کے حضور پہونچے ہیں اور شریعت اسلامی کے اعتبار سے ایک مسلمان جب کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہو کر مرتا ہے تو اس کو "شہادت حکمی" کا عظیم مرتبہ ملتا ہے۔ اس معنی کر صدر ضیاء کی موت ایک شہید کی موت ہے اور روز محشر میں شہید سے کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ بارگاہ خداوندی میں ہم دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم اور ان کے رفقاء کو اعلیٰ علیین میں جگہ دیں ان کے درجات بلند فرمائیں، اپنے دیدار سے نوازیں۔ اور سوگوار خاندان، ہم سب کو اور پاکستانی عوام کو اس حادثہ جانکاہ کو برداشت کرنے کی توفیق و ہمت دیں۔

ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ پاکستان کے موجودہ حاکموں کو پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ حالات میں سدھار لانے کی توفیق دے اور پاکستانی قیادت اور باشعور عوام جلد از جلد اس خلا کو پُر کر سکیں جو صدر مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ دراصل ایک متحد، مضبوط، پائدار اور اندرونی اعتبار سے مستحکم پاکستان سے ہی ہندوستان اور برصغیر کے لوگوں کا وسیع تر مفاد وابستہ ہے!!!

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پہلی بار میں نے مفتی صاحب کو ۱۹۵۷ء میں دیکھا۔ اُن دنوں میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ ہمارے استاد ڈاکٹر حمید الدین مرحوم مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ کے تلمیذ الرشید تھے۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج میں اُن سے فارسی پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لاہور سے طلبہ کے ایک گروپ کو بھارت کے تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لائے تھے۔ دہلی میں ہمارے قیام کا مسئلہ تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ شاید ندوۃ المصنفین میں قیام کا خاطر خواہ انتظام ہو جائے۔ میں ڈاکٹر حمید الدین کے ساتھ مفتی صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ اس وقت تک میں ان کے نام اور مقام سے نا واقف تھا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ اتنے بڑے گروپ کے لئے دفتر برہان میں قیام کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ جامع مسجد کے علاقے میں ہنوز نازہ، تاج اور وکیل نام کے ہوٹل تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ مفتی صاحب سے مل کر ہم کوچہ رحمان پہنچے۔ وہاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ملے۔ انھوں نے بلی ماران میں پانامہ ہوٹل میں، جو نواب لوہارو کی حویلی میں قائم ہوا تھا، ہمارے قیام کا انتظام کرا دیا۔ اب یہ ہوٹل ختم ہو چکا ہے اور وہاں غالباً کوئی سکول

۱۹۵۵ء میں کلکتہ میں میری ملاقات مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ سے ہوئی اور خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ’برہان‘ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں آتا تھا۔ میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں انگلستان چلا گیا۔ وہاں سے چندہ بھیجنا آسان تھا اس لئے میں برہان کا باقاعدہ خریدار بن گیا۔ انگلستان کے قیام کے آخری زمانہ میں ریحانہ کے ساتھ میری نسبت طے پاگئی۔ نہ ہی مولانا اکبرآبادی مرحوم نے میرے والدین کو دیکھا تھا اور نہ ہی میرے والدین ان سے متعارف تھے۔ مولانا نے میرے توسط سے والد مرحوم کو خط لکھا، والد ماجد نے ہاں کر دی، یوں نسبت طے پاگئی۔ میں فروری ۱۹۶۷ء میں نو سال بعد وطن واپس آیا۔ مارچ کے اوائل میں والد مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ چلے جاؤ اور نکاح کر کے ریحانہ کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ میں لاہور سے کراچی گیا اور وہاں سے ۸؍مارچ کو جرمنی کی ایئرلائن لفتھانزا میں سیٹ ریزرو کروائی اور ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ سے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سوا پانچ بجے جنتا ایکسپریس ملے گی اس سے پہلے علی گڑھ جانے کے لئے کوئی ٹرین نہیں ہے۔ میں نے سامان کلوک روم میں جمع کروایا اور چاندنی چوک اور دریبہ سے گذرتا ہوا جامع مسجد پہنچ گیا۔ اردو بازار میں ان دنوں میرا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ میں کٹرہ نظام الملک میں داخل ہوا۔ ندوۃ المصنفین کے دروازے پر چق پڑی تھی۔ اس لئے میں اندر جانے سے ہچکچایا۔ میں دروازے پر کھڑا تھا کہ کسی راہگیر نے کہا "اندر چلے جائیے، یہاں مردانہ ہے۔" میں چق اٹھا کر اندر داخل ہوا، مفتی صاحب حسب معمول اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی اس لئے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں

چند قدم آگے بڑھا لیکن ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی اور میں چپکے سے واپس چلا آیا۔

شادی کے بعد میں اور ریحانہ علی گڈھ سے دہلی آئے۔ ریحانہ کا پاسپورٹ بنوانا تھا اور پھر پاکستان جانے کے لئے ویزا بھی حاصل کرنا تھا۔ مولانا اکبرآبادی مرحوم نے مفتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ انھیں کسی ہوٹل میں ٹھہرادیں، گھر میں نہ رکھیں۔ ہمارے دہلی پہنچنے سے پہلے مفتی صاحب نے جامع مسجد کے قریب ناز ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست کر دیا۔ ہمیں جو کمرہ ملا اس کی بالکنی جامع مسجد کے رخ تھی۔ مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنے گھر سے کئی چیزیں پہنچادیں تاکہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ جناب محمد احمد شمسی مرحوم دن میں دوتین بار اپنی بچی سلمیٰ کو ساتھ لے کر ہماری خیریت معلوم کرنے آتے۔ پانچ روز میں پاسپورٹ اور ویزا مل گئے۔ جب میں ہوٹل چھوڑنے سے پہلے کاؤنٹر پر بل ادا کرنے گیا تو منیجر صاحب نے بتایا کہ میرا بل ادا ہو چکا ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ میرا بل کس کرم فرمانے ادا کیا ہے؟ منیجر صاحب سے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے کہا "بس آپ جائیے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ ہوٹل کے مالک محمد حسین نے مفتی صاحب کے مہمان سمجھ کر بل لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب مفتی صاحب نے ان سے کہا کہ اگر کمرے کا کرایہ نہیں لیتے تو جو کچھ انھوں نے کھایا پیا ہے اس کا بل تو لے لیں۔ محمد حسین صاحب نے جواب دیا، "مفتی صاحب میں بل لے کر آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" یہ تھا مفتی صاحب کا احترام دلی میں۔

میرے پاس برٹش پوسٹل آرڈرز تھے۔ میں انھیں بھناتے کی غرض جی پی او لے گیا۔ متعلقہ کلرک نے کہا کہ انھیں کراس ہونا چاہیئے تھا اور اس پر کیش کروانے والے کا نام بھی لکھا ہونا چاہیئے تھا۔ میں وہاں سے مایوس ہو کر جامع مسجد کے ڈاکخانے گیا۔

وہاں جانے سے پہلے میں نے ان پر اپنا نام اور دہلی لکھ لیا تاکہ اب کوئی اعتراض نہ کر
متعلقہ کلرک نے کہا "ہم آپ کو نہیں جانتے۔ کسی ایسے شخص کو ساتھ لائیے جو ہمیں بھی جا
ہو اور آپ کو بھی۔" میں نے کہا "میں مسافر ہوں۔ میں ایسے شخص کو کہاں سے لاؤں جو
بھی جانتا ہو اور آپ کو بھی۔" اس پر وہ کہنے لگا "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" میں
نے کہا "دفتر برہان میں"۔ کلرک نے کہا کہ ان کے پیچھے مفتی صاحب سے تصدیق کرا
کہ آپ ہی اسلم ہیں۔ ہم ان کے دستخط پہچانتے ہیں۔ میں دفتر برہان آیا۔ مفتی صاح
نے تصدیق فرمائی اور وہ پوسٹل آرڈرز لے کر دوبارہ ڈاکخانے پہنچا۔ کلرک
مفتی صاحب کے دستخط دیکھ کر پوسٹل آرڈرز کیش کر دیئے۔

۱۱ مارچ کو میرا نکاح اتنی عجلت میں ہوا کہ مفتی صاحب اس میں شریک نہ ہو
۱۸ مارچ کو میں اور ریحانہ پاسپورٹ اور ویزا لے کر علی گڑھ پہنچے۔ ۱۹ مارچ کو مو
اکبر آبادی مرحوم نے استقبالیہ دیا۔ دہلی سے مفتی ضیاء الحق، اور مفتی صاحب تشر
لائے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے جن کا نام اب یاد نہیں رہا۔ اس تقریب
مفتی صاحب توجہ کا مرکز بنے رہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، آل احمد سرور، مولانا
امینی، قاضی مظہر الدین بلگرامی، نواب احمد سعید چھتاری، نواب عبید الرحمٰن خاں شر
ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر عبد العلیم اور علی گڑھ کے بہت سے اساتذہ اس تقریب میں ش
ہوئے۔ مفتی صاحب کے ان سب کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔ مفتی صاحب تقریب
اختتام پر علی گڑھ میں رکے نہیں اور مفتی ضیاء الحق کی کار میں واپس لوٹ گئے۔ بعد میں
نے بتایا کہ رات کو دس بجے کے قریب کار خراب ہو گئی۔ وہ علاقہ غیر محفوظ تھا۔ وہاں
کی آبادی ہے جو چوری چکاری اور لوٹ مار کے لئے بدنام ہیں۔ اس لئے جب تک کار درست
نہیں ہو گئی، خوف و ہراس طاری رہا۔ جب مفتی صاحب سے میری بے تکلفی ہو گئی تو
روز فرمانے لگے، "میاں! تمہارے ساتھ ریحانہ کے نکاح کے متعلق مولوی صاح

نے مجھ سے بھی مشورہ کیا تھا اور میرے ہی مشورہ پر انھوں نے تمہارے والد کو خط لکھا تھا۔ میرے والد مرحوم سے مفتی صاحب کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ جب مفتی صاحب پاکستان تشریف لائے تو ان کا انتقال ہوچکا تھا لیکن مولانا اکبر آبادی مرحوم کے خط کے جواب میں انھوں نے جو خط تحریر فرمایا تھا۔ وہ مولانا مرحوم نے مفتی صاحب کو دکھایا تھا۔ صرف اسی خط کی بنا پر مفتی صاحب تا زیست والد مرحوم کی شرافت اور علو ہمت کے معترف رہے۔

میں اگست ۱۹۶۹ء میں بھارت کا دورہ ختم کر کے لاہور جا رہا تھا۔ اس زمانے میں حسینی والا (فیروز پور) کا بارڈر کھلا تھا۔ ریحانہ اور زفر جس کی عمر اس وقت نو ماہ تھی۔ میرے ساتھ تھے۔ مفتی ضیاء الحق صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ شام کو کھانے پر بلایا۔ میں نے عرض کیا کہ نو بجے پنجاب میل نئی دہلی سے روانہ ہوتی ہے اس لئے آپ کھانا وانا نہ کھلایئے کیونکہ مجھے ہر صورت میں ساڑھے آٹھ بجے تک اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے۔ مفتی ضیاء الحق بھلا کب ماننے والے تھے۔ انھوں نے مفتی صاحب کو بھی مدعو کر لیا۔ کھانے کے بعد مفتی ضیاء الحق صاحب نے اپنی کار میں ہمیں بٹھایا اور ندوۃ المصنفین لے آئے۔ جلدی جلدی کار میں سامان رکھا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ اجمیری گیٹ کے قریب پہنچ کر کار خراب ہوگئی۔ مفتی ضیاء الحق کار درست کرانے لگے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے میں ۲۰ منٹ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اجازت دیں تو ہم ٹیکسی میں سوار ہو جائیں۔ موصوف بضد تھے کہ بس ابھی انجن درست ہو جاتا ہے۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ میں نے اگلے روز لازمی طور پر سرحد عبور کرنا تھی۔ اگر ٹرین چھوٹ جاتی تو میں مشکل میں پھنس جاتا۔ مفتی صاحب بضد تھے کہ بس ابھی انجن درست ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہم پانچ منٹ کم نو بجے اسٹیشن پر پہنچے۔ سامان قلیوں نے اٹھایا اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ریحانہ نے بھی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب نے زفر کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ مفتی ضیاء الحق پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنے چلے گئے۔

ہم جونہی اپنی بوگی کے قریب پہنچے گارڈ نے وسل دے کر ڈرائیور کو سبز رنگ کا سگنل دے دیا۔ ریحانہ جلدی جلدی ٹرین میں سوار ہوئی۔ مفتی صاحب نے ظفر اسے تھمایا۔ چلتی ٹرین میں قلیوں نے سامان رکھا اور میں نے انھیں مزدوری دی۔ تب کہیں میری جان میں جان آئی۔

اس شب مفتی صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ ظفر کو گود میں اٹھا کر پلیٹ فارم پر تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ رہے ہیں...

کئی سال بعد مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے۔ وہاں سے لاہور آنے کا پروگرام تھا۔ ان کا قیام سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ شام کو لاہور میونسپل کارپوریشن نے مندوبین کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ میں اور ظفر وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مندوبین تشریف لانے لگے۔ مفتی صاحب کار سے نکلے تو میں آگے بڑھا۔ ظفر بھاگ کر ان کے ساتھ لپٹ گیا۔ میں نے عرض کیا "حضرت یہ وہی بچہ ہے جسے آپ گود میں اٹھا کر نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر بھاگے تھے۔" فرمانے لگے "ماشاء اللہ اب توجوان ہو گیا ہے۔" میں استقبالیہ میں مدعو نہ تھا۔ انٹیلی جنس کے لوگ بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے ظفر کا بازو تھاما۔ اب ہمیں گیٹ پر روکنے والا کون تھا؟ ڈیڑھ گھنٹہ ہم مفتی صاحب کے ساتھ رہے۔

اگلے روز مفتی صاحب سرکاری گاڑی لے کر غریب خانے پر تشریف لائے۔ ریحانہ سے سے ایسے ملے جیسے اپنی بیٹی سے ملتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔ ریحانہ سے کہنے لگے "بھئی چائے وائے کے چکر میں نہ پڑو۔ ابھی ناشتہ کر کے سیدھا یہیں آرہا ہوں۔" پون گھنٹہ کے قریب قیام فرمایا، ہمارا گھر دیکھا، بہت خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ رخصت ہوتے وقت جیب سے کچھ رقم نکالی۔ ریحانہ نے کہا بھی کہ رہنے دیجئے۔

آپ کو ضرورت ہوگی۔ ہم تو دہلی آتے ہی رہتے ہیں، لیکن مفتی صاحب نے فرمایا، "بھئی بیٹی کا معاملہ ہے کیسے رہنے دوں۔" پھر بڑے اصرار کے ساتھ وہ رقم اُسے تھمادی۔

مفتی صاحب اپنے پرانے دوست کرنل خواجہ عبدالرشید سے ملنا چاہتے تھے۔ آزادی کے بعد ان سے ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ اس لئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں انھیں خواجہ صاحب کے ہاں لے گیا۔ تیس بتیس سال بعد پہلی بار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مفتی صاحب ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھے پرانی یادیں تازہ کرتے رہے ؎

عجب رنگینیاں باتوں میں کچھ ہوتی ہیں اے انشا

ہم جو بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں مولانا سعید احمد اکبر آبادی تغلق آباد میں قیام پذیر تھے۔ میں لاہور سے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ فلائنگ میل سے رات نو بجے نئی دہلی پہنچا۔ ہمارے ساتھ انڈین آرمی کے ایک میجر اور دہلی کے ایک بڑے تاجر اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے ان سے تغلق آباد کا محلِ وقوع پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ جگہ دہلی سے بہت دور ہے اور مناسب یہی ہے کہ ہم رات کو ٹیکسی میں سفر نہ کریں۔ رات کسی عزیز کے ہاں یا ہوٹل میں بسر کرلیں اور صبح کو تغلق آباد جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے جاننے والے تو دہلی میں بہت ہیں لیکن ہم بے وقت کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کسی ہوٹل میں رات گذارلیں گے۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے۔ سامان ایک تانگے پر لدوایا اور پہاڑ گنج کے پل کی طرف جاتے ہوئے ایک اچھا سا ہوٹل نظر آیا۔ ہم اس میں ٹھہر گئے۔ صبح ناشتہ کر کے میں نے اپنے بیٹے ظفر کو، جس کی عمر اس وقت سات سال تھی، اپنے ساتھ لیا اور اہلیہ سے کہا کہ میں مفتی صاحب سے ان کا پتہ معلوم کر کے ٹیکسی لے کر آتا ہوں اتنے میں بچیوں کو تیار کر لینا۔ ہم دونوں رکشا میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچے۔

مفتی صاحب اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں ظفر کو ساتھ لے کر آگے بڑھا اور سلام کر کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے دیکھا تو فوراً کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کے بعد ظفر کو پیار کیا۔ فرمانے لگے "کب آئے؟" میں نے عرض کیا کہ ابھی دہلی پہنچا ہوں۔ ریحانہ اور بچے نئی دہلی میں ہیں۔ آپ ایسا کیجے کہ کسی واقف کار ٹیکسی والے کو مولانا اکبرآبادیؒ کا پتہ سمجھا دیجے جو ہمیں بآسانی وہاں پہنچا دے۔ مفتی صاحب نے فرمایا "چائے نہیں پیو گے؟" میں نے عرض کیا ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ تغلق آباد پہنچنے کا ہے۔ مفتی صاحب میرے ساتھ باہر آئے۔ جامع مسجد کے باہر کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مفتی صاحب نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ تغلق آباد میں ہمدرد کا کمپلیکس جانتا ہے۔ میں ٹیکسی میں سوار ہو کر ہوٹل پہنچا اور بچوں کو ساتھ لے کر تغلق آباد پہنچ گیا، اسی اثنا میں مفتی صاحب نے مولانا اکبرآبادی کو فون پر ہمارے آنے کی اطلاع کر دی۔

میں نے ۲۶ روز تغلق آباد میں قیام کیا۔ اس زمانے میں وہاں اتنی ہما ہمی نہ تھی جتنی ان دنوں ہے۔ ایک گھنٹے بعد دہلی جانے والی بس وہاں سے گذرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں ناشتہ کر کے دہلی جانے کے لئے سڑک پر آیا۔ جب بس آئی تو دیکھا کہ اندر کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہیں ہے اور لوگ چھت پر سوار ہیں تو میں یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گیا کہ کل دیکھا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں تغلق آباد سے مہرولی چلا جاتا اور وہاں سے شہر کی جانب جانے والی بس مل جاتی۔ میں تغلق آباد سے شہر آتا تو پہلے مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ کچھ دیر وہاں رکتا اور پھر گھومنے نکل جاتا۔ دوپہر کو دفتر برہان آجاتا۔ حکیم ظفر احمد مرحوم بڑے دالان کا تالہ کھول دیتے اور میں وہاں سو جاتا۔ سہ پہر کے قریب سو کر اٹھتا اور نہا کر تازہ دم ہو جاتا۔ ظہر کی نماز بڑے دالان میں ادا کر کے اخبارات کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ عصر سے ذرا قبل مفتی صاحب بھی تشریف لے آتے۔ کبھی میں

ان کے اصرار پر چائے پی لیتا اور کبھی معذرت کر دیتا۔ موصوف کبھی چائے گھر سے منگوا لیتے اور کبھی فلورا ہوٹل میں آرڈر دے دیتے۔ عصر کی نماز میں مفتی صاحب کی اقتدا میں ادا کرتا۔ مرحوم میرے امام ہوتے اور میں ان کا واحد مقتدی۔ نماز کے بعد میں تغلق آباد چلا جاتا۔

انہی دنوں ایک روز میں ندوۃ المصنفین آیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ مفتی صاحب نے کھانے پر اصرار کیا۔ کھانا کھاتے کھاتے دیر ہو گئی۔ میں جامع مسجد میں نماز ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہاں نماز ذرا جلدی ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ مفتی صاحب نے میری پریشانی دیکھی تو فرمانے لگے: "فکر نہ کریں، میں نے بھی نماز جمعہ ادا کرنی ہے۔" ہم دونوں دفتر برہان سے نکلے اور مفتی صاحب مجھے مٹیا محل میں سے ہوتے ہوئے کریم ہوٹل کی طرف لے گئے۔ آگے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ مفتی صاحب کے مکان کے عقب میں ہونی چاہیے۔ مسجد کھچا کھچ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، ہمیں دیکھ کر نمازیوں نے ہمارے لئے جگہ بنا دی اور ہم نے اطمینان کے ساتھ نماز ادا کی۔

ایک روز میں حسب معمول دس بجے کے قریب ندوۃ المصنفین پہنچا۔ مفتی صاحب اپنی نشست پر تشریف فرما تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا تو فرمانے لگے "میاں! اچھے وقت پر آئے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے روسی سفارت خانہ سے دو دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔ ایک میرے نام آیا ہے اور دوسرا مولوی سعید (مفتی صاحب عام گفتگو میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے) کے نام یہ مولوی سعید کا دعوت نامہ لے لو۔ ان سے کہنا کہ امام بخاریؒ کا ہزارہ سالہ جشن ولادت منایا جا رہا ہے۔ جب اپنا مقالہ لکھو تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ میرے لئے بھی لکھ لینا۔" مفتی صاحب نے کئی موقعوں پر اپنے "کوتاہ قلم" ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مرحوم "کوتاہ قلم" نہ تھے۔

انھوں نے ندوۃ المصنفین کے ابتدائی دور میں ابن الجوزیؒ کی صید الخاطر کا اردو میں بڑا عمدہ ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اسی زمانے میں امام ابن تیمیہؒ کی الکلم الطیب مفتی صاحب نے اپنے تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کی۔ "منار صدا" کے عنوان سے ان کے جو مقالات ڈاکٹر عنوان چشتی نے مرتب کئے ہیں، ان کی زبان کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ہجوم کار نے انھیں "کوتاہ قلم" بنا دیا تھا۔

میں وہ دعوت نامہ جیب میں ڈال کر خانقاہ شاہ ابوالخیرؒ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں شیریں بھون کے مالک میاں تاج الدین سے ملاقات ہو گئی۔ ان کے بڑے بھائی میاں شجاع الدین لاہور میں قصر شیریں چلا رہے ہیں۔ میاں تاج الدین نے اس روز کسی کی فرمائش پر قلاقند بنائی تھی۔ اس زمانے میں دودھ کی مٹھائی بنانے کی ممانعت تھی۔ میاں صاحب نے مجھے نصف کلو کے قریب قلاقند بطور تحفہ دی۔ شام کو میں تغلق آباد پہنچا تو اس وقت مولانا اکبر آبادی مرحوم مطالعہ میں مگن تھے۔ میں نے ڈبہ کھول کر ان کے سامنے کیا۔ انھوں نے بغور قلاقند کو دیکھا اور ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ پھر حسب عادت اس کی بڑی تعریف کی۔ جب مولانا منہ میٹھا کر چکے تو میں نے دعوت نامہ پیش کیا۔ مرحوم بہت خوش ہوئے اور سب اہل خانہ کو جمع کر کے فرمانے لگے۔ "دیکھو یہ میاں اسلم کتنے قاعدے کے آدمی ہیں۔ پہلے میرا منہ میٹھا کرایا، پھر دعوت نامہ دیا۔ تم ہوتے تو یونہی منہ اٹھائے چلے آتے۔" چند لمحے سکوت کے بعد میں نے کہا کہ مفتی صاحب فرماتے تھے کہ جب اپنا مقالہ لکھیں تو پندرہ بیس منٹ کا مقالہ ان کے لئے بھی لکھ دیں۔ اس پر مولانا اینٹھ گئے اور فرمانے لگے "لو اور سنو! کانفرنس میں مفتی صاحب شرکت کریں اور مقالہ میں لکھوں۔ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے۔"

ایک روز میں تغلق آباد سے دہلی آیا تو مفتی صاحب نے فرمایا "میں آج شام

کے جہاز سے سری نگر جا رہا ہوں۔ شیخ محمد عبداللہ نے بلایا ہے۔ وہاں حضرت بل میں ایک مدرسہ ہے مدینۃ العلوم۔ اس کا معاینہ کر کے سفارشات مرتب کرنی ہیں۔ میاں یہ تو بہانہ ہے کشمیر بلانے کا۔ چلو گے؟" یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں بھی کبھی سری نگر جاؤں گا۔ حالانکہ میں ان دنوں برطانیہ کا شہری تھا اور میرے وہاں جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ چلئے۔ میں کل صبح دہلی سے روانہ ہو کر پرسوں شام تک سری نگر پہنچ جاؤں گا۔ آپ کا قیام کہاں ہوگا؟ فرمانے لگے "وہاں مدینۃ العلوم حضرت بل میں ہی قیام ہوگا۔ اس کے پرنسپل ہمارے دوست مولانا ابوالعرفان ندوی ہیں۔" میں اسی وقت تغلق آباد روانہ ہو گیا اور اہل خانہ کو بتا دیا کہ میں چند روز کے لئے حسب عادت سیاحت کے لئے نکل رہا ہوں اس بار پنجاب کی طرف جاؤں گا۔ شام کو میں نے اپنا سامان اٹھایا اور بس میں سوار ہو کر دفتر برہان پہنچ گیا۔ رات وہاں گذاری۔ صبح چھ بجے کے قریب ایک ٹرین پانی پت جاتی تھی۔ میں اس میں سوار ہو کر دس بجے کے قریب پانی پت پہنچ گیا سامان کلوک روم میں رکھ کر قلندر صاحب کی درگاہ دیکھنے گیا۔ بعد ازاں مولانا حالیؒ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت جلال الدین کبیرالاولیاء، ابراہیم لودھی اور حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے مزارات پر حاضری دی اور دوپہر کے وقت ایک پسنجر ٹرین میں سوار ہو کر شام تک انبالہ پہنچ گیا۔ نصف شب کے قریب کشمیر میل وہاں پہنچی۔ جالندھر تک تو اس میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔ جالندھر پہنچ کر ٹرین قریب قریب خالی ہو گئی اور مجھے سونے کے لئے برتھ مل گئی۔ صبح نو بجے میں جموں پہنچ گیا۔ وہاں سے بس میں سوار ہو کر رات کو عشاء کے وقت سری نگر پہنچ گیا۔ ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور وہ مجھے حضرت بل لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مفتی صاحب قریب ہی کشمیر یونیورسٹی کے صدر دروازے کے سامنے محکمہ اوقاف

کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اس وقت مولانا ابوالعرفان صاحب
ساتھ کسی کے ہاں ضیافت پر تشریف لے گئے ہیں۔ مفتی صاحب نے میرے آنے
اطلاع مدرسہ کے ذمہ داروں کو کردی تھی چنانچہ مجھے مہمان خانے پہنچا دیا گیا۔ جو
کے آخری دن تھے تاہم رات کے وقت سردی تھی اور پانی بھی کافی حد تک سرد
تھا۔ طلبہ نے مجھے چائے بنادی۔ میں چائے نوش کرکے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد
مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان بھی پہنچ گئے۔ مفتی صاحب مجھے وہاں دیکھ کر بہت
خوش ہوئے اور فرمانے لگے "اچھی گذرے گی۔" مولانا ابوالعرفان کے ساتھ میرا تعا
تعارف کرایا۔ میں نے عرض کیا کہ کل سے آپ کسی کے ساتھ میرا تعارف نہیں کرائیں
گے، میں خود اپنا تعارف کراؤں گا۔ سری نگر میں احتیاط ضروری ہے۔

اگلی صبح ناشتہ کے بعد لوگ ملاقات کے لئے آنے لگے۔ پہلے مفتی عبدالغنی صا
شعبۂ عربی، کشمیر یونیورسٹی تشریف لائے، پھر مولانا ابوالعرفان آگئے۔ تھوڑی دیر میں آ
والوں کا تانتا بندھ گیا۔ مفتی صاحب نے عبدالغنی صاحب سے کہا کہ راقم کو یونیورسٹی
دکھالائیں۔ موصوف مجھے یونیورسٹی لے گئے۔ شعبۂ کشمیریات میں پروفیسر سعید گیلانی سے
ملایا، پھر شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر محب الحسن سے ملاقات کرائی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار سے
بھی ملے۔ انھوں نے مجھے شعبۂ تاریخ میں ملازمت کی پیشکش بھی کی۔

شام کو مفتی صاحب، مولانا ابوالعرفان اور میں راجوری کدل میں جناب میر واعظ
محمد فاروق کے ہاں گئے۔ مفتی صاحب کے میر واعظ محمد یوسف مرحوم کے ساتھ دوستانہ
مراسم تھے۔ وہ آزادی کے بعد مظفر آباد چلے گئے اور آزاد کشمیر میں عہدۂ صدارت پر بھی فا
رہے۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صاحب کا سری نگر جانا نہیں ہوا تھا۔ مفتی صاحب
میر واعظ محمد فاروق کے ہاں ان کی تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ موصوف دیر تک
مرحوم کی خوبیاں بیان فرماتے رہے۔ اتنے میں سماوار میں کشمیری چائے آگئی۔ اہل کشم

عموماً نمکین چائے پیتے ہیں اور وہ چائے میں شکر ملانی بدعت بلکہ شرک گردانتے ہیں۔ اگر کوئی غیر کشمیری چائے میں ملانے کے لئے ان سے شکر مانگ لے تو یہ ایک طرح سے گالی سمجھی جاتی ہے۔ مفتی صاحب نمکین چائے پینے کے عادی نہ تھے اور اس رواج سے بھی ناواقف تھے۔ انھوں نے نمکین چائے کی ایک چسکی لے کر میری طرف دیکھا۔ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ میں نے میرواعظ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ کشمیری سے چائے میں ملانے کے لئے شکر طلب کرنا گالی دینے کے مترادف ہے لیکن مفتی صاحب نمکین چائے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ میرواعظ مسکرائے اور انھوں نے خادم کو اشارہ کیا اور وہ چینی لے آیا۔ پھر مولانا ابوالعرفان اور راقم نے بھی چائے میں چینی ڈالی۔

میرواعظ نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ان کے ساتھ گلمرگ چلیں۔ اگلے روز میرواعظ اور مفتی بشیر الدین صاحب دو کاریں لے کر پہنچ گئے۔ میرواعظ، مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان ایک کار میں سوار ہو گئے اور میں مفتی بشیر الدین صاحب کی کار میں بیٹھ گیا۔ ٹنگمرگ پہنچ کر ہم کچھ دیر کے لیے ریسٹ ہاؤس میں رکے۔ باہر لان میں کرسیاں لگادی گئیں۔ راقم نے بھی بات چیت میں حصہ لیا۔ میرواعظ فرمانے لگے "آپ تو بڑے کام کے آدمی ہیں، اب آپ ہماری کار میں بیٹھئے گا۔" مفتی صاحب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور میرے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ وہاں گالف کلب میں کھانے کا انتظام تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور نماز ظہر ادا کر کے واپس ہوئے۔

واپسی پر میرواعظ نے فرمایا کہ اگر ہم چاہیں تو ایک دن رات ان کے مہمان کی حیثیت سے ہاؤس بوٹ میں قیام کر لیں اور اگر وہاں نہ رہنا چاہیں تو چشمہ شاہی پر سجے سجائے بنگلے میں ایک دن رات گزار لیں۔ ہم نے ایک ہاؤس بوٹ دیکھا لیکن چشمہ شاہی

کے بنگلے میں رہنا پسند کیا۔ عصر کے بعد میر واعظ بھی تشریف لے آئے اور ہمیں چشمۂ شاہی پر لے گئے۔ اس چشمے کا پانی صحت کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے اور ہم وہاں جاکر بیٹھ گئے۔ ایک بیرا چشمے کا پانی صاف وشفاف گلاسوں میں لے آیا۔ وہ بار بار آتا اور کپڑے سے میز صاف کرجاتا۔ اس کی حرکات سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ جاسوس ہے۔ میر واعظ نے بھی اس کی تصدیق کی۔

مغرب کی نماز ہم نے بنگلے کے لان میں مفتی صاحب کی اقتدا میں ادا کی اور وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عشاء کے بعد میر واعظ کے گھر سے کھانا آگیا۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا اور دس بجے کے قریب میر واعظ تشریف لے گئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب میر واعظ دوبارہ تشریف لائے۔ ہم باہر لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بنگلے کا ملازم، جو جاسوس بھی تھا، بہانے بہانے سے ہمارے گرد منڈلاتا پھرتا تھا۔ میر واعظ اور مفتی صاحب سیاست کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے تو میں اور مولانا ابوالعرفان بہانہ کرکے دوسری جگہ جا بیٹھے۔

ایک روز شام کو صوفی نذیر احمد نے ہمیں بربرشاہ میں مسجد اہلحدیث میں مدعو کیا۔ ہم نے مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ اس کے بعد انھوں نے پیسٹری اور چائے سے ہماری تواضع کی۔ صوفی صاحب جتنی گھنی اور لمبی داڑھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بیٹھتے تو داڑھی بلا مبالغہ زمین کو چھوتی تھی۔ میں نے اجازت لے کر اسے ہاتھ لگایا تو مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا، "میاں اچھی طرح دیکھ لو پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" صوفی صاحب بھی مسکرا دیئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بل میں رسول اکرمؐ کا چھوٹا سا موئے مبارک موجود ہے اور خانیار شریف میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا موئے مبارک ایک چھوٹی سی شیشی میں ڈال کر رکھا ہوا ہے۔ صوفی صاحب کی ریش مقدس کا ایک بال بھی کسی مرتبان میں سنبھال کر رکھ لینا چاہیے۔ میری

بات سن کر دونوں حضرات مسکرا دیئے۔

اگلی صبح ہم مدرسہ نصرت العلوم دیکھنے گئے جسے میر واعظ چلا رہے ہیں۔ وہیں ہماری ملاقات مفتی عبدالکبیر مرحوم سے ہوئی۔ مفتی صاحب انھیں پرانی باتیں یاد دلا کر ہنساتے رہے اور خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ مفتی عبدالکبیر نے حضرت بل میں بنگلہ تعمیر کرایا تھا۔ انھوں نے وہاں آنے کی دعوت دی لیکن مفتی صاحب نے وقت کی کمی کا عذر کر کے معذرت طلب کی۔

ایک روز شیخ عبداللہ نے ہمیں دعوت دی کہ ہم ایک روز پہلگام ہو آئیں۔ ان کا ایک معتقد عبدالسلام دیوہ شیخ صاحب کی گاڑی لے کر آگیا۔ ہم صبح نو بجے کے قریب سری نگر سے چلے۔ راستے میں پانپور اور اونتی پور ہوتے ہوئے اسلام آباد (اننت ناگ) پہنچ گئے۔ وہاں داراشکوہ کا تعمیر کردہ تالاب دیکھ کر ہم اچھابل چلے گئے۔ وہاں دوپہر کے کھانے کا آرڈر دے کر ہم کوکر ناگ روانہ ہوئے۔ ہمارے لئے چشمے کے کنارے ایک چنار کے گھنے درخت کے نیچے کرسیاں لگا دی گئیں اور چشمے کا پانی پینے کے لئے پیش کیا گیا۔ تاحدّ نظر گلاب کی کیاریاں نظر آرہی تھیں۔ ہم کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ کوکر ناگ میں رک کر اچھابل چلے گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا تیار تھا۔ میرے اصرار پر ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی بجائے ہم نے ریسٹ ہاؤس کے لان میں ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانا تناول کیا اور اسی چشمے کے پانی سے وضو کر کے مفتی صاحب کی اقتدا میں نماز ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد ہم پہلگام کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں پام ویو ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ ایک کمرے میں مفتی صاحب نے ڈیرہ جمایا۔ دوسرے کمرے میں میں اور مولانا ابوالعرفان ٹھہر گئے۔ عبدالسلام اور ڈرائیور نے تیسرے کمرے میں اپنا سامان رکھ لیا۔

پہلگام کا موسم قدرے خنک تھا۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی ہم سو گئے۔ عصر سے تھوڑی

دیر پہلے بیدار ہوئے۔ وضو کر کے چائے نوش کی اور بازار کی طرف نکل گئے۔ بازار کے ایک طرف دریا بہتا تھا جسے لِدھرو کہتے تھے۔ دوسری جانب گنتی کی چند دکانیں تھیں۔ اس زمانے میں تیس پینتیس سے زائد نہ ہوں گی۔ امرناتھ جی کی یاترا کو جانے والے سادھو پہلگام پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دریا کے کنارے امرتسر کے تاجروں کی تعمیر کردہ مسجد تھی۔ عصر کی نماز ہم نے اس مسجد میں ادا کی۔ اتنے میں ڈرائیور گاڑی لے آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو کر امرناتھ جی جانے والی سڑک پر چھ سات میل گئے ہوں گے کہ آگے بارش کی وجہ سے سڑک خراب ہو چکی تھی، اس لئے واپس لوٹ آئے۔ مغرب کی نماز بھی اسی مسجد میں ادا کی۔ پھر ہوٹل کے لان آکر بیٹھ گئے۔ عشاء کی نماز مفتی صاحب کی اقتداء میں ادا کی اور کھانا کھا کر سو گئے۔ اگلے روز ناشتہ کر کے سری نگر روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب دریائے لِدھرو کا نام بھول جاتے تھے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ موصوف بار بار مجھ سے پوچھتے "کیوں بھئی! اس دریا کا بھلا کیا نام تھا؟" میں عرض کرتا "لِدھرو"۔ پھر خود بھی ایک دو بار یہ نام دہراتے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتے۔

اسی شام شیخ عبداللہ کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ موصوف نیڈو ہوٹل کے عقب میں ایک اینکسی میں رہتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہم ان کے ہاں پہنچے۔ ایک وسیع کمرے میں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ ہمیں وہاں بٹھایا گیا۔ چند منٹ بعد شیخ صاحب مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا اور کرتے کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی واسکٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کی تصاویر اور کارٹون بہت دیکھے تھے لیکن زندگی میں پہلی بار بالمشافہ ان سے اسی روز ملاقات ہوئی تھی۔ تصاویر کے برعکس ان کے چہرے پر بڑا بھولپن تھا۔ شیخ صاحب ہم سے ملے اور فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی۔ اتنے

میں انگلستان میں مقیم چند کشمیری نوجوان، جو آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے وہاں آگئے۔ ان کے آنے کے بعد کھانا شروع ہوا۔ شیخ صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ وازہ وان تیار کرایا تھا۔ ایک بڑی سینی میں اُبلے ہوئے چاول ہمارے سامنے رکھے گئے۔ مفتی صاحب اور مولانا ابوالعرفان آمنے سامنے بیٹھے۔ میں اور شیخ صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے۔ اکیس کورس کا وازہ وان تھا۔ جب وازہ ہمارے سامنے سالن لاکر ڈالتا تو شیخ صاحب اس سالن کا نام بتاتے۔ رات گیارہ بجے کے قریب یہ تقریب سعید و دلپذیر انجام پذیر ہوئی۔

اگلی صبح میں اور مفتی صاحب شاپنگ کے لئے بازار چلے گئے۔ عبدالسلام دیوہ نے ہمیں رعایتی نرخوں پر شالیں دلوادیں۔ شام کو مفتی بشیرالدین صاحب کے ہاں ہمیں وازہ وان کھلایا گیا۔ ایک روز مفتی صاحب کے کسی معتقد نے ایسا ہی پر تکلف کھانا ہمیں کھلایا۔ ایک رات رینہ واڑی میں متو خاندان میں شادی کی تقریب تھی، ہم بھی اس میں مدعو تھے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کشمیری رسم و رواج کا مشاہدہ کیا۔

ایک دن مولانا محمد سعید مسعودی ہمیں ملنے آئے۔ ان کی داڑھی بڑی طویل و عریض تھی۔ مفتی صاحب ان پر فقرے چست کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "حضرت! یہ کون بزرگ ہیں۔" مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "بزرگ وزرگ کچھ نہیں یہ محمد سعید مسعودی ہیں۔ کافی عرصہ تک لوک سبھا میں کشمیر کی نمائندگی کر چکے ہیں، یہ بزرگی تو اب انھوں نے اپنے اوپر طاری کی ہے۔" مولانا مسعودی بھی یہ فقرہ سن کر محظوظ ہوئے۔

قصہ کوتاہ ایک ہفتہ کشمیر میں قیام کر کے مفتی صاحب دہلی جانے کے ارادے سے رخت سفر باندھنے لگے۔ جانے سے قبل مدرسہ کے بارے میں

تجاویز لکھ کر شیخ صاحب کو بھجوانا تھیں، مجھ سے کہنے لگے، "میاں! یہ کاغذ اور قلم سنبھال لو۔ میں بولتا جاؤں گا، تم لکھتے جانا۔" مفتی صاحب نے رپورٹ لکھوائی۔ میں نے پڑھ کر سنائی۔ اس میں چند ترمیمات کیں اور مجھ سے فرمایا "اب اسے صاف کر کے لکھ دو۔" میں نے رپورٹ لکھ کر پیش کی۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور دستخط فرما دیئے۔ مفتی صاحب دہلی روانہ ہو گئے، میں مزید چند روز کے لئے سری نگر میں رک گیا۔ اب میں تھا اور مولانا ابوالعرفان۔ ہم نے جی بھر کر سری نگر اور اس کے مضافات کی سیر کی۔

(باقی)

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(۲)

ڈاکٹر محمد یوسف، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قرآن ہی وہ کتاب ہے جو ہم کو ہماری فطری جذبات، فطری قابلیت اور اچھی زندگی کے اصول کو اجاگر کر کے اس پر عمل کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن گم کردہ راہ انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے:

فی قلوبھم مرض[1] اور وحی خداوندی اس مرض کی دوا ہے۔ شفاء لما فی الصدور[2]۔ کہیں انہیں گمراہ لوگوں کے متعلق کہتا ہے علی قلوبھم اکنۃ[3] کہیں فرماتا ہے: ام علی قلوب اقفالھا[4]

دوسری جگہ ہے:

۱۔ البقرہ آیت ۱۰

۲۔ یونس آیت ۵۷

۳۔ بنی اسرائیل آیت ۴۶

۴۔ محمد آیت ۲۴

وعلی ابصارھم غشاوۃ[1]

ایک جگہ ہے:

فی اذانھم وقر[2]

پھر دلوں پر غلاف ڈالے یہ آنکھوں کے پردے اور کانوں کی ڈاٹیں ان
کی گمراہی کی وجہ بن جاتے ہیں۔

وھم فی غفلۃ معرضون[3]

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے بارے میں خود فرمایا ہے: ان ھذہ تذکرۃ[4]
تذکرہ کے معنی وہ چیز جو بھولی بات یاد دلائے جس طرح کوئی شخص بھولی ہوئی
بات کو یاد دلا کر کوئی نئی ..... نہیں بتاتا بلکہ اس بھولنے والے کے دماغ
چھپی ہوئی بات پرسے نسیان کا پردہ ہٹا دیتا ہے۔ اسی طرح وحی یا قرآن بھی سوئی
فطرت انسانی کو جگاتی ہے۔ اس طرح دین اسلام ایک فطری دین ہے اس میں کسی قسم
کوئی تنگی یا سختی نہیں ہے۔ صاحب وحی صرف وہی شخص ہوتا ہے جس کو اس ا
لئے خاص کر دیا ہو، اس میں کسب و ہنر کا بالکل دخل نہیں۔ ایک صاحب وحی اپ
فراست سے اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن خود اس کو (تنزیل)
سے تعبیر فرماتا ہے۔ قرآن پاک کو ہم شروع سے آخر تک دیکھیں تو ہر مقام پر یہی
کہ آیات قرآنی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

۱۔ البقرہ آیت ۷۔

۲۔ حٰم السجدہ آیت ۴۴۔

۳۔ الانبیاء آیت ۱۔

۴۔ المزمل آیت ۱۹۔

تنزیل العزیز الرحیم [1]۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تنزیل الکتب من اللہ العزیز الحکیم ۰ انا انزلنا الیک الکتاب بالحق [2]۔

اس پر کچھ لوگ یہ بے بنیاد شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شے اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہو تو قرآن نے خود ہی تمام شکوک کو رفع کر دیا۔

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ

مصدقا لما بین یدیہ وھدی وبشری للمومنین [3]۔

حضورؐ نے جو ایک امی تھے جب اہل مکہ کو قرآن پاک کے ذریعہ توحید کی دعوت دی تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ کلام تو ایک شاعر کا ہے، محمدؐ تو ایک جادوگر ہے، مجنوں ہے، کاہن ہے، غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ ایک مرتبہ تنگ آکر کفار مکہ نے سردار قوم عتبہ بن ربیعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اس نے کہا:

اے محمد صلعم تم نے اپنی قوم کو بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے تم نے ان کی جماعت کو پراگندہ کر رکھا ہے ان کی عقلوں کو ناکارہ بنا دیا ہے، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا ہے اور ان کے دین کی مذمت کی ہے۔

حضور صلعم نے فرمایا: اے ابوالولید! پھر تمہارا کیا مقصد ہے؟

۱۔ الزمر آیت ۱-۲، یٰسین آیت ۵۔

۲۔ الزمر آیت ۱-۲۔

۳۔ البقرہ ۔ آیت ۹۷۔

عتبہ نے کہا! اے محمدؐ تم نے جو ڈھونگ رچایا ہے اگر اس سے مقصد دولت حاصل کرنا ہے تو ہم تمہارے لئے دولت جمع کردیں۔ اگر عزت کی خواہش ہے تو ہم تمھیں اپنا سردار بنالیں اور اگر تم پر کوئی اوپری اثر ہے تو اس کا علاج کرادیں۔

آپ نے عتبہ کی بکواس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ سورۂ سجدہ کی کچھ آیتیں سنائیں جنھیں سن کر عتبہ کی عجب حالت ہوگئی اور وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ کفار کے اصرار پر اس نے کہا: اے قوم قریش تم میری بات مانو اور اس کے پیچھے نہ پڑو وا[illegible] اس کا یہ کلام بے اثر نہ ہوگا۔[1]

اس طرح نہ جانے کتنے موقعوں پر دین اسلام کے مخالفین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ قرآن ایک موثر کلام ہے یہ نہ تو کسی جادوگر کا جادو ہے اور نہ کسی کاہن کی کہانت۔ اب اسی ایک مندرجہ بالا قصہ پر غور کیجئے کہ اہل مکہ کے جملے خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر کسی کے اوپر کسی شئے کا اثر ہوگا تو کیا اس سے سوال کیا جائے گا کہ "آپ کا علاج کرادیں۔" ان کے اس جملے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھیں یقین تھا کہ محمدؐ برحق نبی ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں حقیقت ہے۔ مگر اگر اہل عرب اس حقیقت کو اتنی آسانی سے مان لیتے تو پھر ان کی ہٹ دھرمی اور ضد پر بٹہ نہ آجاتا۔ اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے اہل کفار نے عتبہ سے کہا: "ابو الولید معلوم ہوتا ہے تم پر بھی جادو ہے۔"[2]

اگر وحی کسب و ہنر سے حاصل کی جاتی تو رسول کے ماحول میں اور لوگ بھی ہوتے ہیں وہ ایسا کیوں نہیں کر پاتے اگر ایک شخص کسب و ہنر سے صاحب وحی

۱۔ نبی عربی (سجاد) ص ۱۴۰

۲۔ " " "

بن سکتا ہے تو دوسرے کے لئے اس کا امکان کیوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن وحی ایک اکتسابی نہ ہو کر ایک وہبی چیز ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ اس ماحول میں سے ایک برگزیدہ ہستی کو منتخب کرتا ہے۔

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا ومن الناس ط ان اللہ سمیع بصیرہ [1]

رسول جب وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے لوگ حیران ہو جاتے ہیں کیونکہ نزول وحی کے ساتھ پیغمبر کی باتیں غیر متوقع ہوتی ہیں اور وہ گھبرا کر غیر انسان سمجھنے لگتے ہیں جبکہ پیغمبر کی شخصیت بھی اللہ کے سامنے کوئی زیادہ اہم نہیں۔

ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا ہ [2]

خود حضور کی ذات پاک کو وحی سے پہلے علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان [3]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وماکنت تتلو من قبلہ من کتب وتخطہ بیمینک [4]۔

۱۔ المومنون آیت ۷۵۔

۲۔ بنی اسرائیل آیت ۸۶۔

۳۔ الزخرف آیت ۵۲۔

۴ العنکبوت آیت ۴۸

حد یہ ہے کہ اس کی توقع تک نہ تھی کہ کتاب نہ پڑھنے والا صاحب کتاب ہو جائے گا۔

وماکنت ترجو ان یلقی الیک الکتب الا رحمۃ من ربک[1]

تاریخ اور قرآن شاہد ہے کہ پیغمبر اسلام امی تھے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ محمد ﷺ کی تخلیق ہے۔ نہ جانے کتنے شعراء، مبلغ اور کاہنوں نے اپنے کلام کو قرآن کا مقابل بنا کر نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر دنیا نے اسے قبول نہیں کیا۔ آج تک کوئی بھی ایسا ثبوت مہیا نہ کر سکا کہ قرآن من جانب اللہ نہیں بلکہ انسانی کلام ہے حالانکہ اس سلسلے میں بڑی کوششیں کی گئیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے اس بات کو ہم ایک اور طرح سے سمجھا سکتے ہیں کہ جس طرح کسی چیز کا مالک اپنی چیز کی یا برتن بنانے والا اپنے برتنوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح اللہ پاک جو قرآن بلکہ ساری دنیا کا مالک ہے اپنے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے اور یہ وعدہ برحق ہے کہ آج چودہ سو سال سے بھی زیادہ مدت گزرنے پر بھی وہ ویسا ہی ہے جیسا تھا انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون[2]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصحاء عرب اور امراء نے قرآن کو مٹانے اسلام کو ختم کرنے کے لئے گالی گلوچ، مارپیٹ اور لالچ یعنی ہر طرح کی ناکام تدابیر کیں مگر جب صاحب قرآن نے للکارا کہ اگر یہ کلام یعنی قرآن منزل من اللہ نہیں ہے ایک انسانی کلام ہے تو تم سب مل کر ایک ہی سورہ بنا لاؤ، یہ سن کر سب خاموش ہو گئے کیونکہ ایسا ان کے لئے ناممکنات میں سے تھا۔ اللہ پاک نے اپنے کلام کی بنیاد

۱۔ القصص آیت ۸۶

۲۔ صارم، تاریخ القرآن ص ۱۵۵

اس شان پر رکھی ہے کہ کیا باعتبار عبارت کیا باعتبار معانی و مطالب تمام مخلوق اس کی مثال بنانے سے عاجز ہے۔ اس میں کسی انسانی کلام کا گذر نہیں۔ عام انسان تو عام ہے خود رسول کا اس میں ایک لفظ نہیں۔ جس جگہ بھی حدیث میں قرآن کا کوئی جملہ آگیا ہے وہاں دونوں کلام علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں جس حفاظت سے قرآن ہم تک پہونچا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ہے۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ایسی مقدس ہستی (محمدؐ) نے پیش کیا ہے کہ جس کے وجود سے کسی کو انکار نہیں اور جس کی مقدس زندگی ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے قرآن وہ کتاب ہے جس نے انتہا درجہ کے تاریک زمانہ میں نازل ہو کر دنیا میں ظاہری و باطنی روشنی پھیلائی اور علم و ادب، عدل اور تہذیب و تمدن کا علم بلند کیا۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کی شرح کے لئے صدہا علوم وجود میں آئے۔ Life of Mohammed کا مؤلف لکھتا ہے:

"دنیا میں آسمان کے نیچے قرآن کے علاوہ اور کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے جس کا متن ابتداء سے لے کر اس وقت تحریف سے پاک ہو۔"[1]

قرآن وہ کتاب ہے جو ایسی زبان میں ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور یہ زبان دنیا کی زبانوں میں سے سب سے زیادہ وسیع باقاعدہ اور خوبصورت ہے۔ قرآن خود صاف لفظوں میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے ہوں اور خدا کا کلام ہوں۔[2]

۱۔ صارم۔ تاریخ القرآن ص ۱۵۵

۲۔ البقرہ آیت ۲

دوسری آیت اس طرح ہے:

یآایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک [1]

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہے:

وھدی ورحمۃ للمؤمنین [2]

قرآن کے نزدیک ہر انسان برابر ہے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ نظام حیات میں انسان کی انفرادی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ انفرادیت اور اجتماعیت کو ایک دوسرے سے اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ باہمی تعاون وتناصر اور نظم و ضبط کی ایک بے مثال فضا بن جاتی ہے اور اس فضا میں ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا موقع ملتا ہے اور یہی انصاف کا تقاضا ہے اس میں کسی کی طرفداری مقصود نہیں ہوتی۔ قرآن انسانی تقسیم صرف کفر و ایمان پر کرتا ہے اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوتی بلکہ یہ تفریق اس طرح ہوتی ہے کہ قرآنی اصولوں کو ماننے والی ایک جماعت اور اس کے خلاف جانے والی دوسری جماعت ہوتی ہے۔ اس تفریق کی بنیاد صرف انداز فکر وعمل پر ہوتی ہے۔ مذہب اسلام نے اسی وحدت فکر وعمل کی بنیاد پر مساوات کی اتنی بلند عمارت کھڑی کی ہے کہ اہل مغرب اسے عیسائی مساوات سے بہت بلند مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم ڈی سیٹ ٹیلر کہتا ہے:

> "اسلام کی بڑی خوبی اس کی مساوات ہے۔ اسلام سے قبل کوئی یہ جانتا بھی نہ تھا کہ مساوات کیا ہے؟ مگر اسلام نے اللہ کی کل مخلوق کو خواہ وہ کسی رنگ و نسل کے ہوں اس کا معنوی کنبہ قرار دے کر

۱۔ المائدہ آیت ۶۷۔

۲۔ یونس آیت ۵۷۔

برابری عطا کر دی ہے اور یہ اسلام کا اتنا بڑا احسان ہے جسے
دنیا شاید کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔"

اسی حقیقت کا اعتراف Dr. Maude Royden نے اپنی کتاب
The Problem Palestine میں کیا ہے[۱]

تعجب تو اس بات کا ہے کہ یہ انقلابی نظام حیات اس زمانے میں پیش کیا گیا
جبکہ تمام دنیا میں تصورات زندگی بالکل اس کے برعکس تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس
وقت لوگوں نے اس نئے انقلاب کی ہر طرح مخالفت کی مگر اس مخالفت کا نتیجہ صفر
ہی رہا، بلکہ اب انسان ایک طویل مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اصول حیات
کی طرف آرہا ہے جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اب بھی کچھ لوگ عقل
کو رہبر مان کر زندگی کی راہوں پر چلتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد وہ خود ان اصولوں کے ہاتھوں
تنگ آکر انھیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں جس میں اسے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں لیکن
جب بھی انسان آگ و خون کے دریا میں سے ابھر کر نکلتا ہے تو خود بخود اس نظام
حیات کی طرف بڑھتا ہے جس کی کرن چھٹی صدی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمین
عرب میں پھوٹی تھی۔ ان تمام حقائق کو اگر سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا
کہ انسانیت غیر فطری طرز زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمانے کے بعد اور اسے
تاریک پانے کے بعد وحی یا قرآن کے چراغ کی طرف کھنچی آرہی ہے۔ کیا ان
تمام حقائق پر مبنی ثبوت مل جانے کے بعد وحی یا قرآن کے متعلق کسی اور دلیل کی
ضرورت ہے۔

چودہ سو سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا تھا کہ اس تعلیم فطرت

۱۔ معارف القرآن جلد دوم ص ۲۷ غلام احمد پرویز

اور دین فطرت کو اس لئے نہ جھٹلاؤ کہ یہ ابھی تمھاری سمجھ میں نہیں آتی (کیونکہ تمھاری آنکھوں اور دلوں پر جہالت کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں جو دھیرے دھیرے ہٹیں گے) یہ تو سرتا پا بصیرت وحکمت پر مبنی ہے۔ اسی لئے جوں جوں انسان کی عملی وعقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعوی کتنا سچا ہے مگر اس کے باوجود یورپ نے پورے طور پر قرآن کے نظام کو نہیں اپنایا ہے بلکہ کہیں کہیں سے مستعار لے لیا ہے۔ وحی کے متعلق طرح طرح کے سوالات ذہنوں میں اٹھ کر اب بھی انسان کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔ یہ سب ایمان کے فقدان کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے آج ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے۔ انسانوں کو ذہنی ودلی سکون میسر نہیں ہے۔ صحیح ونیک عمل کے لئے ایمان بہت ضروری ہے اور ایمان صرف اس چیز پر لایا جاتا ہے جو حق اور ہر اعتبار سے بلند ہو اور ایمان ہی کے صحیح وصادق ہونے پر مذہب کا صحیح وصادق ہونا موقوف ہے۔

وحی کے لغوی معنی اشارہ کرنا، پیغام دینا اور دل میں ڈال دینا وغیرہ ہے۔ لفظ استعمال کے لحاظ سے دیگر معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ حیوانات اپنی جبلی قوتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں قرآن میں اس کے لئے بھی لفظ وحی استعمال ہوا ہے مثلاً واوحی ربک الی النحل[1]۔ اسے وحی فطری کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کی دوسری کیفیات وجدانی ہوتی ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے متعلق ہے[2] ان اوحینا الی امک مایوحی[3]۔

۱۔ النحل آیت ۶۸۔

۲۔ معارف القرآن غلام احمد پرویز جلد ۲ ص ۲۸۳

۳۔ طٰہٰ آیت ۳۸

اس کے بعد وحی کی آخری شکل ہے جو بنی نوع انسان کے لئے بطور ضابطہ حیات ہے اور قانون زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیار کو عطا ہوئی۔ اور قرآن پاک اس وحی کا نام ہے۔ اس وحی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا میں انسان کو ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور آخر میں مکمل شکل میں قرآن کریم محفوظ ہوگیا اور ہمیشہ کے لئے انسانی رشد وہدایت کا نصاب بن گیا۔ وحی ہر رسول پر نازل ہوئی۔ انبیار کرام اسی وحی کے ذریعہ انسانوں کو ان کے اعمال کے انجام سے آگاہ فرماتے تھے، انسان کو جینے کا طریقہ بتاتے تھے۔ رسول کا کام صرف وحی کا پہونچانا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اس پر عمل کر کے ایک نمونہ بن کر دکھانا پڑتا تھا کیونکہ یہ مشہور مقولہ ہے کہ اپنے قول پر پہلے خود عمل پیرا ہو تب کسی کو اس کا سبق دو یہی بات اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی۔

واتبع مایوحیٰ الیک واصبر حتی یحکم اللہ ۔[1]

اگر کسی کتاب یا گروہ کی صداقت وبلندی کا اندازہ لگانا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ اس کے لکھنے والے بانی یا لیڈر کے کردار اور زندگی کو پرکھیں کیونکہ ہر چیز اپنی اصل پر ہے۔ اگر ہم کو قرآن کی صداقت کا پتہ لگانا ہے تو ہمیں اس کے لانے والے کی زندگی اور کردار کو ہر کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ رسول کی زندگی خود اس کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ اس کی تعلیم منزل من اللہ ہوتی ہے۔ جب رسول سے ان کی صداقت کی دلیل مانگی گئی تو آپ نے فرمایا کہ میں تم میں سے ایک انسان ہوں نہ کبھی کسی معلم سے پڑھا نہ کبھی کسی ادبی محفل میں شامل ہوا جیسے تم بخوبی جانتے ہو تو کیا یہ تمھارا جاننا

۱۔ هود آیت ۱۰۹

صداقت کا ثبوت نہیں کیا کوئی ان پڑھ اور ایسا شخص جو میرے جیسے حالات میں پیدا ہوا ہو اور تربیت پائی ہو قرآن جیسی کتاب پیش کرسکتا ہے۔ نبوت سے پہلے اور بعد کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ آپ نے کبھی کسی شخص سے جھوٹ مذاقاً بھی نہ بولا تو کیا آپ خدا اور اس کی وحی کے متعلق جھوٹ کہہ سکتے تھے ان باتوں پر اگر ہم دل سے غور کریں تو جواب نفی میں ملے گا۔ آپ کی صداقت کے آپ کے دشمن بھی معترف ہیں[1]۔ انھیں لوگوں کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

فانھم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایت اللہ یجحدون[2]۔ قرآن کو آپ اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ انھیں الفاظ میں پہونچا دیتے تھے جو قرآن کی طرف سے نازل ہوتے تھے حتی کہ لفظ قل بھی جیسے قل ھو اللہ احد۔ ہاں جب کبھی آپ اپنی گفتگو میں قرآنی باتوں کے ذریعہ تبلیغ کرتے تو لفظ قل نہ فرماتے بلکہ مقصد بیان کر دیتے جیسا کہ قیصر وغیرہ کے خطوط میں آپ نے فرمایا:

یا اھل الکتاب تعالوا حالانکہ آیت لفظ قل سے شروع ہوتی ہے[3]۔

خود قرآن پاک کے ذریعہ یہ ثابت ہے کہ قرآن محمدؐ کا کسب ہنر نہ تھا بلکہ خدا نے اس کے ذریعہ آپ کی تربیت کی اور علم سکھایا۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم[4]۔

۱۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۵۶ ۴۔

۲۔ الانعام آیت ۳۳۔

۳۔ رشید رضا، وحی محمدی ص ۵۶ ۴۔

۴۔ بنی اسرائیل آیت ۷۵۔

یہی قرآن آپ کی فروگذاشتوں کو درست کرتا تھا کبھی نرمی کے ساتھ .... تو کبھی سختی کے ساتھ قرآن میں خدا اپنے رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ان الاذقناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات ثم لاتجد لک نصیرا[1] اللہ نے اس آیت میں ایک عام انسان کی طرح اپنے رسول کو مخاطب کیا ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بھی انسان ہیں اور یہ جتلا دیا کہ ان سے بھی بھول ہو سکتی ہے۔ خدائے پاک قرآن میں جا بجا اپنے رسول کو اسی بات کی نصیحت کرتا ہے جس کی نصیحت لوگوں کو کرنے کے لئے چنا تھا۔

قرآن کو خدائی ہونے کے بارے میں ساری دنیا کو چیلنج دیا کہ فاتوا سورۃ من مثلہ چنانچہ ساری دنیا ہکا بکا رہ گئی۔ چنانچہ جب مشرکین نے حضورؐ سے اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لانے کا مطالبہ کیا تو خدا نے آپ کو حکم دیا۔

قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقائی نفسی ان اتبع الا مایوحی الی[2]

میں تم میں پورے چالیس برس سے جی رہا ہوں نہ علم میں نہ زبان میں تم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہوں پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنایا ہے اور جب چاہوں اسے بدل کر دوسرا قرآن پیش کر دوں[3]

۱۔ بنی اسرائیل آیت ۷۵۔

۲۔ یونس آیت ۱۵۔

۳۔ وحی محمدی رضا ص ۲۶۵

اس سلسلے میں ایک اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیوی حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی جس میں منافقوں کے ساتھ بعض مومنوں نے بھی یقین کر لیا تھا۔ یہ تہمت آپ کے لئے اب تک کی تمام تکالیف میں سب سے بڑی تھی۔ بہت دنوں تک وحی کا نزول بند رہا۔ پھر حضرت عائشہؓ کی برأت میں سورۂ برأت نازل ہوئی۔ اگر نزول وحی میں حضور کی ذاتی استعداد کو دخل ہوتا تو اس بڑی مصیبت میں وحی ہرگز اتنے روز بند نہ ہوتی۔ چنانچہ بہت پہلے ہی کوئی ایک آیت بنا کر (نعوذ باللہ) اپنے دل کو سکون بخشتے اور منافقوں کی زبان پر قفل لگا دیتے۔

یہ سچ ہے کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو اللہ نے ایک مخصوص طریقے سے اپنے رسول کو ادا کی۔ دنیا کے تمام دانشوران محمد صلعم جیسا کوئی دوسرا انسان پیدا نہ کر سکے اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ تو کیا ان کی یہ بے بسی اس دعوے کے لئے کافی نہیں؟ اس وحی کو جھٹلانے کے لئے مشرکین ومنکرین نے جو کچھ بھی کہا ہے ان میں سے بعض خود تاریخ پر تہمت ہے اور بقیہ باطل ہے۔ آج صدیاں گذر جانے کے بعد کسی یقینی دلیل سے اس کی بنائی ہوئی کسی خبر کی تردید وتکذیب نہیں ہو سکی مثلاً قرآن نے کائنات کے مادّے کو دخان کہا ہے جو سائنس کی اصطلاح میں ابتہد ہے اور فرمایا کہ آسمان وزمین دونوں رفقار تھے یعنی ایک ہی مادہ تھے جو باہم پیوست ومتصل تھا پھر خدا نے ہر ایک کو جدا جدا صورت دیدی اور ان میں جاندار پھیلا دیئے اور فرمایا کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا ہے اور یہ کہ خدا نے تمام نباتات وحیوانات کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔[1]

۱۔ وحی محمدی رشید رضا ص ۳۶۵۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآن پاک سے دی جا سکتی ہیں۔ قرآن نے اجتماعی زندگی کے مختلف قانون بھی بنا دیئے ہیں۔ قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں صرف اخلاق انسانی کی اصلاح کے لئے بہترین رہنمائی موجود نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف، انتظامی معاملات اور مالیات کے بارے میں قوانین موجود ہیں اور جس کی بنیاد خدمتِ خلق اور خدائے واحد کے یقین پر قائم کی گئی ہے۔

ہمارا ایمان ہونا چاہیئے بلکہ ہے کہ قرآن کتاب اللہ ہے، کلام اللہ ہے۔ یہ انسانی پیداوار نہیں، یہی تو کتاب ہے جس میں تمام بنو نوع کی رشد و ہدایت ہے۔ اس میں وہی حقائق بیان کئے گئے ہیں جن کے مصدقات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ قرآن کی پیش کردہ مساوات اور اخوت کسی ملک و قوم یا کسی رنگ و روپ کو نہیں دیکھتی۔ آج دنیا میں صرف قرآن ہی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے کہ وہ جس طرح جس زبان میں نازل ہوئی اسی میں محفوظ ہے۔ اس حیثیت کی کوئی کتاب آج دنیا میں موجود نہیں۔

اگر کسی کتاب کی قیمت کا اندازہ اس کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے یعنی اس بات سے کہ آدمی کے سوبھاؤ کے گہرے سے گہرے اور اچھے سے اچھے پہلوؤں پر کیا اثر پڑا تو ضروری ہے کہ قرآن کو دنیا کی عظیم سے عظیم کتب میں ایک منفرد درجہ دیا جائے۔[1]

فرانسیسی دانشوروں کے قرآن کے بارے میں الفاظ ہیں:

"It is therefore the first Arabic Prose work - one that

۱۔ سندر لال گپتا، گیتا اور قرآن۔ ۱۸۱-۱۸۲۔

raised The iction of That kaung to the eight of a civilized - white at the Same time its declamatery style Pronide a rhythm and an inspiration for the whole of Moslem life."[۱]

آرتھر جیفری کہتا ہے:

"The scripture of nother community, not even The old testament among The Jews, has had quite The same influence on the life of the comm ty as the Quran has had in Islam."[۲]

اس طرح اہل اسلام کے ساتھ ساتھ بعض غیر قوم کے دانشوروں نے بھی قرآن کو دوسری کتب آسمانی سے بڑا مانا ہے اور بالفاظ دیگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے مگر پھر بھی لوگ اس

۱- Dominique Sowdel Translated by Dunglass cott. Islam.

۲- The Quran as scripture. Arthur Jeffery

اس حقیقت کو جھٹلانے میں عار نہیں سمجھتے۔ حضورؐ کے زمانے میں اور آپ کے فوراً بعد بہت سے لوگوں نے قرآن کو جھٹلایا جن میں مسلیمہ اور متنبی وغیرہ کا نام مشہور ہے۔ ان لوگوں نے اپنی شاعری کے مجموعہ کو قرآن کا مثل بنا کر پیش کیا۔ لیکن زمانے نے اس کو قبول نہیں کیا۔ صرف انھیں پر کیا موقوف ہے شیطان نے تو قیامت تک اللہ سے مہلت مانگ رکھی ہے۔ ہر دور میں ایسے ولید اور مسلیمہ پیدا ہوتے رہیں گے جو قرآن کو اکتسابی ہنر بتا کر خود اس کے مدعی بن بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وحی نہ تو کسب و ہنر سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی انسانی قوت و فکر سے۔ یہ تو خالص وحی اور منزل من اللہ ہے۔ اللہ پاک خود فرماتا ہے:

یاایھا الذین آمنوا امنوا باللہ ورسولہ والکتب الذی نزل علی رسولہ۔[1]

۱- النساء- آیت ۳۷-
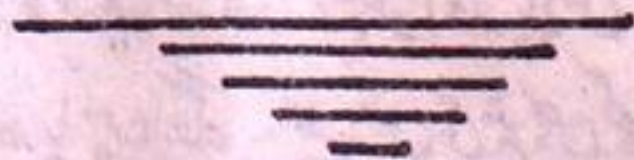
جامع مسجد رام پور

جناب محمد شعائر اللہ خاں صاحب، انگوری باغ رام پور

رام پور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

غالب

شہر مصطفیٰ آباد جو ریاست رام پور کے نام سے جانا جاتا ہے ہمیشہ سے مرکز
علم وفن اور گہوارۂ تہذیب رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کو اگر آپ ہندوستان
کے نقشہ پر دیکھنے کا ارادہ کریں تو کافی جستجو اور تلاش کے بعد چند نقطوں سے
زیادہ طول وعرض نہ دیکھ پائیں گے۔ پھر اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ۱۷۷۴ء
میں نواب فیض اللہ خاں صاحب نے اس کو پایۂ تخت قرار دے کر باقاعدہ آباد کیا
تھا۔ اس حساب سے اس کی عمر صرف دو سو نو سال کی ہے لیکن اتنے قلیل عرصہ میں
اس مختصر سی آبادی نے اپنا نام عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ہے اور
محتاج تعارف نہیں رہی۔ جس کی پہلی وجہ تو خدائے برتر کا کرم اور علمائے کرام و
خاصانِ خدا کا وجود مسعود ہے اور دوسری وجہ تعلیم دین اور شعائر اسلام سے دلچسپی و
رغبت کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اہل علم نے اپنی زبان وقلم سے کبھی اس خطۂ رام پور کو

[فر]اموش نہیں کیا ماضی قریب میں بھی اور ماضی بعید میں بھی۔

احقر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اِن اوراق پر اُن منتشر حالات و واقعات کو [یک]جا کرے جن کا تعلق اسلام کی اس عمارت سے ہے جو ہر مسلم آبادی کے لئے ضروری ہے [او]ر جسے المسجد الجامع کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عنوان پر اب تک باقاعدہ [ن]ہیں لکھا گیا ہے بلکہ عمارات رام پور کے تحت ذیلی طور سے بہت مختصر تعارف کرایا گیا [ہ]ے اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ مفصل طور سے اس پر لکھا جائے چنانچہ اب تک کی حاصل [شـ]دہ معلومات کو سپرد قلم کر رہا ہوں۔

جامع مسجد رام پور کی بنیاد عہد فیض اللہ خانی سے مانی گئی ہے جس کو اکثر مصنفو[ں] [نے] تسلیم کیا ہے لیکن کسی نے تاریخ کا تعین نہیں کیا ہے۔ نجم الغنی خاں (م ۱۹۳۲ء) [لک]ھتے ہیں:

"نواب (فیض اللہ خاں) صاحب کے عہد میں مسجدیں بکثرت
تعمیر ہوئیں جامع مسجد قدیم انھیں کی تعمیر کرائی ہوئی تھی[۵]"

[ام]یر مینائی (م ۱۹۰۰ء) بھی اسی طرح کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عہد دولت میں مسجدیں بکثرت تعمیر ہوئیں اور ایک مسجد ایسی عالی شان بنی کہ اس سرزمین پر بے نظیر ہے حسن نیت سراپا برکت سے آج تک دن رات مصلیوں کی جماعت سے رونق پذیر ہے[۶]"

[تا]ریخ کے تعین کے سلسلے میں پہلی بار کلب علی خاں فائق رام پوری نے اپنے مضمون [ـ]مدرسہ عالیہ رام پور میں یہ انکشاف کیا ہے کہ "میرے مرحوم چچا احمد رضا خاں (ولادت [۱۸]۱۸ء وفات ۱۹۷۲ء) نے بتایا کہ جامع مسجد فیض اللہ خانی کے دروازہ کی محراب [م]یں مصرع تاریخ کندہ تھا۔

"یک مسجد فیض کعبۂ نو" ۳ھ

۱۱۸۰ھ

ہجری سال ۱۱۸۰ کا عیسوی ۱۷۶۶ برآمد ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ رام پور کے پایۂ تخت قرار پانے سے پہلے اس کی تعمیر ہوئی۔ اس کا مزید ثبوت جسٹس ارشاد اللہ خاں (م ۱۹۷۹ء) کی تحریر سے بھی ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"نواب فیض اللہ خاں صاحب مع مولوی (غلام جیلانی خاں) صاحب اور دیگر پٹھانوں کے سرداروں کے ساتھ رام پور آئے تو انھوں نے رام پور شہر میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔" ۴ھ

فیض اللہ خاں کے رام پور آنے سے مراد وہ وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ اور ان کے بھائی عبداللہ خاں احمد شاہ ابدالی کی قید سے اپنے والد علی محمد خاں کے انتقال سے تین سال بعد ۱۷۵۲ء میں رام پور آئے تھے اور یہ مسجد انھوں نے وُرودِ رام پور کے دس پندرہ سال بعد بنوائی ہو۔ اس طرح سال ۱۱۸۰ھ کی صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

اس مسجد کی بنیاد ہمیشہ علماء و صوفیاء کے ہاتھ سے رکھی جاتی رہی ہے چنانچہ فیض اللہ خانی مسجد کی بنیاد کے سلسلے میں ایک واقعہ کی کتاب حالات خاندان مولوی غلام جیلانی خاں مصنفہ جسٹس ارشاد اللہ خاں میں ملتا ہے۔ ۵ھ

اس کے علاوہ اس مسجد کی بنیاد رکھنے والوں میں حافظ سید محمد ایوب صاحب بھی تھے جو قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۶ھ

بہر حال یہ خوبصورت جامع مسجد ۱۱۸۰ھ میں تیار ہوئی جو اس وقت کی آبادی اور شاندار رہائشی عمارتوں کے لحاظ سے یقیناً بے مثل رہی ہو گی۔

منشی امیر اللہ تسلیم (م ۱۹۱۱ء) اس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اسی عہدِ دولت میں شام و سحر
بنیں مسجدیں جا بجا بیشتر
خصوص ایک مسجد ہے وہ دل پذیر
نہیں جس کا ہندوستاں میں نظیر [۷]

لیکن جب آبادی میں اضافہ ہوا اور رہائشی عمارتوں نے شان و شوکت اختیار کی تو خدائے برتر کی عبادت کے گھر کی توسیع اور تعمیر جدید کی بھی ضرورت پیش آئی چنانچہ جامع مسجد کو وسیع کرنے کے لئے برابر کی جگہ حاصل کی گئی اور اس جگہ پر ایک خوشنما دالان کے پانچ دروازوں والی لاثانی عمارت تعمیر کی گئی جس پر تین گنبد اور چار مینار تعمیر کئے گئے جن پر کلس ہائے ملمع طلائی نصب کئے گئے اس طرح یہ مسجد الگ مکمل حیثیت کی الگ ہوگئی اور جامع مسجد کہلائی۔ "کلب علی خاں (م ۱۸۸۷ء) نے قدیمی جامع مسجد کے برج گرا دیئے اور وہ اس کی بغل میں سما گئی۔" [۸]

اس نو تعمیر کے بارے میں نجم الغنی خاں صاحب رقم طراز ہیں کہ

"(کلب علی خاں) نے ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی ۔ ۲۲ شعبان ۱۲۹۱ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو علماء و فضلاء اور اولیائے شہر کے ہاتھ سے اس کی بنیاد کی اینٹ رکھوائی اور ۱۲۹۲ھ میں بن کر تیار ہوئی۔ عمارت خوشنما اور وسیع تھی جس کے مصارف کی تعداد نواسی ہزار دو سو تینتیس روپے پونے دو آنے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے: تعمیر میں بیاسی ہزار آٹھ سو چار روپے سوا تین آنے۔ کلس ہائے ملمع طلائی چھ ہزار چار سو اٹھارہ روپے ساڑھے چودہ آنے۔" [۹]

لیکن ایوب قادری صاحب نے اپنے ایک مضمون عمارات روہیل کھنڈ میں امپیریل گزیٹیر جلد ۲۱ صفحہ ۱۸۳ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ کلب علی خاں نے جامع مسجد کی تعمیر پر تین لاکھ روپے صرف کئے۔ ؎

منشی امیر اللہ تسلیم اس تعمیر جدید کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں؛

سراپا دلہن کی طرح دل فریب
ملک دیکھ کر دل میں ہوں ناشکیب
وہ تعمیر کی مسجدِ لاجواب
کہ عالم میں نکلے نہ جس کا جواب
یہ رفعت نہ دیکھی سنی خواب میں
کہ ہے چرخ ساجد ہیں محراب میں
فضا صحنِ مسجد کی ایسی کہ دل
تمنائے جنت سے ہو منفعل
اگر آنکھ پڑ جائے دیوار پر
صفا سی نظر آئے عکسِ نظر
وہ پائی ہے عظمت کہ میں کیا کہوں
بجا ہے اگر گھر خدا کا کہوں
ہزاروں مسلمان اہلِ نیاز
جماعت سے پڑھتے ہیں باہم نماز
مقرر ہیں روز و شب و صبح و شام
خطیب و مؤذن مکبر امام ؎

مسجد کے آنگن میں داہنے اور بائیں جانب کمرے بنائے گئے جن میں ۱۹۰۰ء کے قریب

مدرسہ عالیہ بھی آگیا تھا جو ۱۹۱۲ء تک رہا اور پھر گنجِ قدیم میں منتقل ہوگیا جہاں سے ۱۹۴۹ء میں یہ کلب گھر کی عمارت میں منتقل ہوا اور اب تک وہیں ہے۔

ایک صدر دروازہ تعمیر کرایا جس پر ایک گھنٹہ دورویہ نصب ہے کہ اندر اور باہر والے ایک ساتھ اس میں وقت دیکھ سکتے ہیں۔ یہ گھنٹہ ۱۸۷۶ء میں خصوصی طور سے پرنس آف ویلز کے لئے بنا تھا اور اسے لندن کی جے بی بینسن کمپنی نے بنایا تھا جو بزرگوں کی روایت کے بموجب کلب علی خاں صاحب نے لندن سے سیکنڈ ہینڈ منگوایا تھا اور یہاں لگوایا۔ اس گھنٹہ پر دو تختیاں نصب ہیں جن پر یہ تحریر ہے:

پہلی تختی

Wath and Clock Maker by Special Appointment To H. R. H. The Prince Of Wales

دوسری تختی

J. B. Benson Ludcate Hill and old Bondst LONDON.

اس گھنٹہ کی آواز میلوں دور تک سنی جاتی ہے۔ بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ نواب کلب علی خاں خود بھی نمازِ جمعہ کے لئے مسجد تشریف لاتے تھے۔

زمانہ کے شب و روز گذرتے رہے بالآخر نواب حامد علی خاں کی نوابی کا زمانہ آیا جنھیں تعمیرات کا بے حد شوق تھا۔ حسنِ اتفاق سے انھیں کرنل رائٹ نامی ایک فرانسیسی انجینیر مل گیا جس کے ذریعہ انھوں نے تعمیرات کا کام کرایا۔

رام پور کی اکثر سرکاری عمارات اندرون قلعہ رنگ محل، حامد منزل (رضا لائبریری) مچھلی بھون (گرلز ڈگری کالج) امام باڑہ و مسجد اور بیرون قلعہ صدر کچہری کوٹھی خسرو باغ (رضا ڈگری کالج) کوٹھی شاہ آباد، کوٹھی بے نظیر، کوٹھی خاص باغ، اسٹیٹ ہائی اسکول (حامد انٹر کالج) وغیرہ سب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان تمام تعمیرات کے ساتھ نواب حامد علی خاں نے جامع مسجد کو بھی از سر نو تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ اخبار دبدبۂ سکندری لکھتا ہے:

"نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) کی تعمیر کردہ جامع مسجد جو اَب مخدوش حالت میں تھی نواب حامد علی خاں نے اپنی علو ہمتی سے براہ رعایا نوازی منہدم کرا کے از سر نو نہایت خوشنما و شاندار جامع مسجد تعمیر کرنے کے لئے کئی لاکھ روپے کی منظوری صادر فرمائی اور انہدام کا کام شروع ہوگیا ...... اور طے پایا کہ مسجد کی تعمیر کی تکمیل تک نماز جمعہ موتی مسجد میں ہو۔ چنانچہ ۴ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۱۲ء کو پہلی مرتبہ نماز جمعہ موتی مسجد میں ہوئی۔ موتی مسجد جامع مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے اور کافی وسیع ہے اور مسجد کے اندر حوض بھی ہے۔" [۱۲]

جامع مسجد منہدمہ کے برابر قدیمی جامع مسجد تھی جسے نواب فیض اللہ خاں صاحب نے بنوایا تھا۔ نواب کلب علی خاں نے ۱۸۷۴ء میں تعمیر نو کے وقت اس کا الگ وجود برقرار رکھا تھا لیکن نواب حامد علی خاں نے اس موقع پر اس مسجد کا کچھ حصہ موجودہ جامع مسجد میں شامل کر دیا اور باقی حصہ کو الگ ایک

دالان کی شکل میں چھوڑ دیا جس میں عورتیں اب بھی جمعہ کے روز نماز ادا کرتی ہیں۔

میرے نانا خطیب اعظم حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں صاحب (م ۱۹۸۷ء) نے میرے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ قدیمی جامع مسجد کا کچھ حصہ شامل کرنے سے جامع مسجد کا دالان تو ضرور وسیع ہو گیا لیکن صحن ٹیڑھا ہو گیا جس سے اس کی خوبصورتی جاتی رہی۔ اگر حامد علی خاں پرانی مسجد کو اس میں شامل نہ کراتے تو اس کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل ہوتی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صحن کی ٹیڑھ مسجد کی خوبصورتی پر اثر انداز ہے۔

الغرض مسجد کی تعمیر کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔

> نواب حامد علی خاں نے چاہا کہ نماز جمعۃ الوداع اپنے قدیمی مقام پر ہو اور مسلمانوں کو عظیم الشان جماعت کے برکات حاصل ہوں لہٰذا شب و روز تعمیر کا کام کرایا گیا اور ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء کو نماز جمعۃ الوداع جدید تعمیر شدہ جامع مسجد میں پورے اسلامی کر و فر اور شان و شوکت کے ساتھ ہزارہا مسلمانانِ رام پور نے ادا کی۔" [۱۳]

اس کے اختتام پر عبد الحکیم خاں مضطر نے یہ تاریخ لکھی:

شاہ اورنگِ عدالت نورِ چشم دین و داد
ظلِ او بر فرقِ ما بادا الٰہی دائما
مسجد جامع وسیع و مرتفع تعمیر کرد
فی المثل گوئی کہ بر فرش ست عرشِ کبریا
طرفہ تاریخے بمضطر ہاتفے القا نمود
از سرِ ذکر و صلوٰۃ و منبر و بانگ و دعا [۱۴]

۱۳۳۲ھ

جامع مسجد کا محل وقوع بہت عمدہ ہے۔ چاروں طرف بازار ہے اور قلب شہ
میں واقع ہے۔ شمالی جانب میں قلعہ معلیٰ ہے نیچے بازار اصرافہ ہے۔ جنوب مشرقی
میں بازار صفدر گنج ہے۔

مسجد کافی وسیع ہے اندرونی حصہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ساڑھے تیرہ
افراد بآسانی نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ اندرونی حصہ میں سنگ مرمر کا سفید
کالا فرش شطرنج کی بساط کی طرح بچھا ہوا ہے جو ہر زمانہ میں ٹھنڈا رہتا ہے اور
پر خوبصورت دریاں بچھی رہتی ہیں، مسجد کے درمیانی حصہ میں تین شاندار منبت کار
سنہری و روپہلی کام سے مزین محرابیں ہیں۔ بیچ میں امام کے کھڑے ہونے کی
ہے اور دائیں بائیں پتھر کے تراشیدہ خوبصورت منبر ہیں۔ ابھی حال میں بیچ کی محر
میں رنگین ٹائلیں (TILES) لگ گئی ہیں جن سے محراب کی رونق دوبالا ہو گئی ہے

مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے کے لئے محرابی شکل میں بہترین
کی منبت کاری سے مزین طویل و عریض سات شاندار دروازے ہیں، درمیانی
دروازہ نسبتاً بڑا ہے۔ سب پر انتہائی شاندار تانبہ کے کواڑ جڑے ہوئے ہیں
اندرون حصہ کے درمیان میں خوبصورت قسم کے چھ ستون ہیں پہلے ان پر پلا
اور رنگ کیا ہوا تھا ابھی ۱۹۸۰ء میں ان پر مزیک (MOSAIC) کیا گیا۔
جس سے اس کی خوشنمائی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ان ستونوں کے درمیان
سنہری کام کے بہت عمدہ بلوری جھاڑ زنجیروں کے ذریعہ چھت میں آویزاں ہیں
ان پر سونے کا پانی کیا ہوا ہے اور بجلی کے بلب نصب ہیں۔ اس کے علاوہ خا
تعداد میں بجلی کے پنکھے بھی آویزاں ہیں جو گرمی کے زمانہ میں نمازیوں کو بہت
آرام پہنچاتے ہیں۔

مسجد کا صحن بھی بہت وسیع ہے جس میں تقریباً ڈھائی ہزار افراد بیک

نماز ادا کر سکتے ہیں اس کا فرش سرخ پتھر کا ہے۔ درمیان صحن میں دو خوبصورت کھمبے نصب ہیں جن پر روشنی کے لئے لالٹینیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ پورے صحن میں مزید کھمبے بھی نصب ہیں جن پر تار کھنچے ہوئے ہیں ان پر دھوپ وغیرہ سے بچنے کے لئے سائبان لگا دیئے جاتے ہیں۔ شرقی جانب صدر دروازہ مسجد کے مناسب اور شاندار طریقہ پر بنا ہوا ہے۔ اس پر گھنٹہ بھی نصب ہے۔ وضو کرنے کے لئے جنوب کی سمت میں کافی وسیع و عریض حوض بھی ہے جس کے بیچ میں دو فوارے نصب ہیں اس میں رنگین مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایک ٹنکی بھی بن گئی ہے جس سے نمازیوں کو مزید آسانی ہو گئی ہے۔

صدر دروازے کے علاوہ دو چھوٹے دروازے اور بھی ہیں جو ہر وقت آمد و رفت کے لئے کھلے رہتے ہیں ان میں تحصیل کی جانب کے صدر دروازہ کی تعمیر جدید اگست ۱۹۳۹ء میں ہوئی ہے۔ جنوب مشرقی جانب میں اذان دینے کے لئے ایک میذنہ (اذان گھر) ہے جہاں سے اذان لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ دی جاتی ہے، لاؤڈ سپیکر نظام یہاں ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا۔

جامع مسجد کی ایک خاص تقریب جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو ہوتی ہے اس میں قرآن خوانی، قُل اور جلسۂ سیرت کے پروگرام مرتب ہوتے ہیں بعدہٗ لڈو تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس جشن کو عام طور سے اہل رام پور لڈو خانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ جشن برسہا برس سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

اس مسجد کا انتظام و انصرام ہمیشہ سے ریاست کے زیر تحت رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں انضمام ریاست کے بعد اسٹیٹ وقف آفس اس کی دیکھ بھال کرتا رہا جس کے ذمہ دار نواب صاحب رام پور تھے۔ اب یکم اپریل ۱۹۷۶ء سے اس کا انتظام شہر کے

زعماء کی ایک کمیٹی کر رہی ہے جس کا یوپی سُنّی سینٹرل وقف بورڈ لکھنؤ سے الحاق ہے۔

اس کمیٹی کے قیام سے جامع مسجد کے انتظام و انصرام میں کافی بہتری آئی ہے۔ کمیٹی نے بہت سی جدید تعمیرات بھی کرائی ہیں جیسے اندرونی حصّہ میں دوبارہ مکمل پلاستر، ستونوں پر موزیک، آنگن میں مکمل نصبی سائبان ٹنکی کی تعمیر اور جدید مارکیٹ کا قیام، جس سے کہ آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے ــــ خدا کرے یہ سلسلۂ انتظام اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

آخر میں جامع مسجد کے اماموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ قاری سید علی حسین نقشبندی محدث — آپ ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ وفات آپ کی ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں ہوئی۔[۱۶] آپ فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔

۲۔ مولوی حافظ عبد الشکور — آپ ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ سے ۱۸۶۵ء/۱۲۸۲ء تک فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔[۱۷]

۳۔ مولوی ثناء اللہ — جمادی الاول ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء تک زندہ تھے[۱۸] آپ فیض اللہ خانی جامع مسجد کے امام رہے۔

۴۔ مولوی سید منیر علی قادری — ۱۸۷۵ھ/۱۲۹۲ھ میں تعمیر نو کے وقت آپ نے کلب علی خاں صاحب کی خواہش پر صرف ایک جمعہ پڑھایا۔ خطبہ کا ایک شعر یہ ہے ؎

اے دل مکن گناہ کہ تحقیق مردہ نیست
اعمال نیک کن کہ قیامت رسیدہ نیست

۵۔ مولوی سید نثار علی قادری

۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۲ء تک آپ نے بحیثیت خطیب صرف جمعہ پڑھایا۔ ۸ر جون ۱۹۰۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

۶۔ سید ارتضیٰ علی صاحب

آپ کا نام امام کی حیثیت سے ۱۸۹۱ء میں ملتا ہے[19] اور انتقال ۲۳ر جولائی ۱۹۱۳ء کو ہوا[20] لہٰذا آپ کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔

۷۔ سید فتح علی صاحب

آپ کا ذکر بھی ۱۸۹۱ء میں ملتا ہے[21]۔ لہٰذا آپ بھی کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔

۸۔ حافظ سید محمد شاہ صاحب

آپ کا نام ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک پیش امام کی حیثیت سے آتا رہا ہے[22]۔ لہٰذا آپ کلب علی خانی جامع مسجد کے امام رہے۔

۹۔ سید جمیل حسن قادری

آپ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۲۳ء تک نائب امام کی حیثیت سے رہے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد آپ امام اول ہو گئے۔ ۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

۱۰۔ حافظ حاجی کلن صاحب

آپ کا ذکر ۱۹۰۹ء میں آیا ہے۔ نومبر ۱۹۰۹ء میں آپ کا انتقال ہوا[23]۔

۱۱۔ سید ابرار حسن صاحب

آپ ۱۹۱۳ء میں امام اول مقرر ہوئے

اور ۱۹۲۳ء میں مستعفی ہو گئے۔

۱۲۔ حافظ صدیق صاحب

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دی اس کے بعد موتی مسجد میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد ہی پھر آپ کو جامع مسجد میں بلا لیا گیا۔ جہاں کچھ مدت رہے۔

۱۳۔ مولوی جلال میر صاحب افغانی

نائب امام کی حیثیت سے آپ نے صرف ایک ماہ کام کیا اس کے بعد آپ کا تبادلہ کربلا کی مسجد میں کر دیا گیا۔

۱۴۔ قاری محمد امین الدین صاحب

نائب امام کی حیثیت سے آپ کا ذکر دبدبۂ سکندری شمارہ ۷، ۲ر اگست ۱۹۳۴ء میں ملتا ہے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں آپ امام اوّل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۱ء میں آپ پاکستان چلے گئے۔

۱۵۔ مولوی محمد افضل صاحب افغانی

ابتداء ۱۹۴۶ء میں ایک ماہ کے لئے نائب امام مقرر ہوئے لیکن بہ سبب اختلاف عقائد ناپسندیدہ برطرف کر دیئے گئے۔

۱۶۔ حافظ محمد وحید الرحمٰن صاحب مجددی

آپ بھی ۱۹۴۶ء میں صرف تین چار ماہ ہی بحیثیت نائب امام رہے

۱۷۔ قاری عبد الحق خاں صاحب

۱۹۴۶ میں بحیثیت نائب امام آپ کا تقرر ہوا اور ۱۹۵۱ء میں امام اوّل بنائے گئے۔

لیکن ۱۱ر جنوری ۱۹۵۴ء کو بوجہ اختلاف علیحدہ ہو گئے۔

۱۸۔ سید نور الحسن صاحب قادری

آپ کا باضابطہ تقرر ۱۹۵۱ء میں بحیثیت نائب امام ہوا۔ اس سے پہلے آپ مؤذن کے عہدہ پر تھے۔ یکم مئی ۱۹۵۴ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں مستعفی ہو گئے۔

۱۹۔ مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی

یکم مئی ۱۹۵۴ء کو آپ کا پیش امام کے عہدہ پر تقرر ہوا لیکن دسمبر ۱۹۵۷ء آپ برطرف ہو گئے۔

۲۰۔ خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب قادری مجددی

۱۳ر جنوری ۱۹۵۸ء میں آپ باقاعدہ امام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس سے پہلے آپ مختلف اوقات میں خطیب کی حیثیت سے کام انجام دیتے رہے۔ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو آپ اس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔

۲۱۔ مفتی محبوب علی صاحب قادری (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ رام پور)

ویسے تو آپ ۱۹۵۸ء سے بحیثیت نائب امام تھے لیکن آپ کا باضابطہ تقرر ۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ہوا ہے جس پر آپ فائز ہیں۔

۲۲۔ مولوی سید احمد علی صاحب چشتی نظامی

یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے بحیثیت خطیب آپ کا تقرر ہوا ہے۔

۲۳۔ مولوی مظاہر اللہ خاں

آپ کا تقرر ۷ر مئی ۱۹۸۴ء کو بحیثیت امام ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱ے اخبار الصنادید حصہ اول مولفہ نجم الغنی خاں مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۵۹۸۔

۲ے انتخاب یادگار مؤلفہ امیر احمد مینائی مطبوعہ تاج المطابع (رام پور) ۱۲۹۰ھ صفحہ ۳۷۔

۳ے مضمون "مدرسہ عالیہ رام پور" از کلب علی خاں فائق شائع شدہ علم و آگہی کراچی علمی ادارے نمبر ۷۵-۷۴ء صفحہ ۲۹۔

۴،۵ے حالات خاندان مولوی غلام جیلانی خاں جسٹس ارشاد اللہ خاں مطبوعہ کراچی صفحہ ۷۔

۶ے تذکرہ کاملان رام پور مولفہ احمد علی شوق رام پوری مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء صفحہ ۷۶

۷ے تاریخ بدیع مصنفہ امیر اللہ تسلیم مطبوعہ حسنی پریس رام پور ۱۲۹۸ھ صفحہ ۱۰۰

۸ے اخبار الصنادید ایڈیشن ۱۹۰۶ء مطبوعہ خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور صفحہ ۸۳۶

۹ے اخبار الصنادید جلد دوم ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۸۲

۱۰ے مضمون "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟ عمارات روہیل کھنڈ" از محمد ایوب قادری، شائع شدہ رسالہ العلم کراچی جلد ۳ شمارہ ۲ صفحہ ۸۱

۱۱ے تاریخ بدیع صفحہ ۲۱۱۔

۱۲ے ہفتہ وار دبدبۂ سکندری رام پور جلد ۴۸ مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۴۔

۱۳ے دبدبۂ سکندری جلد ۴۹ شمارہ ۳۸ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۳۔

۱۴ے اخبار الصنادید حصہ اول ایڈیشن ۱۹۱۸ء صفحہ ۴۵۸۔

۱۵ه دبدبۂ سکندری مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۳۹ء

۱۶ه تذکرہ کاملانِ رام پور صفحہ ۲۵۳

۱۷ه خود نوشت بیاض مولوی منور علی صاحب مملوکہ صغیر احمد صاحب (مرحوم)

۱۸ه تواریخ آئینہ تصوف از محمد حسن صابری، لاہور آرٹ پریس لاہور، ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۰۹۔۔

۱۹ه رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵ مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۸۹۱ء۔

۲۰ه دبدبۂ سکندری جلد ۴۹ شمارہ ۴۳ مورخہ ۴ر اگست ۱۹۱۲ء۔

۲۱ه رام پور اسٹیٹ گزٹ جلد ۳ شمارہ ۱۵۔

۲۲ه رام پور اسٹیٹ گزٹ ۱۹۰۳ء و دبدبۂ سکندری ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۱ء

۲۳ه دبدبۂ سکندری جلد ۵ شمارہ ۴۴ مورخہ ۲۹ر نومبر ۱۹۰۹ء

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شمالی افریقہ کی مکمل فتح کے بعد وہاں کی مسلم حکومت نے اسپین کی طرف توجہ کی۔ اسپین میں سیاسی اور سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں کے عوام موجودہ حکمرانوں کے ظلم وستم سے نجات پانے کے متمنی تھے۔ شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے ابتداء میں اسپین کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے پانچ سو افراد پر مشتمل ایک دستہ کے ساتھ اپنے ایک معتمد فوجی ظریف کو بھیجا۔ پھر مطمئن ہونے کے بعد ۷۱۱ء میں اپنے مسلم غلام اور فوجی بربر کو جس کا نام طارق بن زیاد تھا، اسپین کی فتح کے لئے پانچ ہزار فوج لیکر روانہ کیا۔ طارق نے اپنی فوج کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر اسپین کے ساحل پر قدم رکھا اور یہ کہہ کر اپنی کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا کہ ہم اسپین کو فتح کریں گے یا اسی سرزمین پر شہید ہو جائیں گے اس جگہ کو آج تک جبل الطارق (JIBRALTER) کہا جاتا ہے۔ طارق کو یہاں تیزی کے ساتھ فتوحات حاصل ہوئیں اور ایک سال سے کم ہی مدت میں طارق نے نصف سے زیادہ اندلس کو فتح کر لیا۔ بہت سی جگہوں پر بغیر کسی لڑائی کے لوگوں نے اپنے شہر اور قلعے مسلم فوج کے حوالے کر دیئے۔ جن شہروں کو طارق نے فتح کیا ان میں زیادہ اہم

قرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ تھے۔ طارق کو موسیٰ کی طرف سے مدد ملتی رہی۔ مگر کچھ دنوں بعد موسیٰ بن نصیر خود بھی الگ فوج لے کر اسپین پہونچ گئے۔ اور باقی اسپین کو موسیٰ اور طارق نے مل کر فتح کیا۔ دو سال سے کم ہی مدت میں پورا اسپین مسلمانوں کے ہاتھوں میں آچکا تھا۔ یہ بنو امیہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور شام کے پایہ تخت دمشق میں ولید کی حکومت تھی۔

۷۱۵ء میں ولید کا بھائی سلیمان خلیفہ بنا اور اس نے اپنی خفگی کی وجہ سے شمالی افریقہ اور اسپین کی گورنری سے موسیٰ بن نصیر کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اس کے بعد چالیس سال تک اسپین میں حکومت تو مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہی لیکن آپس کے جھگڑے شروع ہو گئے جس کی وجہ سے آئے دن گورنر بدلنے لگے۔ یہاں تک کر عرب قبیلوں کے اس جھگڑے کی وجہ سے پینتیس چالیس سال کے درمیان اتنے ہی گورنر آئے اور گئے۔ آٹھویں صدی کے وسط میں اسلامی دنیا میں سیاسی سطح پر ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ تمام حکومت بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس نئی حکومت نے اپنے دارالسلطنت کے لئے بغداد کا انتخاب کیا۔ مگر شمالی افریقہ اور اسپین پر عباسیوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ چنانچہ اسپین کے گورنر یوسف الفہری نے اپنی آزاد بادشاہت قائم کر لی اور اسپین عباسی حکومت سے الگ ہو گیا۔

بنو امیہ کے ہر ہر فرد کو عباسیوں نے ۷۵۰ء کے انقلاب میں چن چن کر مار ڈالا۔ لیکن بنو امیہ کے شاہی خاندان کا صرف ایک نوجوان لڑکا جس کی عمر بیس سال تھی کسی نہ کسی طرح جان بچا کر شمالی افریقہ پہونچ گیا اور پانچ سال تک یہ نوجوان جس کا نام عبد الرحمٰن تھا۔ شمالی افریقہ کے مختلف دیہاتوں میں چھپ چھپ کر وقت گذارتا رہا۔ آخر اس نے اپنے ایک غلام کو جس کا نام بدر تھا۔ یہ معلوم کرنے

کے لئے اسپین بھیجا کہ وہاں کے عرب قبیلے عبدالرحمٰن کو اسپین بلا سکتے ہیں یا نہیں، اور اس کا ساتھ دیں گے یا نہیں۔ بدر جو جواب لے کر آیا اس سے عبدالرحمٰن کا حوصلہ بلند ہوگیا اور وہ خاموشی سے اسپین پہونچ گیا۔ یہاں کے عرب قبیلے جو بنو امیہ کے خاندان سے بہت ہمدردی رکھتے تھے، عبدالرحمٰن کا پورا ساتھ دیا۔ اسپین کے آزاد گورنر یوسف الفہری اور عبدالرحمٰن کے ساتھ "زلاقہ" کے میدان میں زبردست جنگ ہوئی جس میں عبدالرحمٰن فتح یاب ہوا۔ اس طرح ۷۵۶ء میں اسپین میں بنو امیہ کی حکومت دوسری بار قائم ہوگئی جس کا پہلا بادشاہ عبدالرحمٰن تھا۔ عبدالرحمٰن نے باہر آکر اسپین کو نئے سرے سے فتح کیا اس لئے لوگوں نے اس کو الداخل کا خطاب دیا یعنی باہر سے داخل ہونے والا۔

عبدالرحمٰن نے اسپین میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو ختم کیا اور بہت نظم وضبط کے ساتھ حکومت شروع کی۔ اسپین میں بنو امیہ کی یہ حکومت ۷۵۶ء سے ۱۰۳۱ء تک تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ اس مدت میں یہ حکومت نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ بعض کمزوریاں راہ پاتی رہیں لیکن موقع بہ موقع ان کا مداوا بھی ہوتا رہا۔ مثلاً تین نسلوں کے بعد یہ حکومت جو آپسی جھگڑوں کا شکار ہوکر کمزور اور محدود ہونے لگی لیکن دسویں صدی کے آغاز میں عبدالرحمٰن سوم نے جس کو الناصر کہا جاتا ہے، دوبارہ اس حکومت کو مستحکم کیا۔ یہ عبدالرحمٰن سوم ۹۱۲ء سے ۹۱۶ء تک حکمراں ۔ ۹۲۹ء تک بنو امیہ کی یہ حکومت اسپین میں "امارت" کے نام سے معروف رہی اور اس کے بادشاہوں کو امیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ لیکن ۹۲۹ء میں جب عبدالرحمٰن الناصر کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی تو اس نے بنو امیہ کی اس حکومت کو "امارت" کے بجائے "خلافت" میں بدل دیا اور اپنے لئے امیر کے بجائے خلیفہ کا لقب پسند کیا۔ اس کے بعد سے آخری دن تک

بنوامیہ کی حکومت اموی خلافت کہلائی۔ اس طرح سے بنوامیہ کی اسپین میں "امارت" کا زمانہ ۷۶۵ء سے لے کر ۹۲۹ء تک ہے۔ اس کے بعد ۹۲۹ء سے ۱۰۳۱ء تک کا زمانہ خلافت کا کہلاتا ہے۔ لیکن آخری دنوں میں بنوامیہ کی یہ حکومت اتنی کمزور ہوگئی کہ اکثر گورنروں نے اپنے اپنے شہروں میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ یہاں تک کہ بنوامیہ کی حکومت جو سمٹتے سمٹتے اپنے دارالحکومت قرطبہ میں محدود ہوگئی تھی وہ بھی آخرکار ختم ہوگئی۔

(باقی)

جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
کی
چوتھی برسی کی یاد

یکم مئی ۱۹۸۸ء

ایثار و حریت کے عنوان تھے عتیق | بنیادِ انقلاب ایمان تھے عتیق
زاہد کہیں مجاہد حافظ کہیں محافظ | آدم کے وارثوں کی پہچان تھے عتیق
حق نے انھیں بنایا دانائیوں کا پیکر | تفسیر درس آلِ قرآن تھے عتیق

ہر دردِ لا دوا کے درمان تھے عتیق
رحمتؔ چراغ راہ ایمان تھے عتیق

بعد از ختم قرآنِ کریم اور درود، فاتحہ خوانی نیز دعائے مغفرت اور تعزیت کے ایصال ثواب برائے روح پاک جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی بر موقعہ اُن کی چوتھی برسی یکم مئی ۱۹۸۸ء
منجانب مدرسہ دارالاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ ضلع گوڑ گانوہ ہریانہ

آج ہم ایک ایسے انسان کے متعلق گفتگو اور یاد منا رہے ہیں جس کی بلند و بالا شخصیت کی تعریف و توصیف سے زبان و قلم عاجز ہے۔ وہ انسان جس کا باطن ان کے ظاہر سے کہیں پاک و صاف اور پُر کشش تھا اس لئے وہ انسان اسلامی عرفان و تہذیب کے دریائے بے کراں کا دُرِّ بے بہا تھا۔ وہ انسان جس کے قلب پر نورِ علم درخشاں جس کی روح پر عشقِ الٰہی محیط، وہ انسان جس کے پورے وجود پر اخلاص کی حکمرانی تھی۔ یہ سب آثار اس کے چہرے پر باہر و ظاہر تھے۔ مرحوم ایک بہت بڑے جیّد عالم باعمل اور قوم کے مجاہد ہی نہ تھے بلکہ اخلاق تہذیب کے بھی ایک عظیم معلّم تھے۔ آپ کی انکساری سادگی مہربانی، خاموشی اور وقار کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ مرحوم وہ انسان تھے جنھوں نے مذہب اور اس کی روحانیت کو سمجھا تھا، آج کل تو حالت یہ ہے کہ مذہب میں روحانیت ہی نہیں دکھائی دیتی، جہاں اجلی پوشاکیں تو ہوتی ہیں مگر روح سیاہ اور دل اتنے ہی میلے ہوتے ہیں لیکن مرحوم مولانا جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بہت پہلے اس وقت محسوس کیا تھا کہ جب انسان دینِ حق یعنی مذہب کی ہی بنیاد پر زندگی گزارتا تھا مگر افسوس کہ اب وہ نہیں رہے۔

(اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی، ملّی و قومی خدمات کو بے حد مقبول فرماکر پسران و عزیزان کو ان کا نعم البدل عطا فرماوے آمین۔

اور اُن کی پوری پوری مغفرت فرماکر جنت الفردوس

میں مقام عطا فرماوے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل بالخصوص ان کے پیارے بیٹوں کو مرحوم موصوف کے اوصاف حمیدہ کو اپنانے کی توفیق دیں۔
آمین ثم آمین

ابرِ رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے
(آمین ثم آمین)

رحمت علی غفرلہٗ
سوہنہ ضلع گوڑگانوہ

نوٹ: یہ اشتہار ماہ مئی ۱۹۸۸ء کے رسالہ میں شائع ہونے کے لئے تھا کسی وجہ سے اس کو متاخیر کے ساتھ ماہ ستمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

سنہ ۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ اسلام واعلام ۔ اسلام کا نظام عفت وعصمت
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت دوسرا جدید طبع پذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبر تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس ، انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب اور کونین

سنہ ۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب واخلاق ۔ عروج وزوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، برصغیر
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، بیر کشی ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ،
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ مرد عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف وسلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd No (DN) 74 Phone : 262815 September 1988
R No 965—57 Subs 45/- Per Copy Rs 4-00

BURHAN (Monthly)

4136 Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

برہان

جلد ۱۰۲ | صفر المظفر ۱۴۰۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۸ء | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

برطانوی سامراج سے ملک کو سیاسی اور فکری اعتبار سے آزاد ہوئے چار دہائیاں مکمل ہو چکی ہیں لیکن آزادی کا جو سنہرا خواب باشندگان وطن نے دیکھا تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہے۔

عام طور سے مفکرین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ کوئی بھی نسل چالیس سال کے عرصے میں وہ اپنے جوہر دکھا کر میدانِ عمل سے پوری طرح ہٹ جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ انسان کی مکمل جوانی، فکری، و جسمانی بلوغت طاقت وقوت اور مضبوطی کو پہونچنے کے لئے بھی چالیس سال کی عمر کا تذکرہ کتاب فطرت یعنی قرآن کریم میں آیا ہے:

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً	یہاں تک کہ خوب جوان ہو گیا اور اپنی طاقت کو پہونچا اور چالیس سال کا ہو گیا۔

ملک کی چالیس سالہ سیاسی زندگی کا اگر بے لاگ جائزہ لیا جائے تو آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک نسل ختم ہو چکی ہے اور دوسری نسل نے سیاسی اقتدار سنبھال لیا ہے۔ چالیس سالہ طویل عرصے میں ہم نے مجموعی طور

پر کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ ایک بہت ہی غور طلب، سنجیدہ اور اہم سوال ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ قوموں کی ایک علامت اور نشانی یہ بھی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی ہے۔ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیتی ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

صورتِ شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

آزادی کے بعد پچھلے چالیس اکتالیس برسوں میں ملک نے مالی وسائل، مادی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی میں اضافہ، سیاسی استحکام، سوشل اور رفاہی اداروں کے ذریعے قابل ذکر تعمیر و ترقی میں پیش رفت کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ملک نے COUNTRY BUILDING میں بڑی حد تک ترقی کی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی حیثیت، انفرادیت اور قوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک کردار کی تعمیر (NATIONAL BUILDING) کا سوال ہے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت مان لینی چاہیئے کہ اس میدان میں مایوس کن حد تک ہمارا ملک، ہمارا سماجی نظام اور ہماری اجتماعی زندگی پیچھے ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور کردار سازی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ کسی بھی نظام کی تبدیلی کے لئے بنیادی چیز تعلیم و تربیت ہے۔

ملک کے بے پناہ داخلی و خارجی مسائل میں اہم ترین اندرونی مسئلہ آئے دن فرقہ پرستی، تشدد، تعصب، تنگ نظری، تفریق اور دہشت گردی کے غلط رجحانات کا تشویش ناک حد تک فروغ اور بڑھا وا ہے۔ موجودہ وقت میں ملکی سالمیت، قومی وحدت اور فرقہ وارانہ یکجہتی کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ماضی میں

اس طرح کبھی نہیں رہا۔ آزادی کے اتنے عرصے کے بعد بھی ملک جارحانہ فرقہ پرستی کی لعنت سے آزاد نہیں ہو سکا۔

انگریز سامراج ملک سے چلے گئے لیکن ان کی شاطرانہ سیاسی چالیں، حربے اور مہرے "لڑاؤ اور حکومت کرو" (DEA I DE RULE) کی پالیسی اقتدار پرست افراد اور جماعتوں کے ذہنوں میں پیوست ہے اور وہ محض اپنے حقیر ذاتی مفادات اور اغراض کے لئے قومی، ملکی اور اجتماعی مفاد کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں جبکہ ملک بحرانی دور سے گذر رہا ہے ہمیں علاقائیت اور زبان ونسل کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو کر انسانی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بات عام لوگوں کے ذہن نشین کرانی ہے کہ ہماری قومی زندگی کے بقا اور ارتقاء کا راز باہمی اتحاد اور یکجہتی میں مضمر ہے جبکہ انتشار اور تفریق قومی زندگی کی موت کی علامت ہے۔

ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین نیز اپنے ہی فرقے کے مختلف طبقوں کے درمیان بھی آئے دن نت نئے حالات اور حوادث کے پیش نظر اعتماد و اعتبار کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ خود ملکی سطح پر مسلم قیادت (LEADER SHEP) کا جو فقدان ہے اس کے سبب مسلم عوام کا اعتماد دانشوروں اور مفکرین کی جماعت سے اٹھتا جا رہا ہے، اب اکثر قائدین اور رہنمایان ملت کی صحیح بات بھی عوام کو مصلحت آمیز نظر آتی ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک اور اس کے موجودہ سیکولر نظام میں جہاں روز اول سے مختلف مذاہب کے پیروکار ایک ساتھ زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں لیکن اب موجودہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر

قومی یکجہتی (COMMUNAL HARMONY) کے کاز کی تقویت اور اس کو بڑھاوا دینے کے لئے ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ غیر مذاہب کے افراد اور دانشوروں سے انسانیت اور شرفِ آدمیت کے اعتبار سے قریب آنا جانا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے خیالات، نظریات، افکار، نقطۂ نظر اور معاشرتی و مذہبی زندگی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس چیز کا احساس اکثریتی فرقہ کو بھی ہونا چاہیئے اور اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو کرنا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ اس نفسیاتی نکتہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ صرف ایک دوسرے کے مذہب کی جانکاری ہی مسئلے کا حل نہیں جب تک ایک دوسرے فریق کے اندر برداشت اور تحمل کا جذبہ نہ ہو۔

ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو مختلف مذاہب خاص طور پر دین اسلام کے بارے میں بدرجۂ اتم اور خصوصی علم رکھنے کے باوجود اس کی تشریح اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور نہ شرماتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اس سے خراب اور فرسودہ کوئی نظام ہی نہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال ہمیں اس غیر معقول نظریہ سے بھی ملتی ہے جس کا ان دنوں بڑے زور و شور کے ساتھ چرچا کیا جا رہا ہے کہ "اس ملک میں مسلم تہذیب و ثقافت کے نام کی کوئی چیز ہی نہیں"۔ اس بے بنیاد نظریہ کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے؟

یہ واقعہ ہے کہ بہت سے لوگ دوسرے مذاہب اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت کے باوجود انہیں ہضم نہیں کر پاتے۔ اسے ایک نظام زندگی (SYSTEM OF LIFE) سمجھنے کو تیار نہیں۔ اس لئے قدرتاً ایک دوسرے

کے مابین جو بُعد اور دوری ہے وہ کم نہیں ہو پاتی۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ملکی وحدت اور سالمیت کی خاطر مخالف نظریات اور مذاہب کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں اور ان کو اپنے خصائص اور لوازمات کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیں۔ درحقیقت مذکورہ اصول ہی زندگی گزارنے کا مہذب، معقول اور بقائے باہم کا صحیح طریقہ ہے جس کے لئے وسعتِ قلب، وسعتِ ذہن، وسعتِ نظر اور وسعت ظرف درکار ہے اس سے ہم انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سیکھیں گے۔ ایک دوسرے کے تئیں تعاون، ایثار اور قربانی کا پاکیزہ جذبہ بیدار ہوگا اور اس سے ایک فلاحی اور مہذب معاشرے کے قیام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

قارئینِ کرام و ہمدردانِ ملت! "ادارہ ندوۃ المصنفین"
اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم
کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنی قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی
ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی
ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک
لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا
اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین،
محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دورِ گراں بازاری میں ایسے ادارے
بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جا سکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب
مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے،

اور اس کا تحقیقی وعلمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ کئی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ : جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر اور بہی خواہانِ ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! — چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اسی پتے پر ارسال کیا جائے۔

مینیجر ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی ۶

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

(۲)

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

شیر میوات علی محمد نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کی درگاہ میں مدرسہ رحیمیہ کا اجراء کیا۔ مفتی ضیاء الحق صاحب اس کے پہلے مہتمم مقرر ہوئے۔ میں دہلی گیا تو مفتی ضیاء الحق نے موقع غنیمت جان کر مدرسے میں "شاہ ولی اللہ کی خدمات" کے موضوع پر میری تقریر رکھ دی۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی۔ ہینڈ بل بھی تقسیم کیے گئے۔ صدارت کے لیے مفتی صاحب کا نام تجویز ہوا۔ میرے لیے یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ مفتی صاحب ایسے فاضلِ اجل کی صدارت میں مجھ ہیچمدان کی تقریر ایک طرح سے میرا امتحان تھا۔ خیر یہ مرحلہ خدا کے فضل وکرم سے بخوبی گذر گیا۔ مفتی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اور مجھ کج مج بیان کی تعریف فرمائی۔ شیر میوات نے بھی ایسے ہی الفاظ سے میری ہمت بندھائی۔ تقریر کے بعد کھانے کا اہتمام تھا۔ کھانے کے موقع پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اور مفتی صاحب ایک ہی رکشا میں سوار ہو کر ندوۃ المصنفین پہنچے۔

اسی طرح ۱۹۷۳ء میں، مجھے اب تک یاد ہے جولائی کی ۲۱ تاریخ تھی، جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے غالب اکیڈیمی میں حضرت مجدد الف ثانی رح کی خدمات کے بارے میں میری تقریر رکھ دی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی صدارت میں یہ تقریب منعقد ہوئی۔ مفتی صاحب چند احباب کے ساتھ تشریف لائے۔ ادھر ہمدرد انسٹی ٹیوٹ تغلق آباد سے ایک بس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، حکیم عبدالوہاب ظہوری، جناب عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر اوصاف علی، ڈاکٹر وحیدالدین اور ادارے کے بہت سے رفقاء تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر عابد حسین بھی آئے ہوئے تھے۔ اہل فکر و نظر کا اچھا خاصہ مجمع تھا۔ پاکستان میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دو قومی نظریئے کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے اور بھارت کی سیکولر فضا میں ان کی تعلیمات اور خدمات کو پاکستانی نقطۂ نظر سے بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ مفتی صاحب نے میری گھنٹہ بھر کی تقریر بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنی۔ جب خطبۂ صدارت کے بعد چائے کا دور چلا تو مفتی صاحب نے میری کج مج بیانی کی تعریف کی۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ میری دلداری کے لئے کہا ہوگا، ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

ایک زمانے میں مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سننے کا بڑا شوق تھا۔ میں عموماً رات کی نشریات سنا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے ریڈیو کا بٹن گھمایا تو حضرت شاہ کلیم اللہ ولی شاہجہان آبادی رح کے عرس کی جھلکیاں نشر ہو رہی تھیں اور مقررین کے خطاب کے اقتباسات پیش کئے جا رہے تھے۔ اچانک ہی اناؤنسر نے کہا "آپ جناب مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے خیالات سماعت فرمایئے۔" میں نے فوراً ہی

ان کی تقریر ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کرلی۔ اس روز موصوف نے الخلق عیال اللہ کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔

مصنفین کو ناشروں سے ہمیشہ یہ گلہ رہتا ہے کہ ناشرین انھیں حسب توقع رائلٹی نہیں دیتے۔ ناشروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر وہ مصنفین کی کتابیں شائع نہ کرتے تو انھیں علمی حلقوں میں کون جانتا؟ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی تصانیف چھپ کر علمی حلقوں میں چلی جائیں۔ یہ کشمکش ہمیشہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب کا اپنے مصنفین کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔ جہاں تک مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کا معاملہ ہے، مفتی صاحب اور مولانا مرحوم میں "من و تو" والی بات نہ تھی، بالکل گھر کا معاملہ تھا۔ مولانا مرحوم کے بچے مفتی صاحب کو تایا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور مفتی صاحب کی اولاد مولانا مرحوم کو چچا میاں کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ مولانا مرحوم نے اپنی کسی کتاب پر رائلٹی نہیں لی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں جب میری پہلی تصنیف ــــ دین الٰہی اور اس کا پس منظر ــــ ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی تو میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ اس کے پروف میں نے خود دیکھے تھے۔ مفتی صاحب نے حکیم ظفر احمد مرحوم سے کہا "اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کتاب ان کے لاہور جانے سے پہلے چھپ جائے اور انھیں اس کے ایک سو نسخے دے دینا۔ یہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" چنانچہ میرے جانے سے پہلے کتاب چھپ گئی اور آخری دن حکیم صاحب نے پچاس نسخے یہ کہہ کر میرے حوالے کئے کہ اتنی ہی جلدیں تیار ہو سکی ہیں۔ میں اپنی پہلی تصنیف چھپی ہوئی دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ مفتی صاحب نے مجھے مصنفین کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، میں پچاس کتابیں لے کر

پاکستان چلا آیا، اور وہ چند ہی دنوں میں دوست و احباب میں تقسیم کر دیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مفتی صاحب کے ساتھ ان کی دوستی اس حد تک تھی کہ یک جان و دو قالب کی ضرب المثل ان پر صادق آتی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی تصانیف قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں، مؤخر الذکر کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ایم اے اقتصادیات کے نصاب میں شامل ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے راقم الحروف سے ایک بار ذکر کیا کہ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک مفتی صاحب ہر ماہ ایک معقول رقم ان کی بیوہ کو بھجواتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں حضرات مزاجاً ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ ہم مزاج ہونے کے علاوہ یہ تینوں ہم مرض بھی تھے اور تینوں کا انتقال بمرض سرطان ہوا۔

میں ایک بار برسات کے موسم میں اہل و عیال سمیت علی گڑھ گیا۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم نے دریائے گنگا کے کنارے نروره میں ایک ریسٹ ہاؤس ریزرو کرایا۔ تمام اہل خانہ مع باورچی نروره پہنچے اور کئی روز وہاں ٹھہرے۔ ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی کے اوپر تھا اور نیچے گنگا بہتی تھی۔ قریب ہی گنگا پر بندھ باندھ کر ایک نہر نکالی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کے باورچی کریم خاں کو مچھلیاں پکڑنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ گنگا سے مچھلیاں پکڑ لاتا اور سالن تیار کر کے مولانا مرحوم کو کھلاتا۔ مچھلی اور بریانی ان کی کمزوری تھی۔

مولانا نروره میں قیام کے دوران باربار مفتی صاحب کو یاد کرتے اور فرماتے اگر مفتی صاحب بھی یہاں آجاتے تو چند روز آرام کر لیتے۔ ہم جتنے روز وہاں ٹھہرے مفتی صاحب کی یاد انھیں برابر ستاتی رہی۔

اگلے سال موسم گرما کی تعطیلات میں میں علی گڑھ گیا تو نروره کا پروگرام بنایا گیا۔ مفتی صاحب کو اس کی اطلاع کی گئی۔ موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے اور اگلے روز ہم نروره روانہ ہو گئے۔ چار روز وہاں قیام رہا۔ شام کے وقت ہم لان میں بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ چائے بھی وہیں پیتے۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں مفتی صاحب کی اقتدار میں ادا کرتے۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ بارش بھی وقفے وقفے سے ہوتی رہتی تھی کھانے کے وقت آم ضرور ہوتے تھے۔ شام کو آلو اور مچھلی کے پکوڑے تلے جاتے اور سبھی مزے لے لے کر کھاتے۔ صبح کے وقت گنگا کے پل پر جاکر دریا کا نظارہ کرتے۔

نروره کے چاروں اطراف میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہاں صرف زمانۂ امن ہی میں آکر رہ سکتے ہیں ورنہ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔

مولانا اکبر آبادی کثیر العیال ہونے کے باوجود بڑے شاہ خرچ تھے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، مفتی صاحب فرمانے لگے "ان کے ہاتھ میں چھید ہے، اس لئے ان کے پاس پیسے نہیں رہتے۔"

مفتی صاحب کی یہ بڑی خدمت ہے کہ انھوں نے بہت سے اہل قلم کو جن کی علمیت کا آج علمی دنیا میں سکہ چلتا ہے، علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا لقی امینی،

پروفیسر خلیق احمد نظامی، مولانا بدر عالم میرٹھی، پروفیسر محمد مسعود احمد، مولانا رشید نعمانی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاضی اطہر مبارکپوری، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، ڈاکٹر ماجد علی خاں، مولوی محمد عبد اللہ طارق، مولانا حامد الانصاری غازی، کرنل خواجہ عبد الرشید، ڈاکٹر خلیفہ رضی اور بیسیوں دوسرے اہل قلم برہان کے ذریعہ دینی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں پوچھا "کیا حاجی صاحب بھی عالم ہیں؟" حضرت قاسم العلوم رح نے جواب میں ارشاد فرمایا "عالم ہونا کیا معنی، اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات بابرکات کو عالم گر بنایا ہے" یہی جواب مفتی صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ آج کوئی اسکالر بام شہرت پر پہنچ کر مفتی صاحب کے احسان کا انکار کرے تو یہ تحدیث نعمت کے منافی ہوگا۔

ایک بار مفتی صاحب دفتر برہان میں تشریف فرما تھے کہ اردو شاعری پر بات چل نکلی۔ انھوں نے انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک اجنبی آکر حضرت امام حسین رض سے کہتا ہے۔ ع

اظہارِ اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک

امام صاحب نے اجنبی کو جو جواب دیا اسے دبیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

دیکھیے دبیر نے اس مصرعے میں کتنی فاش غلطی کی ہے۔ اولاً یہ کہ حضرت امام عالی مقام ایک اجنبی سے اپنا تعارف کروا رہے ہیں۔ اس لئے اس میں عجز و انکسار کا اظہار ہونا چاہیے نہ کہ تعلّی۔ ثانیاً یہ کہ متکلم اپنے لئے واحد غائب

کا صیغہ "علیہ السلام" کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ اب دیکھیں انیس نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اب خود ہی اندازہ لگا لیں کہ انیسؔ نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ (یہ شعر پڑھتے وقت مفتی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو قدرے جھکایا اور یوں اپنے ایکشن سے پوری تشریح کر دی)۔ اس کے بعد انھوں نے انیسؔ کا یہ شعر پڑھا:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

پھر اس کی تشریح شروع کر دی کہ اوس اور شبنم میں کیا فرق ہے اگر یہاں اوس کی جگہ شبنم ہوتا تو شعر بے مزہ ہو جاتا۔ یہاں اوس لکھنا ہی مناسب تھا۔ انیسؔ نے شبنم کا استعمال ایک مصرع میں یوں کیا ہے:

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یہاں اگر شبنم کی بجائے اوس لکھتے تو شعر پھسپھسا ہو جاتا۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس موقع پر انھوں نے علم کے کتنے موتی لٹائے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ادیب چھپا ہوا ہے اور اگر موصوف علم دین کی طرف راغب نہ ہوتے تو ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا۔

ایک روز تصوف پر بات چل نکلی۔ میں نے عرض کیا "حضرت آپ کے والد ماجد تو بہت بڑے عارف باللہ تھے۔ آپ نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی"۔ مفتی صاحب

نے مسکراتے ہوئے فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ نجات کا واحد راستہ نہیں ہے اور بھی کئی راستے ہیں۔" میں نے عرض کیا کہ "آپ کے والد بزرگوار سے یہ سلسلہ آگے بھی چلا ہے؟" فرمانے لگے "مولوی اسحٰق صاحب میرٹھی اباجی سے بیعت تھے اور مولوی بدر عالم مولوی صاحب کے مرید تھے۔" میں نے مولانا محمد اسحٰق میرٹھی کے بارے میں زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ اب برہان کا مفکر ملت نمبر موصول ہوا تو یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ قاری محمد ادریس صاحب اُن کے پوتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آئی کہ قاری صاحب بلاناغہ شام کو جامع مسجد نئی دہلی سے واپسی پر کیوں مفتی صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ اگر مفتی صاحب موجود نہ ہوتے تو بھی قاری صاحب اس معمول میں فرق نہ آنے دیتے۔

مفتی صاحب کے جدِّ امجد حضرت شاہ فضل الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ دار العلوم دیوبند کے چھ بانیوں میں سے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ ان ہی کی دعوت پر دیوبند تشریف لائے تھے۔ مفتی صاحب کے والد بزرگوار حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں صاحب نسبت بزرگ تھے اور پورے ملک میں ان کا فتویٰ چلتا تھا۔ ان کے ایک چچا حضرت حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم اور بڑے دبدبہ والے بزرگ تھے۔ ان کے دوسرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمت و الرضوان پاکستان کے پہلے شیخ الاسلام، قائد اعظم کے معتمد ساتھی اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ مفسر و محدث تھے۔ ان کی شرح مسلم شریف اور حضرت شیخ الہند ؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم پر حواشی ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں قرارداد مقاصد، جس کی رو سے پاکستان کی قومی اسمبلی قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی،

کے محرک آپ ہی تھے۔ ان کے ایک چچا جناب مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی صاحب دل بزرگ تھے۔ اس کے باوجود مفتی صاحب نے ابنائے زمانہ کی طرح اپنے بزرگوں کی استخواں فروشی سے مکمل اجتناب فرمایا۔ اب تو یہ دستور چل نکلا ہے اور "صاحبزادے" اپنے ناموں سے پہلے ابن الفلاں لکھ کر اپنے بزرگوں کے نام سے روٹی کمارہے ہیں۔ مفتی صاحب نے مولانا جامیؒ کا کلام بغور پڑھا تھا اور مرحوم خوب جانتے تھے۔ ع

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

انھیں یہ معلوم تھا کہ اگر ابن الفلان ہونا ہی بڑے ہونے کی دلیل ہے تو کنعان اپنے نام سے پہلے ابن نوحؑ لکھ کر بڑا نہ ہو سکا۔ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ۔

مجھے مفتی صاحب دیوبندی حلقے میں واحد بزرگ نظر آرہے ہیں جنھوں نے اپنی "صاحبزادگی" سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی۔ مجھے یاد آیا۔ ملتان میں تحریک ختم نبوت کے زیر اہتمام سید عطاء اللہ بخاری علیہ رحمۃ الباری کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ مقررین میں ان کے فرزندان ارجمند سید ابوذر ابو معاویہ عطاء المنعم بھی تھے۔ جب ان کے تقریر کرنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے اعلان کیا، "حضرات اب آپ کے سامنے صاحبزادہ عطاء المنعم تشریف لاتے ہیں۔" سید عطاء اللہ بخاریؒ نے اناؤنسر کو مخاطب کر کے کہا، "بھائی، یہ میرا بیٹا ہے، صاحبزادہ نہیں، ابھی تو میرے نکاح کے گواہ بھی زندہ ہیں۔" اس سے اندازہ لگائیے کہ ہمارے اکابر "صاحبزادگی" کو کتنا معیوب سمجھتے تھے۔"

میں نے ایک بار مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم سے یہ سنا کہ مفتی صاحب کے والد محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ سکندرہ تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے اکبر بادشاہ کی قبر پر مراقبہ کیا تو فوراً گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے "بھاگو یہاں سے یہ تو عذابِ قبر میں مبتلا ہے۔" وقت گذرنے کے ساتھ میرے ذہن سے حضرت مفتی صاحب قبلہ کا نام محو ہو گیا اور میں نے یہ واقعہ حضرت مطلوب الرحمٰن عثمانی رح سے منسوب کر دیا۔ میں نے ایک بار یہ واقعہ مفتی صاحب کے سامنے بیان کرکے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے فرمایا "نہیں بھئی! یہ واقعہ تو خود اباجی کے ساتھ پیش آیا تھا۔"

حضرت مفتی شاہ عزیز الرحمٰن عثمانی رح روحانیت کے بڑے اونچے مقام پر تھے اور بڑی قوی نسبت رکھتے تھے۔ مفتی صاحب سے سنا ہے کہ جب ان کے جدامجد شاہ فضل الرحمٰن عثمانی رح کے وصال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے فرزند گرامی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رح سے کہا کہ وہ انھیں توجہ دیں۔ سعادتمند بیٹے نے اسے گستاخی پر محمول کیا لیکن والد بزرگوار کے اصرار پر ان کے پلنگ کے قریب ہو کر انھیں توجہ دی۔ اس پر شاہ فضل الرحمٰن نے فرمایا "الحمد للہ! میں دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا۔"

ایک بار میں دہلی گیا۔ "منارِ ہدا" ماضی قریب میں چھپ چکی تھی۔ مفتی صاحب نے ایک نسخہ یہ عبارت لکھ کر مجھے عنایت فرمایا "بگرامی خدمت برادرِ عزیز پروفیسر محمد اسلم صاحب، عتیق الرحمٰن عثمانی"۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم اپنے خوردوں سے کس طرح پیش آتے تھے۔

شیخ عبداللہ نے اپنے دور وزارت میں سری نگر میں مولانا انور شاہ کشمیری رح کے بارے میں سیمینار کروایا جس میں بھارت کے فضلاء بشمول حضرت قاری محمد طیب صاحب مرحوم ومغفور، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا احمد رضا بجنوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور جناب بدر الحسن قاسمی نے گراں قدر مقالے پیش کئے۔ حکومت کشمیر کے محکمۂ اوقاف نے ان مقالات کو "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے

شائع کر دیا۔ مجھے ان دنوں مولانا الکشمیریؒ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور یہ مولانا اکبر آبادی اور مفتی صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔ (جب مولوی انظر شاہ نے دیو بند ٹائمز میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا اکبر آبادی پر کھلے بندوں سب وشتم کیا تو یہ عقیدت ختم ہو گئی۔ میں نے ان کے بارے میں عبد الرحمٰن کوندوی ازہر شاہ، انظر شاہ، مولانا محمد انوری لائلپوری، مولانا حامد الانصاری غازی اور قاری محمد رضوان اللہ کی تصانیف جمع کر لی تھیں اور خود محمد بشیر نامی اسکالر سے تھیسیس لکھوایا تھا۔ تجلیاتِ انور حال ہی میں شائع ہوئی تھی اور پاکستان میں دستیاب نہ تھی۔ یہ کتاب ہنوز دلی کے تاجران کتب کے پاس بھی نہیں پہنچی تھی۔ میں جس روز لاہور روانہ ہونے والا تھا مجھے یہ کتاب مفتی صاحب کے کمرے میں پڑی ملی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ یہ کتاب مجھے دے دیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور وہ سری نگر سے دوسرا نسخہ بآسانی منگوا سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے بڑے سخت لہجے میں فرمایا "ہرگز نہیں"۔ مدتوں تک یہ معمہ لاینحل رہا کہ مفتی صاحب جیسے مشفق بزرگ نے، جو مجھے بیٹا اور داماد سمجھتے تھے، تجلیات انور دینے سے کیوں انکار کر دیا۔ اب بھی سوچتا ہوں تو اسے ان کی کتاب دوستی اور مولانا الکشمیریؒ سے عقیدت پر محمول کرتا ہوں۔

اب اتفاق دیکھئے کہ پاکستان پہنچنے کے چند روز بعد سری نگر سے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے لکھا کہ اسے ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر صاحبہ کی تصنیف "سید علی ہمدانیؒ" کی اشد ضرورت ہے۔ سری نگر سے قیمت کی ادائیگی ممکن نہیں۔ میں نے اسے لکھا کہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، میں مطلوبہ کتاب بھیج رہا ہوں، تم مجھے "تجلیاتِ انور" بھیج دو۔ یوں مجھے یہ کتاب مل گئی۔

ایک بار میں دیو بند میں تھا اور مفتی صاحب بھی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت

کی وجہ سے وہیں تھے۔ شام کے وقت میں عیدگاہ کی طرف نکل گیا۔ راستے میں ایک جوہڑ میں دو تین بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں اور بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ان کی رکھوالی کررہا تھا۔ اتنے میں اس کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے بیٹے کو بے نقط سنانی شروع کردیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دیہاتی کی زبان پر پنجابی کا بڑا اثر ہے۔ میں نے اس کا ذکر مفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے فرمایا "پنجاب کے قرب کی وجہ سے پنجابی زبان کا اثر اس علاقے کی بولی پر ہے اور یہاں تشدید بہت استعمال ہوتی ہے"

سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے میں ندوۃ المصنفین میں مقیم تھا۔ انہی دنوں دیوبند میں شوریٰ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور شاہ فضل اللہ شارح ادب المفرد علی گڈھ سے دہلی پہنچ گئے۔ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی بھی وقت مقررہ پر جامعہ ملیہ سے دفتر برہان میں تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ میں بھی اس قافلے میں شامل ہوگیا۔ ٹرین صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوئی۔ جب ٹرین میرٹھ پہنچی تو قاضی صاحب یہ کہہ کر اتر گئے کہ وہ اپنے گھر جارہے ہیں اور اس کے بعد جانے والی ٹرین سے دیوبند پہنچ جائیں گے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے چائے کی طلب تھی۔ میں نے چائے خریدی تو قاضی صاحب کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ اس چائے کی قیمت وہ ادا کریں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ نہیں میں اس کے دام ادا کروں گا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ میرٹھ ہے۔ یہ ان کا وطن ہے۔ اس لئے وہی اس کی قیمت ادا کریں گے۔ قاضی صاحب قیمت ادا کرکے تشریف لے گئے۔ مجھے چائے پیتا دیکھ کر مفتی صاحب اور شاہ صاحب نے بھی چائے پینے کا اظہار کیا۔ شاہ صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ میں لپک کر ان کے لئے چائے لے آیا۔ مولانا اکبرآبادی ضرورت سے زیادہ نفاست پسند

تھے، وہ انہیں مٹی کے آبخوروں میں چائے پیتا دیکھ کر کراہت کا اظہار کرنے لگے۔

میرٹھ سے ٹرین روانہ ہوئی تو مفتی صاحب سیٹ پر لیٹ گئے۔........

.... ایک جگہ ٹرین رکی تو آنکھیں کھول کر مجھ سے پوچھا۔ "میاں! کونسا اسٹیشن آیا ہے۔" میں نے نام بتایا تو فرمانے لگے "ابھی دیوبند پہنچنے میں دیر ہے۔" پھر ترتیب وار تمام ریلوے اسٹیشنوں کے نام گنوا دیئے جو راستے میں آتے تھے۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مفتی صاحب دیوبند میں تھے۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ نماز مغرب کے بعد قبلہ مفتی صاحب غائب پائے گئے۔ عشاء کے قریب تشریف لائے تو میرے استفسار پر فرمایا "جامع مسجد کے سامنے میرے ایک عزیز ہیں شاہد حسین، بڑے تعلق والے ہیں، ان کی بہن کا نکاح تھا۔ برات منگلور سے آئی تھی۔ ان کا یہ اصرار تھا کہ نکاح میں پڑھاؤں، اس لئے وہاں گیا تھا، ورنہ ایسی جگہوں پر میں کب جاتا ہوں۔ میں نے وہاں کھانا نہیں کھایا، تمہارے ساتھ اور مولوی سعید کے ساتھ کھاؤں گا۔" میں نے عرض کیا میں شاہد صاحب کو خوب جانتا ہوں، فرمایا، "وہ کیسے؟" میں نے عرض کیا ان کے ایک ماموں لاہور میں رہتے ہیں۔ شاہد صاحب کبھی کبھی لاہور جاتے ہیں تو مجھ سے بھی ملاقات رہتی ہے۔

دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر میں بھی دیوبند حاضر ہوا۔ امرتسر سے مجھے سہ پہر کے وقت جلتا ایکسپریس ملی جس نے رات کے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچایا۔ میں اسٹیشن سے ایک رکشا میں سوار ہو کر دار العلوم کے مہمان خانے پہنچا۔ صدر دروازہ کھٹکھٹایا تو مولوی شمیم مرحوم آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے مولانا اکبر آبادی کے بارے میں دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ

موصوف حسب معمول مہمان خانے میں قیام فرما ہوں گے۔ شمیم صاحب نے بڑی ترشروئی سے جواب دیا کہ مجلس شوریٰ کے تمام اراکین دفتر ناظم تعلیمات میں قیام پذیر ہیں۔ مہمان خانہ غیر ملکی مہمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں پوچھتے پوچھتے ناظم تعلیمات کے دفتر میں پہنچا۔ مدھم سی روشنی میں میں نے مولانا اکبر آبادی کو پہچان لیا۔ ان کے پاؤں کو ہلایا تو مرحوم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ معانقہ اور مصافحہ کے بعد فرمایا کہ برابر والا پلنگ میرے لئے مختص ہے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی، نیند بھلا کیسے آتی؟ ساڑھے چار بجے اذان ہوگئی۔ میں وضو کے لئے چلا گیا۔ واپس آیا تو تمام حضرات نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ قبلہ مفتی صاحب کو مصلیٰ امامت پر کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص دلسوز لہجے میں قرأت فرمائی۔ نماز اور دعا کے بعد میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے۔ "کب آئے؟" میں نے عرض کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔ فرمایا "اچھا کیا یہ تقریب بھی تمہارے دیکھنے کی چیز ہے۔" اتنے میں ایک ملازم نمکین بسکٹ اور چائے لے آیا۔ چائے پر مفتی صاحب کے علاوہ مولانا اکبر آبادی، قاضی زین العابدین سجاد۔ مولانا حکیم محمد زماں حسینی، مولانا عبدالحلیم گورینی والے اور مولانا منت اللہ رحمانی بھی موجود تھے۔ تین چار روز ان حضرات کے ساتھ دیوبند میں صحبت رہی۔

دیوبند جانے سے دو تین ماہ پہلے میری ملاقات مولانا عزیز گل اسیر مالٹا سے ان کے گاؤں "سخری" نزد سخا کوٹ (مالاکنڈ ایجنسی) میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کا انٹرویو لیا اور جب اس ملاقات کی روداد لکھنے بیٹھا تو اٹھارہ صفحے کا اچھا خاصہ مضمون تیار ہوگیا۔ دیوبند روانہ ہوتے وقت میں وہ مضمون اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے وہ مضمون مفتی صاحب کو دکھایا تو انھوں نے

وہ مجھ سے لے لیا اور یہاں کے اگلے شمارے میں ایک ہی قسط میں شائع کر دیا۔

ایک روز شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید اور حلقۂ دیوبند کے معمر ترین بزرگ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی، سابق صدر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، جنھیں مفتی صاحب کے والد بزرگوار سے بھی شرف تلمذ تھا، ناظم تعلیمات کے دفتر میں تشریف لائے۔ مفتی صاحب نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا "یہ بھی آپ کی طرح پروفیسر ہیں۔ اپنی کوئی تصنیف اگر ساتھ لائے ہیں، تو انھیں دیجیے۔ یہ تاریخ کے استاد ہیں۔" جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مجھے اپنی قیام گاہ میں لے گئے اور "قائد بدر واحد" اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے مرحمت فرمائی۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی تھے اور موصوف جمعیۃ العلماء ہند کے اس گروپ میں شامل تھے جو تقسیم ہند کا سخت مخالف تھا۔ میں نے ان کا ایک فتویٰ پڑھا ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے کا محتاج ہے اور ملک کی منفعت اسی میں ہے کہ یہ متحد رہے۔ جس طرح چکی، ترازو اور قینچی ناقابل تقسیم ہیں اسی طرح ہندوستان بھی ناقابل تقسیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں ان کا رویہ پاکستان کے بارے میں بڑا سخت تھا۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "جب پاکستان قائم ہوا تو میرے چچا مولانا شبیر احمد عثمانی رح کراچی چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے مجھے بلانے کے لئے بڑا زور لگایا اور کئی خط لکھے، لیکن میں نہ گیا۔ انھوں نے کسی مدرسہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ سال بھر تک میرے لئے خالی رکھا۔ آخر انھوں نے تنگ آکر مجھے لکھا کہ تم یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ میں نے جواب دیا۔ چچا جان آپ ہی نے ہمیں وہ حدیث پڑھائی تھی کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں نہ جانا چاہیے۔ یہ پاکستان طاعون

ہی تو ہے۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے خط لکھنا بند کر دیا۔ جب مفتی صاحب بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے آئے تو اس سفر میں کراچی جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بیوہ ان دنوں حیات تھیں موصوف اپنی چچی سے ملنے گئے۔ مفتی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "چچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چند روپے بھی دیئے۔" مفتی صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ابھی ان کے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔

ایک بار میں دفتر برہان میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں خان غازی بھی وہاں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ کہنے لگا، "میں سال میں ایک بار سیاسی کارکنوں کی میٹنگ بلایا کرتا ہوں اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب بھی اس "عرس" کے لئے کچھ رقم دے دیا کرتے ہیں۔" مفتی صاحب نے حسب معمول کچھ رقم اس کے حوالے کی اور وہ رخصت ہو گیا۔

برہان کے مفکر ملت نمبر میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے کہ جب علماء دیوبند نے تحریک ترک موالات کے زمانے میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کا فتویٰ دیا تو مولوی ظفر احمد تھانوی نے اس کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا کہ بدیشی مال خریدنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ دینی حلقوں میں اس فتویٰ کے خلاف ہیجان پیدا ہو گیا۔ دیوبند میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس فتویٰ کے خلاف غم و غصہ کا اظہار فرما رہے تھے لیکن دانستہ طور پر مفتی کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مفتی صاحب کی جوانی کا عالم تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت رندانہ سے کام لے کر بآواز بلند کہا "مولانا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ فتویٰ مولوی ظفر احمد تھانوی نے صادر کیا ہے، جن کے والد (عبداللطیف) عیسائی ہو گئے تھے۔" مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا۔ مفتی صاحب نے ایک سے زائد بار مجھ سے اس واقعہ

کا ذکر کیا ہے۔

مفتی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی ضرور تھے لیکن وہ غیر مسلم کانگرسی رہنماؤں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک بار خود ہی فرمانے لگے کہ ایک جلسے میں مرارجی ڈیسائی (وزیر اعظم مقرر ہونے سے بہت عرصہ پہلے) تقریر کر رہے تھے۔ مرارجی نے مسلمانوں کے خلاف کوئی بات کی تو مفتی صاحب فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "مرارجی اپنے الفاظ واپس لیں" انھوں نے انکار کیا تو مفتی صاحب نے فرمایا "آپ اپنے الفاظ واپس لیں ورنہ میں ابھی آپ کو بازو سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے اتار دوں گا۔" یہ تھی ان کی غیرت ایمانی کہ اپنے ایک دیرینہ سیاسی رفیق سے مسلمانوں کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکے۔

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی اور ڈانڈی مارچ کے زمانے میں مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مقیم تھے اور انھوں نے اس زمانے میں دو تاریخ ساز فتوے جاری کیے۔ اولاً یہ کہ جس سیاسی کارکن کی جائداد بحق سرکار ضبط کی جائے کسی شخص کے لیے اس کا خریدنا شرعاً حرام ہے۔ ثانیاً یہ کہ پانی، نمک اور گھاس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی منفعت سب کے لیے یکساں ہے۔ اسی زمانے میں مولانا انور شاہ کشمیری رح نے بھی ایک حدیث سے یہی استدلال کیا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کو مفتی صاحب کے فتوی سے بڑی تقویت ملی اور یہی فتوی گاندھی جی کے ساتھ ان کے تعارف کا سبب بنا۔ مفتی صاحب کو اپنی حق گوئی کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی اور کارکنانِ مدرسہ نے انھیں استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔

ایک مرتبہ میں جولائی میں لاہور سے علی گڑھ گیا اور چند روز میں رمضان شروع

ہوگیا۔ علی گڑھ میں تو میں باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھتا رہا اور رات کو تراویح میں بھی شریک ہوتا رہا۔ علی گڑھ سے دہلی گیا تو روزے ترک کر دیئے۔ میرا قیام بھی حسب معمول دفتر برہان میں تھا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "مسافر کو رخصت ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ سفر میں روزے ترک کر دیئے۔ ورنہ بہت تکلیف ہوتی۔" برادر گرامی عمید الرحمٰن دفتر برہان کے اس برآمدے میں جہاں مفتی صاحب کی نشست ہوا کرتی تھی، رات کو میرے لئے پلنگ بچھا دیتے۔ میں بستر پر دراز تھا کہ مفتی صاحب نماز تراویح سے فارغ ہوکر تشریف لائے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "کیوں میاں ناشتہ کس وقت کرو گے؟ آٹھ بجے ٹھیک رہے گا؟" میں نے عرض کیا کہ حضرت میں روزہ نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ روزہ خور کو ناشتہ کرائیں۔ اس پر فرمانے لگے "میاں تم مسافر ہو۔ تمھیں رخصت ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آخر ناشتہ تو کہیں کرو گے، پھر یہیں کر لینا۔ اگر سحری کے وقت چائے پینا پسند کرو، تو میں لے آؤں۔" میں نے بصد عجز معذرت چاہی اور بڑی مشکل سے انھیں ناشتہ لانے سے باز رکھا۔ مرحوم بار بار فرماتے تھے "میاں تمھیں رخصت ہے۔ جب رخصت ملے تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ خواہ مخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

یہ ان کی وسیع القلبی اور تفقہ فی الدین کی بہترین دلیل ہے۔ ان کی جگہ اگر کوئی عالم دین ہوتا تو روزہ خور مسافر کو گھر سے نکال دیتا اور یہاں ناشتہ لانے پر اصرار ہو رہا تھا۔ اللہ اکبر۔ کیسے لوگ تھے یہ۔ ع

اب ڈھونڈو انھیں چراغ رخ زیبا لے کر

مفتی صاحب کی حیات میں میں پندرہ سولہ مرتبہ دہلی گیا ہوں گا۔ دہلی میں قیام ان ہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ ایک بار میں ہوٹل میں ٹھہر گیا تو بہت ناراض ہوئے

اور اگلے روز میرا سامان دفتر برہان میں منگوا لیا۔ موصوف ہمیشہ کھانے پر اصرار کرتے۔
میں عرض کرتا کہ میں چند روز کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مجھے بہت جگہ جانا ہے۔
اس لئے کھانے کے وقت اپنا پروگرام درمیان میں چھوڑ کر یہاں آنا ہوگا۔ اس
لئے یہ پابندی میرے لئے مشکل ہے۔ اس پر بھی ایک بار شاندار ضیافت کرتے۔
ان کی صاحبزادی منیبہ خاتون، جنھیں ہم منی آپا کہتے ہیں، کئی طرح کے کھانے
تیار کرتیں۔ مفتی صاحب مجھے دفتر سے اپنے گھر لے جاتے، منی آپا کا سلام پہنچاتے۔
کھانا شروع ہوتا تو اصرار کر کے مختلف چیزیں کھلاتے۔ ایک بار سیخ کباب بھی
دستر خوان پر موجود تھے۔ کبابوں کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے فرمایا "میاں!
یہ مسیتا کبابی کے ہاں سے منگوائے ہیں۔ میرٹھ کا رہنے والا ہے اور بڑا عمدہ
کباب بناتا ہے۔ میں نے ہی اصرار کر کے اسے یہاں رکھا ہوا ہے۔ ذرا چکھ کر
دیکھو۔" صبح ناشتے کے وقت گھر سے چائے، مکھن توس اور انڈہ لاتے، مٹیا محل
سے پوریاں اور حلوہ منگواتے اور پھر اصرار کر کے کھلاتے۔ اگر میں عرض کرتا کہ
آپ بھی کچھ لیجئے تو فرماتے "میں بہت صبح ناشتے سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ یہ
تمھارے لئے ہے۔"

وفات سے چند ماہ پہلے میں دہلی گیا۔ حسب معمول ندوۃ المصنفین میں قیام
کیا۔ گھر پر ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے تپاک سے
ملے۔ گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں عمید میاں اور ایک اور صاحب،
جن کا نام اب یاد نہیں پڑتا، انھیں ایکسر سائز کرانے لگے۔ میں پاس بیٹھا تھا
فرمانے لگے "اب میں اچھا ہو رہا ہوں۔ ذرا سی کمزوری باقی ہے۔" میں نے تسلی
دیتے ہوئے عرض کیا کہ یہ بھی جاتی رہے گی۔ اتنے میں پتہ نہیں جی میں کیا آیا فرمانے
لگے "کل شام کا کھانا یہیں کھا لینا۔" میں نے عرض کیا حضرت کھانا تو بہت کھایا

ہے۔ آپ تندرست ہوجائیں، پھر کھالیں گے۔ میں تو آتا ہی رہتا ہوں۔" فرمانے لگے "پھر کیا ہوا۔ آخر کہیں تو کھانا کھاؤ گے، یہیں کھالینا۔" ان کے اصرار پر میں نے حامی بھرلی۔ اگلے روز شام کو میں کھانے پر حاضر ہوا۔ اپنے پلنگ کے قریب ایک کرسی پر مجھے بٹھایا اور میز پر کھانا چنوایا۔ میں کھانے بیٹھا تو فرمانے لگے "میاں تکلف سے کام نہ لینا۔" میں جتنی دیر وہاں رہا، بڑی شفقت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔

میں احباب کے لئے تحائف لے گیا تھا۔ ان میں ریشمی جاپانی کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس سے ایک زنانہ قمیص تیار ہوسکتی تھی۔ میں نے وہ کپڑا مفتی صاحب کو تھماتے ہوئے کہا "یہ ریحانہ نے منی آپا کے لئے بھیجا ہے۔" مفتی صاحب نے وہ کپڑا منی آپا کو بھجوا دیا۔ اگلے روز ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے "وہ کپڑا بہت عمدہ ہے۔ منی نے شکریہ ادا کیا ہے"۔ میں نے عرض کیا اس میں بھلا شکریہ کی کیا بات ہے، میں کئی بار مفتی صاحب کے لئے چائنا کے بنے ہوئے پن (قلم) جو پاکستان میں بارہ تیرہ روپے میں مل جاتا ہے، لے گیا۔ انھوں نے ہمیشہ اسے استعمال کیا۔

چند روز بعد میری اہلیہ بچوں کے ہمراہ دہلی گئیں۔ قیام غالباً شمسی کا ٹیج چوڑی والان میں جناب عبدالقدیر کے ہاں تھا۔ ایک روز مفتی صاحب کی عیادت کو حاضر ہوئیں۔ مفتی صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور منی آپا سے کہنے لگے "منی ذرا خیال رکھنا یہ میرے نواسے نواسیاں ہیں، خالی ہاتھ نہ جائیں۔" میری اہلیہ نے عرض کیا "تایا جان رہنے دیجئے۔ آپ پہلے تندرست ہوجائیں پھر دیکھا جائے گا۔ اتنا روپیہ علاج پر اٹھ رہا ہے۔" فرمانے لگے۔ یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ یہ بچے ہیں، ان کا خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔" منی آپا سو روپے کا نوٹ

لے کر آئیں اور مفتی صاحب نے اپنے ہاتھوں سے یہ رقم بچوں کے لئے دی۔

ایک روز مفتی صاحب کسی کام کی غرض سے دیوبند روانہ ہونے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ جب موصوف دیوبند جاتے ہیں تو وہاں نماز قصر ادا کرتے ہیں؟ اس پر فرمایا "میں دیوبند کو اپنا وطن سمجھتا ہوں، دہلی میرا دوسرا وطن ہے، ابھی تک میں نے دیوبند کی سکونت ترک نہیں کی، اس لئے وہاں قصر نماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

میں بھارت کے ہر سفر میں ایک پہاڑی مقام ضرور دیکھتا تھا۔ ایک بار مفتی صاحب فرمانے لگے "کبھی چکروتہ بھی ہو آتے"۔ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا تھا اس لئے اس کا محل وقوع دریافت کیا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے "سہارنپور سے راستہ جاتا ہے۔ جب مولانا حفظ الرحمن بیمار ہوئے تو بحالی صحت کے لئے کچھ عرصہ کے لئے مرحوم چکروتہ چلے گئے تھے۔ میں اور مولوی سعید بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں جانے والے راستے میں بڑے چکر آتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام چکروتہ یعنی "چکر آتا" پڑ گیا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب برہان کا مفکر ملت نمبر نکلنے والا تھا تو برادرم عمید الرحمن کی تاکید اکید کے باوجود میں مفتی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ میں کئی بار کاغذ اور قلم لے کر بیٹھا لیکن ہر بار بے کیف ہو کر اٹھ گیا۔ اب ان کے بارے میں اپنے مشاہدات و تاثرات لکھنے بیٹھا تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا ذہن میں پردۂ سکرین کی طرح فلم چل رہی ہے اب ان کی زندگی کے مختلف گوشے میرے سامنے آرہے ہیں۔ اب اس مضمون کو سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔

مفتی صاحب ایسے نابغۂ روزگار بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

عمرہا باید تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

اب وہ سانچے ہی نہیں رہے جن میں ان بزرگوں کی سیرت اور کردار ڈھلے تھے۔ جیسے بلند پایہ اساتذہ انھیں میسر آئے تھے اب ان کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ جس ماحول میں ان بزرگوں نے آنکھیں کھولی تھیں اب ویسا پاکیزہ ماحول کیسے میسر آسکتا ہے۔ مفتی صاحب اپنی سیرت و کردار کے انمٹ نقوش جریدۂ عالم پر ثبت کر کے جوار رحمت میں ابدی نیند جا سوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس حد تک ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

دفتر برہان موجود ہے۔ برہان ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ المصنفین قائم و دائم ہے۔ وہ کرسی جس پر مفتی صاحب بیٹھا کرتے تھے ہنوز اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی ہے۔ دفتر کا عملہ بھی موجود ہے لیکن صاحب خانہ موجود نہیں۔ انھوں نے ایک تعزیتی جلسے میں نظیر اکبرآبادی کا یہ شعر پڑھا تھا۔ میں اسی شعر پر مفتی صاحب کا ذکر خیر ختم کرتا ہوں ؎

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم

شیخ القراء قاری عبدالواحد رامپوریؒ

جناب محمد نظر علی خاں، سفارت خانہ کویت، نئی دہلی

آج سے تقریباً ۷۵ سال قبل رام پور کے افق پر ایک ستارہ طلوع ہوا تھا، اور بتاریخ ۸ر اپریل ۱۹۸۶ء رام پور ہی میں غروب ہو گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

قاری عبدالواحد (عرف قاری چھٹمن) ابن حمید اللہ مرحوم محلہ خرادیان، متصل دو محلہ روڈ، رامپور (سابق ریاست) کے رہنے والے تھے، بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور نابینا بھی۔

میرے والد مرحوم میر منشی شوکت علی خاں صاحب ڈپٹی سکریٹری اجلاس ہمایوں کے مکان کے متصل قاری صاحب کی والدہ مع اپنے بچوں کے رہتی تھیں، والد مرحوم کو وہ بھائی کہتی تھیں، اور مثل اپنے حقیقی بھائی کے جانتی تھیں، ہم لوگ انھیں پھوپو کہتے تھے، اسی باعث قاری صاحب اور ان کے بھائی میرے والد کو ماموں کہا کرتے تھے، والد مرحوم اُن کے اور اُن کے بیٹوں کے ساتھ بہن بھانجوں

ہی جیسا سلوک کرتے تھے۔

قاری صاحب مرحوم بچپن ہی سے خوش آواز تھے۔ چنانچہ بچپن میں میری والدہ مرحومہ بھی ان سے نعت ومنقبت کے اشعار سنا کرتی تھیں، اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی ریاست کے فرماں روا رامپور کے مشہور رئیس و وزیرِ قانون قمر شاہ خاں صاحب کے ہمراہ مدرسہ عالیہ تشریف لائے، مجھے (قاری صاحب کو) تلاوتِ قرآنِ کریم کے لئے بلایا گیا، جب میں نے تلاوت کی تو قمر شاہ خاں صاحب زار زار روتے تھے، اور مجھے انعام میں دونوں نے اپنی جیب سے خاصی رقم بھی عنایت فرمائی۔

ابتداء میں قاری صاحب نے قرآنِ کریم محلّے میں حافظ اسماعیل صاحب سے حفظ کرنا شروع کیا۔ اور اسی زمانے میں مدرسہ غوثیہ (رام پور کی مشہور درسگاہ مدرسہ عالیہ کی شاخ) میں داخل ہوئے اور وہاں بھی قرآن شریف حفظ کیا۔ اس کے بعد قرارت وتجوید کی تعلیم قاری خلیل الرحمان ساکن نواکھالی، استاذِ قرارت مدرسہ مطلع العلوم رامپور سے حاصل کی اور مختلف لہجات قرارت بھی ان ہی سے سیکھے۔ قاری خلیل الرحمان صاحب نہایت خوش الحان تھے۔

اسی دوران قاری صاحب نے مشہور قاری عبدالرحمان خاں صاحب رامپوری (فرزند شیخ القرارۃ والتجوید علی حسین خاں صاحب) کو پورا قرآن شریف سنایا اور اُن ہی سے تکمیل قرارت وتجوید کی۔

مشہور درس گاہ مدرسہ فرقانیہ میں قاری محمد نظر صاحب سے قرارتِ قرآنِ کریم کی مشق کی۔

تکمیل حفظ وقرارت کے بعد مسند تدریس کلام اللہ پر مدرسہ مطلع العلوم رامپور میں فائز ہوگئے۔

دورانِ تدریس قاری عبدالواحد صاحب بھوپال بھی گئے، اور کچھ عرصے وہاں رہ کر قاری محمود صاحب مکیؒ صدر مدرس قرارت وتجوید مدرسہ علیدیہ بھوپال کو قرآن شریف سنایا اور ان سے سند قرارت حاصل کی۔

قاری محمود صاحب، قاری صاحب کی قرارت و خوش الحانی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم والیِ بھوپال سے قاری صاحب کی ملاقات کرائی، نواب صاحب نے قاری عبدالواحد صاحب سے قرآن شریف سنا اور بہت محظوظ ہوئے اور کرایہ آمد و رفت بھوپال کے نام سے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔

قاری عبدالواحد صاحب نے دیوبند میں بھی تقریباً چار ماہ رہ کر ہندوستان کے مشہور قاری اُستاذ القراء حضرت مولانا قاری حفظ الرحمان ؒ صدر شعبۂ قرارت و تجوید دار العلوم دیوبند کو پورا قرآنِ عظیم سنایا اور اُن سے بھی سند حاصل کی۔ قاری حفظ الرحمان صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے سند کے آخر میں تحریر فرمایا تھا کہ "قاری عبدالواحد صاحب اپنے فن میں بے مثل ہیں" اور آخر میں قاری صاحب نے رامپور کے مشہور قاری علی محمد صاحب سنبھلی کو پورا قرآن شریف سنایا اور اُن سے بھی سلسلۂ پانی پت کی سند حاصل کی۔

آغاز ہی میں تحریر کر چکا ہوں کہ قاری عبدالواحد نے سب سے پہلے مدرسہ مطلع العلوم میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد مشہور عالم دین مولانا عبدالوہاب خاں صاحب ؒ کے مدرسے جامعۃ المعارف میں قرارت قرآنِ کریم کے مدرس مقرر ہوئے، پھر مدرسۂ پنجابیان گھیر مردان خاں میں صدر شعبۂ قرارت و تجوید کے عہدے پر کام کیا۔

کچھ عرصے قاری صاحب نے مسجد گھیر غلام ناصر خاں دو محلہ میں، اور منشی

عبدالمجید صاحب قریشی مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ گلشنِ بغداد میں، نیز سید امجد میاں صاحب کے قائم کردہ مدرسے (محلہ پیلا تالاب) میں بھی تدریس تلاوت و تجوید کلام اللہ کے تبرکات تقسیم کئے۔

کئی سال تک سہ پہر کے وقت، جماعت اسلامی رام پور کی درس گاہ میں بھی تدریسِ قرآنِ عظیم کا اشتغال رہا، درس گاہ کے بہت سے طلبہ جو آج کل مراتبِ عالیہ پر فائز ہیں آپ سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں۔

دورانِ تدریس مدارس مذکورہ، قاری صاحب اپنے گھر پر صبح و شام محفلِ درسِ کلام اللہ سجاتے تھے، جس سے مقامی و بیرونی تشنگانِ قرارت کلامِ الٰہی سیراب ہوتے تھے۔

عمر کے آخری دور میں اپنے گھر پر اپنے قائم کردہ مدرسہ عاصمیہ تجوید القرآن میں قرارت کلام اللہ کا درس دیتے ہوئے اعظم و اکبر سے جا ملے۔ تغمدہ اللہ بفسیح جنّاتہ۔

رامپور میں قرارت و تجوید کا چرچا شیخ القرار حضرت مولانا قاری علی حسین خاں صاحبؒ رامپوری (شاگرد امام القرار قاری عبدالرحمان محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ) کی ذات بابرکات سے ہوا۔

قاری علی حسین خاں صاحب کے علاوہ دیگر قرار کرام خصوصاً خاندانِ مجددیہ کے بعض افراد مثلاً قاری محمد اسماعیل صاحب مجددیؒ وغیرہ بھی مسندِ درس قرارت و تجوید پر فائز ہوئے اور اس فن شریف میں کمال پیدا کیا، جن سے اہل رامپور مستفید ہوئے۔

نامناسب ہو گا اگر اس بابرکت سلسلے میں جناب قاری عبدالحق خاں صاحب مدظلہٗ رامپوری حال مقیم کراچی پاکستان کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف کا لحنِ داؤدی

اور ایسی بلند آواز کے ساتھ قراءت کہ باید و شاید، رام پور والوں کو آج بھی یاد ہے۔ آپ سے بھی اہلِ رامپور نے کافی استفادہ کیا۔ لیکن رامپور میں جس قدر فروغ و اشاعتِ تجوید قرآنِ کریم قاری عبدالواحد صاحب کی ذات سے ہوا، اتنا کسی اور سے نہیں ہوا۔

قرآنِ کریم تجوید کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، بعض حروف کی غلط ادائیگی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے بقدرِ ضرورت قرآنِ کریم (یعنی جتنا قرآن شریف نماز میں پڑھا جاتا ہے) صحیح پڑھنا بہت ضروری ہے اور لحنِ جلی حرام ہے۔ خصوصاً ائمۂ مساجد کے لئے اس کتابِ عظیم کی تلاوت تجوید کے ساتھ اشد ضروری ہے، اور ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جو قرآنِ کریم غلط پڑھتا ہو، صحیح نہیں ہے۔

قاری عبدالواحد صاحب کے میدانِ قراءت و تجوید میں ورود سے قبل عام طور پر رام پور کے گھروں میں قرآن شریف صحیح طور پر پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی اِلا ماشاء اللہ۔ اور مساجدِ رامپور میں بھی بالعموم صحتِ تلاوتِ کلام اللہ کا اہتمام نہیں تھا۔ یہ قاری صاحب کی بشدت کوشش تھی جس نے لوگوں کو قرآن شریف صحیح پڑھنے کی طرف متوجہ کیا۔ قاری صاحب کا نہایت شدت و غصے سے یہ فرمانا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کی ادائیگی صحیح مخارج کے ساتھ نہ کرنا سخت گناہ ہے، مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ کہتے وقت اُن کے چہرے کی کیفیت، اور غصے سے اُن کے چہرے کا سُرخ ہو جانا، گویا آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

قاری صاحب کی سچی تلخ گفتاری اور جد و جہد کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ قرآنِ کریم صحیح پڑھنے لگے، اور اپنے بچوں کو بھی قرآن صحیح طور پر تجوید کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرنے لگے، نیز مساجد میں ایسے ائمہ کا تقرر ہونے لگا

جو قرآنِ کریم صحیح پڑھتے ہوں۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم حروف کی ادائیگی بہت عمدہ طور پر مخارج و صفات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے تھے۔ کثرتِ مشق سے صحیح ادائیگی پر آپ کو ایسی قدرت اور اس کی ایسی مزاولت ہوگئی تھی کہ اگر آپ سوتے میں بھی قرآن شریف پڑھتے تو صحیح ہی پڑھتے۔ حرف ضاد (ض) جس کا صحیح طور پر ادا کرنا دشوار ہے، جب آپ ادا کرتے تھے تو آپ کے مخالفین بھی کہتے تھے کہ یہ تو اسی طرح ادا کررہے ہیں جیسے ہم چاہتے ہیں، اور اس طرح اس حرف کی ادائیگی صحیح ہے، البتہ ان کے شاگرد اس حرف کو صحیح ادا نہیں کرتے، حرف ظاء سے بہت مشابہ کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کثرتِ مشق اور ریاضت کی وجہ سے آپ اس قدر عمدہ ادا کرتے تھے کہ وہ لوگ (مخالفین) سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آپ نے کیسے ادا کیا، جس پر آپ مسکراتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں تو وہی ادا کرتا ہوں جسے صحیح سمجھتا ہوں اپنی رائے کے مطابق۔

قاری صاحب کا لہجہ اس قدر مؤثر تھا اور آپ اس قدر خوش الحان تھے کہ ایام جوانی میں اور ادھیڑ عمر تک جب بھی آپ قرآن کریم پڑھتے تھے لوگوں پر گریہ طاری ہوجاتا تھا اور سننے والے بیخود ہوجاتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ صبح کے وقت دو محلہ روڈ پر آپ اپنی بیٹھک میں بنگالی و منی پوری طلبہ کو قرآن شریف پڑھا رہے ہیں اور راہ گیر قاری صاحب مرحوم کی قرارت سن کر سڑک پر رک گئے ہیں اور ذوق وشوق سے معجز قرآن کی معجز قرارت سماعت کررہے ہیں اور جھوم رہے ہیں۔ ایک مرتبہ گھیر مردان خاں میں تراویح میں قرآنِ کریم کی تلاوت کررہے تھے کہ اُدھر سے رامپور کے ایک مشہور مجذوب صفت حافظِ کلامِ اقبال واجد الدین احمد خاں کا گذر ہوا، وہ ٹھہر گئے اور جھومنے لگے

اور والہانہ انداز میں کہنے لگے ، معلوم ہوتا ہے نزولِ قرآن ہو رہا ہے۔ آخری دور یعنی کبر سنی میں گو آواز پہلے جیسی نہیں رہی تھی لیکن بلحاظِ فن یکتائے روزگار تھے۔

ایک زمانے میں حرفِ ضاد (ض) کی ادائیگی کے قضیئے کے سلسلے میں قاری صاحب نے پوسٹر بھی شائع کئے تھے ، اور ان کے خلاف بھی پوسٹر شائع ہوئے تھے ، قاری عبدالواحد صاحب کا موقف تھا کہ حرف (ض) مشتبہ الصوت بالظاء ہے نہ کہ بالدال ، کیونکہ بہ لحاظِ صفات یہ حرف (ظ) سے مشترک ہے نہ کہ (د) سے۔ علاوہ ازیں اس حرف کو "اصعب الحروف" کہا گیا ہے ، اور دال (د) سے تشابہ کی صورت میں نہایت آسانی سے ادا ہو جاتا ہے ، البتہ تشابہ بالظاء کی صورت میں ادائیگی میں دشواری ہوتی ہے۔ قاری صاحب اپنے اس موقف کی دلیل میں کتبِ قراءت و فقہ کی عبارتیں پیش فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ یاد آ گیا۔

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے شیخ ، شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ جس عمدگی سے حرف ضاد (ض) ادا فرماتے تھے ، ہم سے ادا نہیں ہو سکا۔ غرض کہ اس مسئلہ کے قضیہ میں میدان قاری عبدالواحد صاحب کے ہاتھ رہا۔

قاری صاحب نمازِ تراویح میں پورا قرآن شریف ختم کرنے کی صورت میں بسم اللہ بالجہر کے قائل تھے اور سختی سے اس پر عمل پیرا تھے۔ ایک چھوٹا سا کتابچہ بھی "مسئلہ تسمیہ" کے نام سے آپ نے اس مسئلے پر شائع کیا تھا۔

قاری صاحب مرحوم کے مزاج میں تیزی تھی ، اور جلد ہی غصے سے بپھر جاتے تھے۔ کبھی کبھی سب و شتم بھی کرتے تھے۔ آپ کے ایک افغانی

شاگرد مولوی شیر بہادر، جو موتی مسجد (رام پور) میں امام تھے، کہتے تھے کہ قاری صاحب آپ اسی زبان سے جس سے تلاوتِ کلام اللہ کرتے ہیں، سب وشتم بھی کرتے ہیں۔ جواباً قاری صاحب فرماتے تھے کہ مولانا کیا کروں، ناشائستہ واقعات سُن کر دل کڑھتا ہے، آنکھیں نہیں ہیں ورنہ ہاتھوں کا استعمال کرتا۔ لیکن یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ وہ دل کے صاف تھے۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے قاری صاحب "وہابی" مشہور تھے، لیکن اس کے باوجود چشتی بزرگ حضرت مولانا سید غلام محی الدین صاحب سے (جن سے قاری صاحب بیعت تھے) اور اپنے پیر کے پاس ان کی وفات تک آمد ورفت رکھی اور وفات کے بعد بھی اُن کے صاحبزادے سید جمیل میاں صاحب چشتی نظامی، جو قاری صاحب کے شاگرد بھی ہیں، کے پاس آتے جاتے رہے۔ مرشد بھی قاری صاحب سے محبت کرتے تھے، اور اپنے صاحبِ کمال مرید کی تکریم کرتے تھے۔

موجودہ دور کے علماء میں قاری صاحب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا سید عبدالدائم جلالیؒ سے زیادہ متاثر تھے۔

قاری صاحب موزوں طبع ہونے کے باعث کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے بالخصوص نعت ترنم سے پڑھتے تھے۔

مدرسہ مطلع العلوم کے مدرسی کے زمانے کا ایک واقعہ قاری صاحب اس طرح سناتے تھے کہ میرے ایک شناسا مولانا محمد قمر صاحب ولایتی، سُوات کے رہنے والے نہایت صالح آدمی تھے، بیرون شہر ایک مسجد میں (جو رضا انٹر کالج کی تأسیس کے بعد اس کے احاطے میں آگئی ہے) قیام پذیر تھے، اور اسی غیر آباد مسجد میں امامت بھی کرتے تھے، میں ان کے پاس آمد ورفت رکھتا تھا، ایک روز

مجھ سے مولانا قمر صاحب نے کہا، کہ دو جوان جو قوم اجنہ میں سے ہیں، آپ سے قرآن شریف پڑھیں گے، لیکن دو شرطوں کے ساتھ، پہلی شرط یہ ہے کہ آپ انھیں مدرسے کے اوقات میں نہیں پڑھائیں گے، بلکہ ایک بجے کے بعد جب طلبہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے تب انھیں پڑھائیں گے۔ دوسرے آپ اُن سے کسی قسم کا سوال ان کے جن ہونے سے متعلق نہ کریں گے۔ قاری صاحب نے ان دو شرطوں کو مان کر ان کو پڑھانا شروع کردیا۔ ایک ماہ تک تو قاری صاحب اپنے مزاج کے خلاف خاموشی سے ان کو پڑھاتے رہے، اس کے بعد قاری صاحب سے صبر نہیں ہو سکا، اور ایک روز ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا کہ کیا بات ہے کہ جب تم میرے قریب بیٹھتے ہو تو مجھے شدید گرمی محسوس ہوتی ہے، اور جب تم چلے جاتے ہو تو گرمی ختم ہو جاتی ہے، کیا تم جن ہو؟ حالانکہ قاری صاحب کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ دونوں جن ہیں، لیکن قاری صاحب بھی اپنے غصے اور تیزیٔ مزاج میں مثلِ جن تھے، اس لئے غیر ارادی طور پر انھیں جن کہدیا۔ ان دونوں نے مولانا محمد قمر صاحب کو یہ واقعہ سُنا کر اُن سے شکایت کی۔ قمر صاحب نے قاری صاحب کو بلا کر ان سے معلوم کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا، جبکہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس امر کا اظہار کہ وہ جن ہیں، نہیں کریں گے، قاری صاحب نے کہا کہ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل گیا، جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، اس پر قمر صاحب نے کہا کہ آئندہ وہ دونوں آپ کے پاس نہیں جائیں گے، اور آپ کو میرے تعلق کی وجہ سے ایذا تو نہیں دیں گے لیکن آپ کو قراءت قرآن عظیم کی تکمیل کے بعد جو فائدہ ان دونوں سے پہنچتا وہ بھی ختم ہو گیا۔

قاری عبدالواحد صاحب مرحوم مغفور اپنے شاگردوں کی تعداد سنہ ۱۹۷۶ء میں یعنی اپنے انتقال سے دس سال قبل مجھے اس طرح بتاتے تھے۔

دس ہزار طلبہ نے بقدر ما یجوز بہ الصلوٰۃ قرآن کریم پڑھا۔

دو ہزار طلبہ نے قرآنِ کریم مکمل ناظرہ پڑھا۔

اور دو سو پچیس طلبہ نے پورا قرآن کریم حفظ کیا۔

اس تعداد میں آخری دس سال (۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۶ء) کے طلبہ شمار نہیں کئے گئے ہیں۔ اللہ اکبر اس سے بڑی نعمت اور کامیابی کیا ہوگی کہ اس قدر کثیر تعداد کو سب سے عظیم کتاب قرآنِ کریم صحیح طور پر پڑھنا سکھا دی۔

چند مشہور شاگردوں کے نام ذیل میں مندرج ہیں، جن میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے پورا قرآن شریف پڑھا، اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے قاری صاحب سے چند پارے یا چند سورتیں قرآنِ کریم کی پڑھیں اور اُن کی تصحیح کی:

قاری احمد الزماں صاحب صدیقی بینائی، قاری عبدالرحمان صاحب جے پوری، قاری خلیل میاں صاحب مجددی، قاری سردار خاں صاحب بریلی، قاری صولت علی، قاری خالد شمسی، قاری مختار احمد شمسی، مولوی قاری ریاض الدین خاں صاحب، مولوی قاری عرفان صاحب شمسی مقیم قطر، قاری طفیل صاحب، قاری وقار احمد شمسی، قاری زبیر احمد شمسی، مولوی قاری محمد حسین شمسی، حافظ مقبول صاحب، مولوی قاری فضل الرحمان صاحب مجذوب فرزند مولانا رفیق صاحب مرحوم، جناب مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند، جناب نجات اللہ صدیقی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ، جناب مختار علی خاں فرزند حضرت مولانا اقتدار علی خاں عرشی مرحوم، جناب مزمل حسین صدیقی، جناب مدثر حسین صدیقی، ڈاکٹر مولوی ماجد علی خاں صاحب ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب حافظ اشتیاق علی خاں صاحب کینیڈا، جناب قاری راشد مجددی ناظم شعبۂ قرارت مدرسہ عالیہ، جناب محمد ارشاد علی خاں

مدرس ذو الفقار ہائی اسکول و برادر مضمون نگار اور مضمون نگار محمد نظر علی خاں۔

قاری صاحب کی نماز جنازہ درس گاہ جماعت اسلامی رام پور میں سید جمیل میاں صاحب فرزند مولانا غلام محی الدین صاحب کی اقتدار میں ادا کی گئی، اور تدفین سید جمیل میاں کے ایما پر پیر و مرشد کے مزار کے متصل محلہ احاطہ (جو ہاتہ کے نام سے مشہور ہے) رام پور میں ہوئی۔

قاری صاحب کی زندگی کے دو پہلو تھے جو بعد از وفات بھی نمایاں رہے۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

احسان کی روش

(قرآن کی روشنی میں)

از جناب محمد بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پٹنہ

ایمان لانے کے دو تقاضے ہیں۔ ایک تقویٰ کی روش اختیار کرنی اور دوسرا احسان کی۔ اول الذکر کا تعلق دل سے ہے اور موخر الذکر کا عمل سے۔ جو دل خدا کے خوف سے خالی ہے وہ تقویٰ سے خالی ہے اور جس عمل میں نیکی اور خیر کا پہلو نہ ہو وہ کفر کے مترادف ہے۔ تقویٰ اور احسان اطاعتِ الٰہی کے لازم وملزوم پہلو ہیں اور یہی ایمان کے سکے کے دو رُخ ہیں۔ یہی دونوں ایک مومن کو اللہ سے قریب کرتے ہیں۔ فرمایا:

> "اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ)"
>
> ——— (۱۶ : ۱۶)

قرآن کا نزول عام انسانوں کے لئے ہے مگر اس سے ہدایت وہی پاتے ہیں

یا پا سکتے ہیں جو تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ ارشاد ہے:

"یہ (قرآن) اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے (ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ)" ——— (۲:۱)

"یہ کتاب حکیم (قرآن) کی آیات ہیں۔ ہدایت اور رحمت نیکوکار لوگوں کے لئے (ھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّلْمُحْسِنِیْنَ) ——— (۳۱:۱)

احسان لفظ حُسن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو اپنی پوری قابلیت اور صلاحیت کو بروئے کار لاکر، اپنے سارے وسائل کو صرف کرتے ہوئے، دل و جان سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ مگر اپنے اس فعل و عمل میں اپنے ایمان پر ثابت قدم رہ کر اچھے کام کرنا، جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے پرہیز کرنا، جو فرمان الٰہی ہے، اسے ماننا، حق کو حق جاننا اور حق کی حمایت کرنی اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنی۔ یہی احسان کی روش کے تقاضے ہیں۔

ایمان کے اِن دو تقاضوں، یعنی تقویٰ کی روش کے ساتھ ساتھ احسان کی روش اختیار کرنے کے متعلق فرمایا خدائے تعالیٰ نے:

"جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انھوں نے پہلے جو کچھ کھا یا پیا تھا اُس پر کوئی

گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچتے
رہیں جو حرام کی گئی ہیں۔ اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور
اچھے کام کریں۔ پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس
سے بچیں، جو فرمانِ الٰہی ہے اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی
کے ساتھ نیک رویہ رکھیں (إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوا
وَّعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّآمَنُوا ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّأَحْسَنُوا)۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند
کرتا ہے (وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ______
(۵: ۱۲)

اِن آیات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ احسان کی روش یہ ہے کہ انسان عملاً نیک ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ صرف حوالگی اور سپردگی کا اعلان کرے بلکہ وہ رویہ اختیار کرے جو خدا کے ایک مطیع فرمانبردار بندے کو کرنا چاہئیے۔ اِسی روش پر چلنے والے وہ سہارا تھام لیتے ہیں جو انھیں حیات ابدی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے:

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور
نیکوکار ہو (وَهُوَ مُحْسِنٌ) تو اس نے
فی الواقع ایک بھروسے کا سہارا تھام لیا
اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی
کے ہاتھ ہے" ______ (۳۱: ۳)

خدا کو خوف و طمع سے پکارنا بھی احسان کی روش میں شامل ہے جو رحمتِ الٰہی کا باعث بنتی ہے:

"اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیکو کار لوگوں کے قریب ہے۔ (وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ"

—— (۷:۷)

انسانی معاشرے کی درستگی اور اس کی صحت مند تشکیل کے لئے خدا نے، ان لوگوں کو جنھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، یہ ہدایت دی ہے کہ:

"اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے" —— (۱۶ : ۱۳)

اس آیت میں پہلی چیز عدل اور دوسری احسان ہے۔ جس سے مراد نیک برتاؤ فیاضانہ سلوک، ہمدردانہ رویّہ، رواداری، خوش خلقی، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ بھی شامل ہے۔ اجتماعی زندگی میں عدل اگر معاشرہ کی اساس ہے تو احسان اُس کا جمال اور اُس کا کمال۔ عدل اگر معاشرہ کی ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں پیدا کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں احسان کی روش اجتماعی محاسن کو نشو و نما دینے والا سب سے اہم جذبہ ہے

محسنین کی صفات و خصوصیات قرآن میں مختلف سورتوں میں وارد ہوئی

ہیں۔ نفسِ مضمون کو ملحوظ رکھ کر، چند ایسی آیات درج ذیل نقل کی جا رہی ہیں:

"ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ (ایمان لانے والے) جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے (عداوتِ حق کا) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے اُن کے حق میں عملِ صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے یہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا۔ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) ——— (۹:۱۵)

یہی بات محسنات سے بھی دہرائی گئی ہے جس کا اطلاق مردوں پر بھی ہوتا ہے کہ:

"اگر تم (نبیؐ کی بیویو) اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کے طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے اُن کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے (فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا" ——— (۳۳:۴)

احسان کی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ اجر اس لئے مہیا کر رکھا گیا ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ:

"نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ (ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ)" (۳:۵۵)

"ہم نیکو کاروں کو اُن کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں (وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ)" ــــــ (۶ : ۱۰)

احسان کی روش اختیار کرنے والوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ:

"جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ انھیں اپنے رب کے یہاں سے وہ سب کچھ ملے گا جن کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا (ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ)" ــــــ (۳۹ : ۴)

خلافت عباسیہ اور ہندستان
از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری
ہندوستان میں ۱۱۵ سالہ عباسی دورِ خلافت کے غزوات و فتوحات اور اہم واقعات و حادثات، عباسی امراء و حکام کے ملکی و شہری انتظامات، عرب و ہند کے درمیان گوناگوں تجارتی تعلقات، بحرِ بصرہ کے ماتحت بحری امن و امان کا پیام، ہندی علوم و فنون اور علماء اسلام اور ہندی موالی و ممالک وغیرہ مستقل عنوانات پر نہایت مدلل و مستند معلومات پیش کی گئی ہیں۔ نیز یہاں کے مسلموں و غیر مسلموں کے عالم اسلام سے فکری و علمی اور تہذیبی روابط کی تفصیلات درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلفاء و امراء نے پہلی بار افسانوی ہندوستان کو دنیا کے سامنے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے
قیمت غیر مجلد چالیس روپے
مجلد عمدہ ریگزین پچاس روپے
ندوۃ المصنفین، اردو بازار
جامع مسجد دہلی

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۲)

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمانوں کے پہونچنے سے پہلے اسپین کے عوام طرح طرح کے ٹیکسوں کے بوجھ میں دبلے ہوئے تھے۔ حکمراں طبقہ ان حالات سے نہ صرف بے بہرہ تھا بلکہ ان کی مشکلات میں اضافے کرتا رہتا تھا۔ مذہبی طور پر وہاں بڑی آبادی عیسائیوں اور دوسرے درجے میں یہودیوں کی تھی۔ دونوں ہی کی سماجی زندگی خراب تھی۔ لیکن خاص طور پر یہودی اور بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ اس کے علاوہ وہاں گاتھوں کی حکومت تھی جو خود بھی آپس کی رسہ کشی اور انتشار میں الجھے ہوئے تھے۔ عام لوگوں کی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئی اور نتیجتاً اسپین پر مسلمانوں کے حملے اور اس میں کامیابی کی ایک بڑی وجہ خود اسپین کے لوگ ثابت ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کے کردار کی عظمت سے متاثر ہو کر انھیں اسپین آنے کی دعوت دی تھی اور مسلمانوں نے وہاں کے بہت سے شہروں اور علاقوں کو بغیر کسی مزاحمت کے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے اسپین کی سماجی حالت بہت خراب تھی۔ وہاں پہلا اور معزز طبقہ شاہی خاندان اور مذہبی رہنماؤں کا تھا۔ دوسرا طبقہ مزدوروں اور کسانوں کا تھا۔ تیسرا طبقہ ان

یہودیوں کا تھا جن پر عیسائیوں نے بہت مظالم کئے تھے۔ انھیں پورے شہری حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد سماجی زندگی میں بڑی تبدیلی آئی۔ مسلمانوں نے ان تینوں طبقوں کو برابر کے شہری حقوق اور عہدے دئے اس کے علاوہ جو عرب قبیلے ملک شام اور یمن سے وہاں آکر آباد ہوئے ان کو بھی وہی حیثیت دی گئی جو اسپین کے دوسرے باشندوں کو حاصل تھی۔ اسی طرح دوسری غیر مسلم اقوام کو بھی مساوی مرتبہ دیا گیا۔ مسلمان عیسائی اور یہودیوں کو اہل کتاب مانتے تھے اس لئے ان کے درمیان ازدواجی رشتوں کا آغاز و فروغ ہوا۔ یہودیوں کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک اس حد تک کیا گیا کہ وہ جن زمینوں پر کاشت کرتے تھے وہ زمینیں ان کو عطا کر دی گئیں۔ اس داد و دہش اور حوصلہ افزائی کا یہ اثر ہوا کہ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے اپنے مذہب کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے عربی زبان سیکھی۔

فتح اسپین کے بعد آٹھویں صدی کے شروع میں عرب قبائل اسپین میں آکر تیزی سے آباد ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے لئے سرسبز و شاداب علاقے پسند کئے۔ حکومت کی جانب سے عوام کے لئے جابجا حمام بنوائے گئے۔ چنانچہ قرطبہ میں حمام کی تعداد آٹھ سو بتائی جاتی ہے اور اسی طرح وہاں بڑے بڑے شہروں میں پانی پہونچانے کے لئے نہروں کا جال بچھایا گیا۔ غرضیکہ وہاں ایک خوشگوار ماحول پیدا ہو گیا اور عافیت سے پھر سماجی زندگی بسر ہونے لگی۔ ابتدائی زمانے میں مسجد سے متصل ہی مدرسے قائم کئے گئے۔ سب سے بڑی جامعہ قرطبہ میں تھی جس میں ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ سند دینے کا رواج اور دستور اسی زمانے سے شروع ہوا ہے۔ مذکورہ بالا قسم کے عرب قبیلے اپنی تہذیب و اخلاق اور اطوار و عادات کے ساتھ ساتھ

اپنی زبان اسپین لے گئے۔ ان تمام چیزوں کا گہرا اثر وہاں کی عیسائی اور یہودی آبادی پر پڑا۔ اس کے علاوہ عربوں اور مقامی عیسائیوں کے درمیان شادی کے رواج نے اس اثر پذیری کو مزید تقویت دی۔ جغرافیائی طور پر عرب و اسپین اور مذہبی سطح پر اسلام اور عیسائیت اور ان دونوں معاشروں کی زبانوں کے اختلاط و امتزاج کے نتیجہ میں سو سال سے کم مدت میں ہی ایک ملی جلی نئی تہذیب اور مشترکہ سماج وجود میں آگیا اور مسلمانوں کے حسن عمل کی وجہ سے اسپین میں بہت جلد اسلامی تہذیب مقبول ہوگئی اور مقامی آبادی کی اکثریت نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا اور وہ لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ انھوں نے بھی اسلامی تہذیب، وضع قطع اور طور طریقوں اور عربی زبان کو حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ "مضارب" کہلاتے تھے ان کے لباس، وضع قطع اور طور طریقوں میں عربوں سے زیادہ فرق نہ تھا۔ تاہم اس سلسلے میں مسلمانوں نے اپنی طرف سے ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا اور غیر مسلموں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر معاملہ ان کے اپنے آدمیوں کے درمیان ہو تو وہ اسے اپنے مذہبی قانون کے مطابق خود انہی عدالتوں میں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایک فریق مسلمان اور دوسرا عیسائی ہوتا تو فیصلہ مسلم عدالت میں مسلمان قاضی کرتا تھا۔ مسلمانوں کی اس پالیسی کی وجہ سے اسپین میں تہذیب و تمدن کی بڑی ترقی ہوئی۔ مسلمانوں کو اسپین کی گاتھک تہذیب سے خود بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مثلاً اسپین میں مسلمانوں نے جو عمارتیں، محلات اور مسجدیں بنائیں تو ان میں گاتھک اسٹائل اور اسلامی فن تعمیر کے امتزاج سے ایک نیا اور دنیا کا حسین ترین فن تعمیر ایجاد ہوا اور جو مسجد قرطبہ اور غرناطہ کے محل الحمراء میں آج بھی اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب کے میدان میں بھی مسلم اور عیسائی تہذیب کے میل جول کے نتیجہ میں عربی زبان میں نئے اسالیب پیدا ہوئے مثلاً "چودہ

پندرہ لائنوں والی گیت نما نظم جس کو "موشحات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یا گیتوں کی اور قسم جس کو "زجل" کہا جاتا ہے اسی اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ یہ طرز معاشرت جو مسلم حکومت کے تحت اسپین میں پیدا ہوا تھا۔ اس میں مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے لوگ نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں حکمراں طبقہ کی حیثیت سے عربوں میں غلبہ حاصل رہا۔ بعد میں شمالی افریقہ کے بربر کی بھی خاصی شمولیت ہوگئی اور اسپین میں ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی حکومت میں حصہ دیا گیا لیکن یہ جذبۂ ہمدردی و رواداری ان مسلم حکمرانوں کو مہنگا پڑا اور عیسائیوں کا اسلام دشمن ذہن ان کی علمی و سیاسی بیداری کے جلو میں بتدریج بلوغت کی منزلوں سے گذرتا ہوا اپنے اوج کمال پر پہونچ گیا اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ادھر مسلمان حکمرانوں کے تعیش اور باہمی انتشار نے حکومت کے مضبوط ستون کو کمزور کر دیا اور پندرھویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی مسلمان اپنی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ عیسائی جو اسپین میں مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے علوم سے فیض یافتہ اور مہذب بنے تھے، مسلمانوں سے حکومت چھین لینے کے بعد ان کی تہذیب و آثار کو مٹانے کے درپے ہو گئے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمانوں کی یہ عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے تمام علوم سکھانے میں غیر قوموں کے ساتھ کوئی امتیاز و تعصب روا نہیں رکھا۔ سائنسی، تمدنی، سماجی، سیاسی، طبی، اقتصادی، فلسفیانہ، مذہبی اور ادبی علوم کو تحقیقی مہارت کے ساتھ ان قوموں کے سامنے پیش کیا۔ جب عیسائی ان علوم میں ماہر ہو گئے تو انہی ہتھیاروں سے انھوں نے مسلمانوں کو فتح کیا اور ان سے قدیم عناد کا بھرپور انتقام لیا۔

(باقی)

قرآنِ کریم میں ترادف

(پہلی قسط)

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی
پروفیسر مطالعات قرآنی، شعبہ دینیات
جامعۃ القرویین، مغرب۔

عربی سے ترجمہ:
محمد رضی الاسلام ندوی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

زمانۂ قدیم سے عربی زبان کے ابناء ترادف کی بحث میں مشغول رہے ہیں اور اس میں ان کے مسالک و آراء میں اختلاف رہا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کی اس مختلف فیہ بحث میں بیان قرآنی کی فیصلہ کن بات ہو۔ قرآن جب 'کلمہ' کے راز کی طرف اشارہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کلمہ کی جگہ دوسرے ان کلمات میں سے جنھیں اس کا مترادف قرار دیا جاتا ہے کوئی کلمہ نہیں آسکتا۔

یہی معاملہ قرآن کے الفاظ کے سلسلہ میں بھی ہے۔ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے ہٹا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ لایا جاسکے۔ اس بات کو ان خالص اور فصیح اہلِ عرب نے جن کے درمیان قرآن نازل ہوا تھا، ادراک کر لیا تھا۔

یہاں میں چاہتی ہوں کہ مترادف کے مسئلہ کی کچھ وضاحت کر دوں جس میں طویل عرصے تک بحث [illegible] اختلافات رہا ہے مترادف سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ایک معاملہ کیلئے متعدد الفاظ عرب قبائل کی لغات کے اختلافات کی وجہ

سے ہوں اس لیے کہ میری معلومات کی حد تک اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے[1]
مترادف سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک معنی کیلئے کئی الفاظ ہوں اور ان کا سبب
تعدد لغات نہ ہو۔ نہ ہی ان الفاظ کے درمیان جن کو مترادف کہا جاتا ہے۔ کوئی
صوتی قرابت ہو۔

ہم میں سے بعض اس تعدد کو حس کے فقدان الفاظ کی دلالتوں کو ضبط کرنے
اور معانی کی یقین میں عدم قدرت کا مظہر شمار کرتے ہیں اور اسے زائد اور بے فائدہ
گردانتے ہیں[2] جبکہ دوسرے لوگ اسے ثروت، وسعت اور تصرف پر قدرت کا
مظہر سمجھتے ہیں اور اس لغوی ثروت پر فخر کرتے ہوئے اسے عربی زبان کا ایک
امتیاز قرار دیتے ہیں۔

اب جب کہ لغوی مطالعات کی ترقی نے ہمیں اپنی زبان اور دوسری زبانوں
کے درمیان سادہ موازنہ اور برتری کے مرحلہ سے آگے بڑھا دیا ہے اور ہمیں لغوی
اور صوتی مباحث میں علمی تحقیقات سے حاصل ہونے والی معلومات سے استفادہ
کرتے ہوئے عربی زبان کے خصائص و امتیازات میں غور کرنے کی طرف رہنمائی
کی ہے اس لیے اب ایک معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ کی کثرت فخر و
مباہات کی چیز نہیں رہ گئی بلکہ ایک مسئلہ بن گیا ہے جو حل چاہتا ہے۔

× × ×

ہم جب لغت کی ان کتابوں اور ڈکشنریوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہم تک
پہنچی ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ترادف کے مسئلہ پر دو[3] متضاد مسلک پائے جاتے ہیں۔

---

[1] السیوطی: المزھر فی علوم اللغۃ ص ۴۰۵ طبع الحلبی۔

[2] ابن فارس: الصاحبی فی فقہ اللغۃ ص ۸۔

بعض کتابوں میں ترادف ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک معنی یا ایک چیز کے لیے متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔ بغیر یہ اشارہ کئے ہوئے کہ یہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ یہ مسلک ابو مسحل الاعرابی (دوسری صدی ہجری) صاحب کتاب النوادر اور ابن السکیت (تیسری صدی ہجری) صاحب کتاب 'الالفاظ' کا ہے۔ اسی طرح فیروز آبادی صاحب القاموس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے 'الروض المسلوف فیماله إسمان إلی ألوف' دوسری کتاب 'أسماء العسل' ہے جس میں انھوں نے شہد کے اسی۸۰ نام بیان کئے ہیں۔

لیکن بعض کتب لغت ایک چیز یا ایک معنی کیلئے آنے والے الفاظ میں سے ہر لفظ کیلئے خاص دلالت بیان کرتی ہیں۔ یہ ابو منصور الثعالبی صاحب "فقہ اللغۃ"، ابو ہلال العسکری صاحب 'الفروق اللغویہ' اور احمد بن فارس صاحب "الصاحبی فی اللغۃ" کا ہے۔ یہ لوگ چوتھی صدی ہجری کے علماء لغت میں سے ہیں۔

دونوں مسالک میں اختلاف قدیم ہے۔ احمد بن فارس نے اصمعی کا ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ہارون رشید نے اس سے ایک 'غریب' شعر کے بارے میں دریافت کیا۔ اصمعی نے اس کی تشریح کردی تو رشید نے کہا "اے اصمعی تمہارے نزدیک 'غریب' بھی 'غریب' نہیں ہے"۔ اصمعی نے کہا اے امیرالمومنین کیوں نہ ہو۔ مجھے پتھر کے ستر۷۰ نام یاد ہیں۔

ابن خالویہ کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ مجھے شیر کے پانچ سو۵۰۰ نام اور سانپ کے دو سو۲۰۰ نام یاد ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اس نے حلب میں سیف الدولہ کی مجلس میں کہا "مجھے 'سیف' (تلوار) کے پچاس نام یاد ہیں۔ ابو علی فارسی جو اس دن اس مجلس میں موجود تھے۔ یہ سن کر ہنسے اور کہا "مجھے تو صرف

ایک نام یاد ہے اور وہ ہے 'سیف'۔ جب خالویہ نے ان سے پوچھا: "پھر مہند، صارم، قضیب، حسام اور فلاں فلاں نام کیا ہیں؟ تو ابو علی نے جواب دیا: یہ صفات ہیں۔ لگتا ہے کہ حضرت اسم اور صفت میں فرق نہیں کرتے"

مبرد اپنی کتاب 'ما اتفق لفظہ واختلف معناہ فی القرآن المجید' میں کہتے ہیں۔

"یہ حرف ہم نے کتاب اللہ سے منتخب کئے ہیں۔ ان کے الفاظ یکساں ہیں۔ لیکن معانی مختلف ہیں وہ تلفظ میں قریب ہیں لیکن مفہوم میں مختلف ہیں جیسا کہ کلام عرب میں پایا جاتا ہے اس لیے کہ اہل عرب کے کلام میں دو الفاظ دو مختلف معانی کے لیے ہوتے ہیں اور دو الفاظ ایک معنی کے لیے ہوتے ہیں اور ایک لفظ دو[۲] معانی کے لیے ہوتا ہے:

جیسے دو مختلف الفاظ دو مختلف معنی کے لیے: ظننت وحسبت (گمان کرنا) قعدت وجلست (بیٹھنا) ذراع وساعد (بازو) انف ومرسن (ناک)

اور ایک لفظ دو مختلف معنوں کے لیے: وجد وجدانا (پانا) وجد علی کذا موجدۃ (غصہ ہونا) وجد (جاننا) جیسے وجدت زیدا کریما (میں زید کو کریم جانا)[۳]۔

(باقی)

۲؎ المبرد: ما اتفق لفظہ واختلف معناہ ص ۴۷۔

کیا قرآن آسمانی کتاب ہے؟

(قسط ۳)

رئیس فاطمہ شعبہ کلیات، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ۔

قرآن پاک نے انسانی ذہن کو وہ پرواز تخیل عطا کیا ہے کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ اس مادی دنیا کے تمام بندھنوں کو توڑ کر یہ سوچے کہ اسی مادی دنیا میں ایسے بہت سے رموز واشارات پوشیدہ ہیں جو بالآخر اسے اللہ خالق و معبود کی طرف واپس لے جاتے ہیں۔ قرآن کے ذریعہ ہی انسان کو یہ علم حاصل ہوا کہ تمام دنیا اسی تبارک تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اس میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنایا ہے کہ وہ تلاش وجستجو کے ذریعہ اس سے مستفید ہو سکے۔ اور اس تلاش وجستجو کا طریقہ بھی قرآن پاک ہی سکھاتا ہے۔

قرآن پاک نے خود دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لیے ایک رشد وہدایت کی کتاب ہے۔ اس کا پیغام کسی ایک گروہ یا فرقے کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع کے لیے ہے۔ اور نہ ہی کسی ایک متعین و مقرر وقت کیلئے ہے بلکہ یہ قیامت تک کیلئے ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ کوئی انسان کی تخلیق کردہ کتاب انسانیت کے لیے مشعل راہ نہیں بن سکتی۔

آج کے دور میں انسان کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی میں ہم جو بھی ترقی دیکھ رہے ہیں ان سب کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں ہم قرآن میں پا رہے ہیں۔ قرآن پاک نہ صرف ہم کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے بلکہ وہ اس پر بھی مصر ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ اس کی ایک ایک بات ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ہمارے ذہن میں اٹھے ہوئے سوالات کے جواب دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ہمارے دلوں میں امید کا چراغ بھی روشن کرتی ہے کہ ہمارا خالق اگر غضبناک ہے تو بہت ہی زیادہ رحیم وکریم بھی ہے جو ہمیں ہماری غلطیوں پر معاف بھی فرمائیگا۔ سر ولیم میور کہتا ہے:

"قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گذاری پر جھکا دیا۔ یہ وہ کمال ہے جس سے دنیا کی تمام کتابیں عاجز ہیں"۔[1]

یہ قرآن ہی ہے جس کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، ہی ہماری تمام ضرورتوں کو پیدائش سے موت تک پورا کرنے والا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ ایٹم جیسے چھوٹے سے چھوٹے عنصر سے لے کر بڑی بڑی طاقتور چیزیں سب اللہ کے بنائے ہوئے قدرتی نظام کے مطابق عمل پیرا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کر کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے اتنی ہی حقیقت کی جانکاری دی جس کے ذریعہ وہ عدل وانصاف اور امن کے ساتھ اپنی زندگی باعزت طور پر گذار سکے۔ اور یہ

---

[1] عبدالقیوم ندوی: قرآن اور اس کی تعلیمات ص ۱۰۰

سارا علم اسے وحی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا جو وقفہ وقفہ سے پیغمبروں پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے صحف آسمانی میں تحریف کرلی گئی۔ مگر ایک قرآن ہی ایسا صحیفہ آسمانی ہے جو آج تک ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ پاک نے جبرئیلؑ کے ذریعہ محمدؐ نبی آخر الزماں پر نازل فرمایا تھا۔ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو کسی ایک عنوان یا مضمون پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہمیں مذہبی علوم، فلسفیانہ علوم، تاریخی، معاشی، سماجی، سیاسی، عدل وانصاف، داخلی وخارجی تعلقات، گناہ، عذاب، محبت واخلاقیات یعنی کہ سب کچھ ملیگا۔ ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا بنیادی مضمون انسانیت اور اس سے متعلقات ہیں جیساکہ قرآن خود شاہد ہے:

"شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینٰت من الھدی والفرقان ج"[۲]

ہم آج کے دور میں دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کے زیادہ تر اعمال قرآن پاک کی انھیں تعلیمات کے نزدیک ہیں۔ اور اہلِ میں ان لوگوں کی کثرت ہے جنکے اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پائے جاتے ہیں اور اسلام کا دعویٰ کرنے والے زیادہ تر مسلمان تنزلی کی راہ پر ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے قرآن پاک جیسی ایک مدلل کتاب موجود ہے جو ہمیں ہر طرح کی تعلیم وہدایت دیتی ہے مثال کے طور پر علم حاصل کرنا اسکو فروغ دینا ہر مسلمان کا فرض بتایا گیا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ علم اور جاہل برابر نہیں ہوسکتے:

---

۲ ۲ : ۱۸۵

"قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون" ۳؎

قرآن پاک علم کی اہمیت کو دوسری جگہ اس طرح بیان کرتا ہے:

"ولقد اخترنٰهم على علم على العٰلمين" ۴؎

اس کے علاوہ قرآن پاک خود اپنی مدافعت کے طریقے بتاتا ہے:

"یا ایها الذین امنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات او انفروا جمیعاً" ۵؎

یہاں تک کہ نماز کے دوران بھی اپنی حفاظت کا طریقہ بتاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نماز کے درمیان اپنی حفاظت سے غافل ہو کر مارے نہ جائیں ۶؎ قرآن پاک نے ہمیں بہادری کی بھی اسی طرح دی ہے کہ اے مومنو! جب کبھی کافروں سے جنگ ہو تو تم پیٹھ مت دکھاؤ اگر ایسا کروگے تو اللہ تعالیٰ تم پر غضب ناک ہوگا اور جہنم تمہارا مقام ہوگا ۷؎

اسی طرح پورے قرآن پاک میں ہم ہدایت پاتے ہیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ملک میں یا دنیا میں کسی کونے میں کسی بھی بحران کا سامنا ہوتا ہے تو اصحاب فہم و ادراک اور معزز لوگوں کو اکٹھا کر کے مشورے کیے جاتے ہیں اور اس بحران سے نپٹنے کے طریقے سجھائے جاتے ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ پہلو ہے

۳؎ ۔ ۹ : ۳۹

۴؎ ۔ ۴۴ : ۳۲

۵؎ ۔ ۴ : ۷۱

۶؎ ۔ ۴ : ۱۰۲

۷؎ ۔ ۸ : ۱۵ + ۱۶

جس کی تعلیم قرآن ہمیں بہت پہلے دے چکا ہے:

"وشاورھم فی الامر" [۸]

اللہ تعالیٰ نے محنت کرنیوالوں کو اجر دینے کا وعدہ کیا ہے:

"ونعم اجر العٰملین" [۹]

آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صفائی پر کتنا زور دیا جاتا ہے صفائی کو صحت کا ضامن قرار دیا گیا ہے مگر صفائی کا یہ تصور بھی انسان کو بہت پہلے قرآن کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے:

"ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین۔" [۱۰]

"وثیابک فطہر والرجز فاھجر" [۱۱]

"تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور نہ ہی انکے کوئی حقوق تھے۔ اسلام نے ان کے حقوق مقرر کئے اور مقام عزت متعین کیا جسکی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ آج بھی اس نام نہاد ترقی کے دور میں کہیں عورت کو "ستی" کے نام پر زندہ جلا دیا جاتا ہے کہیں اسے جھوٹی عزت اور آن کی خوف سے دنیا میں آتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا ہے کہیں دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے تو کہیں پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے بیچ دیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ

۸۔ ۳: ۱۵۹۔ یہی بات سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ میں بھی ہے۔

۹۔ ۳: ۱۳۶

۱۰۔ ۲: ۲۲۲

۱۱۔ ۷۴: ۴ + ۵

مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے علمبردار کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انکے یہاں عورتوں کو سب سے زیادہ آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہیں عورتوں کو چند دنوں کیلئے شریک حیات بناکر طلاق جیسی منحوس اور قابل نفرت تحفہ سے نواز کر ذلیل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں تا زندگی قائم رکھتے ہیں۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو حقیقت میں ہمیں عورتوں کی عزت کرنا سکھاتا ہے:

"وعاشروھن بالمعروف" ۱۲؎

خداوند کریم سورۃ بقرۃ میں ارشاد فرماتا ہے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف یعنی جسطرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ یہی نہیں پوری ایک سورۃ النساء عورتوں کے معاملات سے متعلق نازل فرمائی۔

اسلام ایک علمی اور عملی مذہب ہے جسکے لیے قرآن پاک کو ہدایت بناکر ہمارے سامنے رسولؐ نے پیش کیا۔ یہ تمام دنیا کیلئے اخلاق وعبادت اور علوم وضاعات کی تبلیغ کرتا ہے۔ قرآن کا تخاطب ہر سطح کے خاص وعام لوگوں سے ہے یہ انسانی زندگی کیلئے ایک مکمل دین اور جامع نظام فکر وعمل پیش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی شعبہ ایسا نہیں جسکے لیے قرآن نے واضح ہدایت اور اصولی احکام نہ دیئے ہوں۔

قرآن پاک کی بلاغت، مضامین کی عظمت اور اس کے اسلوب وبیان کی شوکت کے سامنے انسان نے ہمیشہ اپنے کو عاجز پایا۔ امام رازی کا کہنا ہے:

"میں نے علم کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے تمام ابواب پر پوری

۱۲؎ - ۴: ۱۹ -

طرح غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب۔ میں نے پایا کہ منزل مقصود تک لیجانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا ہے۔"[۱۳]

قرآن انسان کے ظاہر و باطن کی تعمیر ایسی کرتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ دنیا و آخرت میں چین پاتا ہے۔ قرآن منزل من اللہ ہے۔ کوئی بھی بہتر سے بہتر کلام حتیٰ کہ خود رسولؐ کے اپنے کلام کا کوئی ایک ٹکڑا بھی اس میں ملا کر رکھیں تو فرق صاف ظاہر ہو جائیگا۔ یہ قرآن کا بہت بڑا اعجاز ہے جو ہمیں یہ ماننے کے لیے مجبور کر دیتا ہے کہ قرآن کسی انسان کے بس کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم قرآن کی عظمت و فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہوں گے کیونکہ قرآن پاک کی ہدایات کی بنا پر ہی اسلام کو دوسرے مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی اچھا مقرر یا شاعر کسی ایک عنوان پر بات کرتا ہے تو اکثر وہ کمزور اور بے جان الفاظ استعمال (چاہے انجانے میں) کر جاتا ہے جس سے اس مضمون کی ساری خوبصورتی اور اصل مقصد ضائع ہو جاتا ہے اور اگر بھولے سے ہی کسی بات یا جملے کا اعادہ بار بار کرتا ہے تو وہ سامع اور قاری سب کو گراں گذرتا ہے۔ لیکن قرآن کے سلسلہ میں ہم ایسا نہیں پاتے ہیں۔ بلکہ جب کسی قصّہ یا بات کو دہراتا ہے تو وہ اسے اس طرح پیش کرتا ہے کہ سامع و قاری برا لگنے کے بجائے اچھا لگتا ہے اور اس کی تکرار سے دل و دماغ پر اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ یہ

۱۳ے۔ محمد منظور نعمانی: قرآن آپ سے کیا کہتا ہے۔ صـ۱۱

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ قرآن پاک کی انھیں تمام خوبیوں کی بناء پر ہی غیر مسلم اسکالر بھی اسے انسانی ذہن کی تخلیق تسلیم نہ کر کے اسے الہامی کتاب مانتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کا قول ہے:

"مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے"۔ ۴۲

۴۲۔ عبد القیوم ندوی: قرآن اور اس کی تعلیمات ص ۱۰۵

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمن عثمانی

برہان

جلد ۱۰۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۹ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۸۸ء شمارہ ۵

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے حمال پریس میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ ایک تلخ حقیقت اور تاریخی حقیقت ہے کہ روزِ اول سے "تحریکِ اسلام" کو جس قدر زک اور نقصان نام نہاد مسلمانوں اور منافقین کی ٹولیوں سے پہونچا ہے اتنا نقصان کسی دوسرے فرقے کے لوگوں اور افراد سے ہرگز نہیں پہونچا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کو اس بات سے ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیے کہ سامراجی، صہیونی، طاغوتی اور لادین قوتیں اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے برابر سازشوں میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں وہ داخلی وخارجی مفاد پرست نئے حربے استعمال کرنا بخوبی جانتی ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک تازہ مثال سامراجی ایجینٹ، کمیونسٹ اور دریدہ دہن مصنف "مسٹر سلمان رشدی" (جو پیدائشی اعتبار سے ہندی اور برطانیہ میں مقیم ہے) کی شیطان صفت کتاب "THE STANIC VERSES" ہے جس میں تمام مذاہب عالم کا عموماً اور دین اسلام کا خصوصاً جی بھر کر مذاق اڑا کر گھٹیا اور پست الفاظ میں توہین کی گئی ہے۔ اور اس طرح اس بیہودہ کتاب کے ذریعے دنیا بھر کے مذہب پرست لوگوں خاص طور سو کروڑ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔

اس نام نہاد کتاب میں گستاخ مصنف نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے لے کر ازواجِ مطہرات رضی، حضرات صحابۂ کرام رضی، سیدنا جبرئیل امین، قرآن کریم یہاں تک کہ اللہ رب العالمین کی شان میں بھی گستاخی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس شیطان صفت مصنف نے بزعم خود یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید اللہ تعالی کا کلام نہیں ہے بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہنی اختراع اور اساطیر الاولین ہے۔ اس بدنام زمانہ کتاب کے ذریعے عربی، عجمی اور شیعہ سنی تنازع کو ہی ہوا دینے سعی نا مشکور کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کو ایک پڑھا لکھا عقلمند سنجیدہ اور غیر جانب دار آدمی نہ ناول سمجھ سکتا ہے، نہ فلسفہ، نہ تاریخ، اور نہ حالات وکوائف پر کوئی معقول رپورٹ وتبصرہ، کتاب شروع سے لے کر آخر تک ایک بکواس نامہ، اور اول فول کا پلندہ ہے

یہ بڑا اچھا ہوا اور اس پر ہم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض مسلمان قائدین اور ذمہ داروں کے توجہ دلانے سے مرکزی حکومت نے فوراً اس لغو اور فتنہ انگیز کتاب کی ملک میں درآمد، اس کی اشاعت وطباعت اور خرید وفروخت پر پابندی عائد کر دی ہے ورنہ اس بات کا شدید اندیشہ اور خطرہ لاحق تھا کہ اس نازک مسئلہ کی آڑ میں جہاں موجودہ ملکی حالات کے پس منظر میں افتراق وانتشار کو مزید ہوا ملتی وہاں ہماری مسلمہ قومی روایات، تشخص، مختلف مذاہب کے تئیں احترام کی قومی اور ملکی پالیسی کی روح بھی بری طرح متاثر ہوتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان آئندہ بھی اس طرح کی سازشوں

سے پوری طرح باخبر اور چوکنا رہیں۔ مرکزی حکومت سے بھی ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں مذکورہ کتاب کی کسی بھی شکل میں اشاعت اور نقل پر بذریعہ "آرڈی ننس" کے ذریعہ قانونی پابندی لگائی جائے اسلئے کہ یہ ملک کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام انصاف پسند سکھ، عیسائی اور ہندو کی بھی آواز ہے اور یہی ملکی سالمیت، یکجہتی اور وحدت کا مطالبہ بھی ہے مسلمانوں کو بھی اس طرح کے نازک معاملات میں بہرحال انتہائی صبر و تحمل، ہوشمندی اور دانشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی جب اس طرح کی اہانت آمیز تحریریں سامنے آتی ہیں تو لوگوں کا اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھنا قدرتی طور پر بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔

یہ ایک سوالیہ نشان ہے اور ہمارے مفکرین اور دانشوروں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ موجودہ دور میں جس احساس کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل زمانہ کے تقاضے نہیں بلکہ "مغربی اقدار" کے تقاضے ہیں۔ جنہیں نام نہاد دانشوروں اور مفکرین کے ایک طبقہ کی ذہنی مرعوبیت نے زمانہ کے ہم معنی سمجھ لیا ہے انہوں نے یہ فرض کر لیا کہ زمانہ دراصل "مغرب" ہی ہے اور جو کچھ اس وقت وہاں موجود ہے اور ہو رہا ہے وہ صحیح، درست، برحق اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہمارے اپنے ملک و قوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظیر وہاں نہیں ملتی تو وہ بوسیدہ (OUT OF DATE.) ناکارہ، اور ازکار رفتہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ (THEVRY) یا عمل (ACTION.) کو قبول عام حاصل ہے اور ہمارے یہاں اس کا وجود

نہیں ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج اور بڑھاوا دینا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر زمانہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری "رجعت پسندی" "دقیانوسیت" اور بنیاد پرستی کا سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے نام نہاد معلمین اور مفکرین کے فکر و عمل کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ دراصل یہی سوچ، اپروچ اور طرز فکر غلط اور کمزور ہے مغربی اقتدار (WESTERN VELL) کو زمانہ کا تقاضا نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی مغربی تہذیب (WESTERN CULTURE) کے استیلاء اور غلبہ کو فکری مجبوریوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کے بارے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ کوئی معیار حق و باطل نہیں۔ جس کے مطابق ہم اپنے افکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل تہذیب کی عملداری اور غلط افکار و رجحانات کا دھارا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری اور ذہنی مرعوبیت کے سبب "زمانہ کے تقاضے" یا "عصری مطالبے" سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک یہی چیز فکر و دانش کی بنیادی خامی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم جب بھی شخصی اور اجتماعی معائب کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی عینک لگا کر ساری صورتحال پر نگاہ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں پاتے۔ ہماری تنقید کا ملان ہیر پھیر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر میں قابل اعتراض بنتے ہیں اور جن میں اہلِ مغرب ترمیم و تصحیح چاہتے ہیں۔

چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، معاشی، اقتصادی، سیاسی، سماجی، اجتماعی، اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور ان پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت

ہی نہیں ہوتی اور اُن حصوں کو صحیح سمجھ کر جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سر تا پا غلط ہے اور جن کے وجود سے ملت کو نا قابلِ تلافی نقصان پہونچ رہا ہے ۔ یہ اسی بنیادی نقطۂ نظر کے تغیّر کے اعجاز ہے کہ آج ملّت میں رقص و سرود، ناچ و نغمہ، شراب و کباب، قمار بازیاں اور فحاشی و بے حیائی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے دیکھا نہیں جا رہا ہے بلکہ ابھی باقاعدہ پشت پناہی ہو رہی ہے ضرورت ہے آج کا مسلمان از اول تا آخر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا محاسبہ کرے اور اپنے مقام و منصب" کو سمجھ کر اپنی ان بنیادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے جو بحیثیت "مسلمان" اس پر عائد کی گئی ہے ۔

اپیل

قارئینِ کرام وہمدردانِ ملت! "ادارہ ندوۃ المصنفین" اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمرتوڑ مہنگائی اور دورِ گراں بازاری میں ایسے ادارے بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب مرحوم انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے۔

اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا، اب یہ بات محسوس کی جا رہی

ہے کہ کئی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کئی اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے

اتمام کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے تاکہ بسہولت ادارہ مالی

بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم

نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام

چلایا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر

ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ ارباب خیر و بہی خواہان ادارہ اس ذیل میں اپنا

بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! ——

چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیا جائے۔

مینیجر ندوۃ المصنفین

اردو بازار دہلی ۶

سیّد قطب کی سیاسی بصیرت

(سید قطب شہید کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب

"فولاد ہے مومن" کا ایک باب)

از عبید اللہ فہد فلاحی ایم اے شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید قطب نے جس خاندان میں پرورش پائی وہ سیاست کے نشیب و فراز سے واقف اور ملک کی سیاسی فضا سے پوری طرح آشنا تھا۔ والد مرحوم ملک کی بڑی سیاسی پارٹی حزب وطنی سے وابستہ تھے جس کی سربراہی مصطفیٰ کامل جیسے مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ عنفوانِ شباب سے ہی سید قطب نے اس پارٹی کے ترجمان جریدۃ الحزب الوطنی میں مصر کی آزادی اور فرانسیسی و سامراجی طاقتوں کے انخلاء کا مطالبہ شدّومد سے شروع کر دیا تھا۔ اس وقت الحزب الوطنی کے سامنے دو مقاصد تھے، ایک تو بیرونی سامراج سے جنگ اور دیار عرب کی مکمل آزادی اور دوسرا اسلام کا نفاذ جس کے سایہ میں مسلمان اطمینان و سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ وطن کی آزادی کی قومی تحریک کے علم بردار سعد زغلول اور حزب الوفد کے کارکنوں کے ساتھ سید قطب کے

جو لمحات گزرے وہ مصر کی آزادی اور بیرونی مداخلت کاروں کے انخلاء کے مطالبہ میں صرف ہوئے۔

وفد پارٹی سے سید قطب کا تعلق جس قدر مستحکم ہوتا گیا اسی قدر ان کے قلم کی جرأت، ظلم و استعمار کے خلاف تحریری نفرت اور غیر ملکی حکمرانوں پر تنقید کا عمل شدید ہوتا گیا۔ ابتدائے شباب کی بیشتر تحریریں آزادیٔ وطن کے نعروں سے پر ہیں۔ بیرونی سامراج کی ظل عاطفت میں حکومت کرنے والے حکمرانوں کے خلاف مصنف کے تند و تیز لہجہ و اسلوب نے انھیں عوام میں ممتاز کر دیا تھا اور لڑکپن کے زمانہ سے ہی حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے تھے۔ چنانچہ وزیر اعظم محمد محمود پاشا مرحوم کے زمانہ میں اخبارات میں ان کا ایک بیان شائع ہوا کہ "وہ لاقانونیت اور انارکی پھیلانے والوں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کریں گے اور اس طرح کی سرگرمیوں کی ہر صورت میں اجازت نہ دی جائے گی اور ان میں ملوث افراد کی لوہے کے ڈنڈے سے خبر لی جائے گی"

مصنف نے اس سرکاری بیان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سخت تنقید کی:

> "یا صاحب الید الحدایدیۃ (اے لوہے کے ہاتھوں کے مالک!) اگر تو اپنے لوہے کے ہاتھوں پر نظر ڈالے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ وہ زنگ آلود ہو چکے ہیں اور مفلوج ہیں۔"

وزیر اعظم اس سخت تنقید کی تاب نہ لا سکا مضمون نگار کو ذاتی ملاقات کے لئے طلب کیا۔ سید قطب اس کے دفتر میں حاضر ہوئے تو ان کی کم عمری کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور تعجب سے پوچھا، کیا اس مضمون کے مصنف تم ہی ہو؟

سید قطب نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اس قدر سخت اور بیباکانہ لہجہ میں تنقید کرنے کی وجہ پوچھی۔ نوجوان مضمون نگار نے فوراً کہا: "میرا عقیدہ یہی ہے" وزیراعظم نے فراست سے کام لیتے ہوئے انھیں یہ کہہ کر رخصت کر دیا: جاؤ میرے بیٹے، جو جی میں آئے لکھو۔"[1]

یہ وہ دور ہے جبکہ اخوان المسلمون ابھی تشکیل کے مرحلہ میں داخل نہ ہوئی تھی۔ حسن البنّا شہید کا بھی عنفوان شباب تھا کیونکہ سید قطب اور حسن البنّا کا سال ولادت ایک (۱۹۰۶ء) تھا۔ البتہ آغاز ہی سے سید قطب کی سیاسی اٹھان کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک جری، بے خوف اور بیباک انسان تھے اور قدرت نے انھیں تحریر و تصنیف کا خصوصی ملکہ عطا کیا تھا۔ سامراجی طاقتوں، سرمایہ داری اور شاہی نظام کے خلاف ان کا اسلوب بالکل شروع ہی میں نکھر کر سامنے آچکا تھا البتہ اس میں وہ رخ (ORIENTATION) پیدا نہ ہوسکا تھا جو تحریک اخوان میں شمولیت کے بعد سامنے آیا۔ اس وقت ان کے سامنے باطل کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ہی اصل الاصول تھا۔ تخریب کے بعد تعمیر کا مکمل نقشہ ابھی تک ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔

مصنف نے قرآن کی منظر نگاری پر جب لکھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ اسلامی نظام کی جامعیت اور ہمہ گیری ان پر منکشف ہوتی گئی اور ایک وقت وہ آیا جبکہ اسلام کے واجب العمل ہونے پر ان کا ایمان مستحکم ہو گیا اور انسانیت کے تمام مسائل کا درماں انھیں اسلام کی صورت میں میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اخوان المسلمون ایک تحریک کی شکل میں اسلام کی نمائندگی کر رہی تھی اور بائیں بازو کی قوتیں الحزب الشیوعی المصری کے پلیٹ فارم سے یہودیوں اور صہیونیوں کے عزائم کی تکمیل میں لگی تھیں۔ اب مصنف کا قلم جڑ پکڑ چکا تھا اور اسے اسلامی تحریک کی روشنائی

میسر آنا شروع ہوگئی تھی۔ العالم العربی، الرسالۃ، المصری، اخبار الیوم، اخوان المسلمون، مصر الفتاۃ، العہد الجدید، الدعوۃ، النور المحمدی اور نور الاسلام جیسے اخبارات اور رسالوں میں آپ کی تحریروں نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ باطل کے ایوانوں میں آپ کے خلاف سازشیں رچی گئیں۔ سامراجی طاقتوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ آواز بڑی بارعب اور بلند تھی اور صور اسرافیل کا کام کر رہی تھی۔ شاہ فاروق نے فاضل مصنف کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن وزیر اعظم محمود فہمی نقراشی کا نوجوان مصنف سے ذاتی تعلق تھا اس نے ذاتی دوستی کا بھرم رکھا اور شاہ کو اس حرکت سے منع کیا۔ دوسری طرف اس نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دو سال کی مدت کے لئے مصنف کو امریکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مقصد سید قطب کو گرفتاری سے بچانا اور ان کی بیباک تحریروں سے گلو خلاصی کر لینا تھا۔ اور یہیں سید قطب مات کھا گئے۔ پورے ایک سال تک توقف کرتے رہے۔ لیت و لعل سے اس پروگرام کے متعلق کام لیتے رہے۔ بالآخر اعلیٰ تعلیم کا حصول، مختلف تعلیمی و تہذیبی نظاموں کا مشاہدہ اور سیاسی افکار کا تجزیہ جیسے مقاصد نے انھیں امریکہ جانے پر رضامند کر لیا۔ یہی پالیسی مختلف تحریکات کے سپہ سالاروں کی توجہ ہٹانے کے لئے مختلف ادوار میں باطل طاقتوں نے اختیار کی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں تحریک اسلامی کے علم برداروں کو انقلابی فکر اور طریقۂ کار سے ہٹا کر مختلف اصلاحی، رفاہی، تعلیمی اور تعمیری و تحقیقی اداروں اور منصوبوں میں باطل نے الجھانے کی کوشش کی ہے کہیں اسے کامیابی نصیب ہو چکی ہے، اور کہیں وہ جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔[2] لیکن امریکہ جا کر سید قطب کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی تباہ کاری بچشم سر دیکھی۔ امریکی معاشرت کا بغور مطالعہ کیا اور اسلام پر ایمان و یقین میں اضافہ ہوا چنانچہ مصر واپس آ کر انھوں نے تحریک اخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کر لی۔

امریکی سیاست کا تجزیہ

فاضل مصنف نے امریکی سیاست کا مطالعہ خود اس کی لائبریری اور میدان عمل میں جاکر کیا تھا اس لئے ان کی معلومات، تجزیہ اور مختلف منصوبوں پر ان کے تبصرے حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ باہر کا انسان امریکی سیاست کو اس کی معاشی و تکنیکی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے رفاہی و امدادی منصوبوں کی وجہ سے ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا۔ وہ مشرقی ممالک میں امریکہ کی شطرنجی سیاست کی چالوں کو نہیں بھانپ پاتا لیکن خود امریکہ میں رہنے والے انسان حکومت اور سرمایہ داروں کے چہروں پر پڑا ہوا نقاب ہٹا کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سید قطب نے اپنی تحریروں میں امریکی معاشی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے تعاونی پروگراموں سے نقاب ہٹادیا اور امریکہ کے مکروہ عزائم طشت از بام کئے۔

امریکی چالوں پر سید قطب کو زیادہ توجہ اس لئے دینی پڑی کہ شاہ فاروق کا دور امریکی سحر کاری کا دور تھا اور بعد کے ادوار میں بھی زیادہ تر مصری و عربی سیاست پر امریکی منصوبہ ساز اور پالیسی بنانے والے چھائے رہے۔ مصر کے صدر انور سادات مرحوم نے اپنی ڈائری "یا ولدی ھذا عمک جمال" میں امریکہ کے تئیں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت پر متمکن طبقہ کتنی سادہ لوحی یا خطرناک سازش کا شکار تھا اور دشمنوں کے منصوبوں اور پالیسیوں کے سلسلہ میں کتنا خوش فہم تھا۔ ایک جگہ مصری سیاست کے پیچ وخم کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"... اس طرح ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ امریکہ سامراجی عقلیت سے بالکل مختلف نقطۂ نظر اپناتے ہوئے معاملات و مسائل کی حقیقت کو سمجھتا

ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ امریکہ کی اپنی ایک سیاست ہے جو وہ اس علاقے میں اپنائے ہوئے ہے حالانکہ ہم لوگ عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ امریکی سیاست سامراجی برطانوی سیاست ہی کا ضمیمہ ہے جبکہ عالم عرب میں برطانوی سامراجی سیاست دانوں کا اعلان یہ ہے کہ تنہا وہی وہاں کے حالات سے باخبر ہیں۔ میرے بیٹے! ان حقیقتوں کے انکشاف سے اس بات پر مزید روشنی پڑے گی جو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ انقلاب مصر کے تئیں امریکہ کا اپروچ اول روز سے برطانوی اپروچ سے یکسر مختلف رہا ہے۔ اور ہمارے درمیان اور امریکی سفیر کیفرے کے درمیان حقیقی دوستی استوار ہو چکی ہے اور یہ شخص اپنے تعلقات میں مخلص ہے۔

پہلے دن ہی ہم نے مسٹر کیفرے کی اس دعوت کو قبول کر لیا تھا جو انھوں نے شام کے کھانے پر ہماری کی تھی اور ہم سب اس کے گھر پر گئے تھے جبکہ مصر میں اور باہر دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ انقلاب مصر کے اصل افراد کون ہیں اور اس وقت برطانیہ سے تمام سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے یہاں تک کر برطانوی سفیر کا مشرقی مشیر بھی ہماری شخصیات کو پہچاننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا پھر ہمارے بعض صحافی دوستوں سے اس نے میل جول شروع کیا تاکہ ان کے ذریعہ ہم تک وہ رسائی حاصل کر سکے یا ہم سب کے ایک جگہ جمع ہونے میں وہ واسطہ کا کام کر سکے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ امریکی سفیر کا ہم سے برابر ربط تھا اور ہر بار وہ ہمارے اہداف و مقاصد کے ادراک کا اظہار کرتا تھا جس نے ہمیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ امریکہ اپنے اس اعلان میں برحق ہے کہ وہ سامراجیت کے خلاف ہے اور سختی سے اپنے اس اصول پر کاربند بھی ہے اور وہ کمزور قومیں جو غیر ملکی

اقتدار کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی ہیں انھیں اپنا فیصلہ آپ کرنے کے حق کا وہ حامی ہے۔"[۴۲]

اس کے برعکس سید قطب امریکی شاطرانہ سیاست کے ان مہروں کو خوب پہچانتے تھے۔ وہ امن و امان کے خالی خولی دعووں اور سلامتی و یکجہتی کے پُر فریب ساحرانہ ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے امریکی منصوبوں کی حقیقت واشگاف کی۔ اس کی مسموم فکر، ذلت آمیز اقتصادی تعاون اور سودی پروگراموں پر تنقید کی اور امریکی امداد و تعاون کا تاجرانِ سیاست سے گہرا رشتہ قائم کر کے دکھایا اور مشرق وسطیٰ میں منڈیوں کی تلاش کے پیچھے اپنے پیداوار کی کھپت کے ذریعہ معاشی تسلط و غلبہ کا ناپاک منصوبہ بے نقاب کر دیا۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"امریکہ جنگ چھیڑنا چاہتا ہے، اگر یورپ بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑتا تو وہ جنگ کوریا کے حادثے تک بھی صبر نہ کرتا۔ امریکہ تو برلن کے مشہور بحران سے ہی ایک پوری جنگ لڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت تھکا ماندہ یورپ امریکہ کے شدید اصرار اور خواہش پر لبیک کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا ابھی وہ اپنے زخموں کو چاٹنے اور نقصانات کی تلافی کرنے میں مصروف تھا۔ اگرچہ اشتراکیت کو کافی طاقت حاصل ہو گئی تھی اور وہ آنے والے وقت کے لئے پوری تیاری کر رہی تھی لیکن ڈالر کی اشتہا یورپ میں سب کچھ کرنے پر قادر تھی البتہ تیسری عالمی جنگ سے وہ بالکلیہ کترا رہی تھی اور اسی وجہ سے امریکہ کو جنگ کی خواہش دبانا پڑی۔

امریکی سرمائے ایک نئی جنگ چھیڑنے کی ضرورت شدید طور سے محسوس کرتے ہیں۔ یہی علین مسئلہ ہے۔ پچھلی جنگوں میں جو علمی فتوحات تیزی سے بڑھی ہیں اور جنگوں کے درمیان امریکی صنعت و حرفت کو سامان جنگ

فراہم کرکے جو تجارتی فتوحات حاصل ہوئی ہیں انھوں نے امریکی صنعت و حرفت کی کئی گنا پیداوار تیار کرنے کے نئے مواقع بہم پہونچائے مگر اس کے ساتھ ہی اس پیداوار کی نکاسی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔

باوجودیکہ جنگ عظیم کے بعد منڈیاں ویران تھیں، انھیں شہری پیداوار کی سخت ضرورت تھی اور وہ یوروپی مقابلہ آرائی سے خالی تھیں پھر بھی ان کی قوت خرید کمزور تھی خاص کر تھکے ماندے اور زخموں سے چور یوروپ میں یہ قوت زیادہ کمزور تھی۔ چنانچہ امریکی نقطۂ نظر کے مطابق اس کا مطلب کساد بازاری ہی تھا اور اس کساد بازاری کا مطلب یہ تھا کہ امریکی سرمایوں کا زیاں زیادہ ہوتا۔ چنانچہ اس صورت حال میں امریکہ کا مارشل پلان سامنے آیا۔"[۵]

مارشل پلان پر تبصرہ

فاضل مصنف نے اس تاریخی تناظر کے ساتھ مارشل پلان کا تجزیہ کیا اور اس کے تین بنیادی مقاصد قرار دیئے:

۱۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی نکاسی کی جائے۔ لیکن اس کھیت میں یہ شرط لگادی گئی کہ پیداوار سے فائدہ اٹھانے والی حکومتوں پر امریکی ڈالر کی شکل میں نقد قیمت کی ادائیگی پر زور نہ دیا جائے کیونکہ امریکی حکومت یوروپی سلطنتوں کے لئے لیٹر آف کریڈٹ اس شرط پر کھولتی تھی کہ یہ حکومتیں اسے زیادہ تر امریکی مال کی خریداری میں خرچ کریں گی اور حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت کے مارشل پلان کے نفاذ کے لئے امریکی سرمایہ دار بڑے بڑے ٹیکس برداشت کرتے تھے لیکن ان بڑے بڑے ٹیکسوں کے ساتھ

ایسا نفع بھی کماتے تھے جس کی وصولی میں مارشل پلان کے نفاذ کی صورت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا نیز وہ کساد بازاری کے خسارے سے بھی بچ جاتے تھے۔

۲۔ امریکہ کے مزدوروں کی بیکاری اور اس سے پیدا ہونے والی اجتماعی شورشوں سے تحفظ حاصل کیا جائے، کیونکہ مزدور جو اس سے پہلے جنگی سازوسامان کی تیاریوں میں مصروف تھے، اب تعطل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ تمدنی پیداوار کی کھپت کی ایسی راہیں تلاش کی جائیں جو کارخانوں کو انتہائی حد تک مصروف رکھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ مارشل پلان کا نفاذ اور یورپین سلطنتوں کو مشینیں فراہم کرنا تھا جس کا ایک نتیجہ امریکی سرمایہ کو نفع حاصل ہونے کی صورت میں نکلتا۔

۳۔ اس کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو بین الاقوامی اقتصادی عمل کو بحال کیا جائے اور اس کے لئے یورپ کی از سرِ نو تعمیر کی جائے اور اس میں زندگی کی چہل پہل پھر سے لوٹ آئے اور دوسری طرف بیکار مزدوروں میں اشتراکیت کی اشاعت کو روکا جائے۔ مارشل پلان اس مقصد کی تکمیل میں معاون تھا۔[۹]

اوپر کے اقتباسات فاضل مصنف کی مشہور کتاب السلام العالمی والاسلام کے آخرہ طبع دالآن ..... سے ماخوذ ہیں۔ یہ باب کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں موجود تھا لیکن ۱۹۵۲ء یعنی فوجی انقلاب کے بعد کتاب کے جتنے ایڈیشن منظر عام پر آئے ان میں سے یہ پورا باب استعماری طاقتوں نے خارج کر دیا اور اس باب کے بغیر ہی کتاب چھاپنے کی اجازت دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سفارت خانہ سے مصری حکومت اور مصری فوج کے کس قدر مضبوط تعلقات تھے۔ اور

ان تنقیدوں سے امریکی مفادات کس بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

اسی باب میں سید قطب نے ان مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جنھیں آج ہم عالمی کرنسی کے بحران سے یاد کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنی تجزیاتی صلاحیت سے اور امریکی سیاست پر گہری بصیرت کی وجہ سے عالمی منڈیوں کا جو تجزیہ کیا وہ بڑی حد تک درست تھا۔ لکھتے ہیں:

"..... لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ مارشل پلان کی عمر ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے، کیونکہ یورپین منڈیاں جب پُر ہو جائیں تو فطری طور پر معاملات کا ایک معین حد تک آکر ٹھہر جانا عین تقاضائے فطرت تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یوروپ کے پیداواری وسائل و ذرائع انتہائی حدود کو جا پہونچیں۔ یوروپ اپنی پیداواری قوت کو بحال کر رہا تھا، اب وہ اس مقام پر پہونچ رہا تھا کہ نہ صرف خود تباہی سے محفوظ رہ سکے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ اب یوروپین پیداوار اپنی منڈیوں کے ماسوا دوسری منڈیوں میں بھی امریکی پیداوار کی حریف و رقیب بن چکی تھیں۔"

اسی صورت حال میں برطانیہ نے اپنا پرفریب کھیل کھیلا اور امریکی عقل کی سادہ لوحی اور بین الاقوامی حالات سے اس کی بے خبری سے اس نے فائدہ اٹھالیا۔ یہ کھیل ڈالر کے مقابلہ میں اسٹرلنگ پونڈ کی قیمت کم کر دینے کا کھیل تھا۔ اس نے امریکہ کو موقع دیا کہ ڈالر کی سرکاری نہیں بلکہ واقعی قیمت کو قائم رکھنے کے لئے برطانیہ سے آگے بڑھ جائے۔ اس نے امریکہ سے اپنی مجبوری اور خوف کا مظاہرہ کیا حالانکہ اس کی نیت کچھ اور تھی جس کا اندازہ امریکہ کو بہت بعد میں ہو سکا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹرلنگ کے حلقۂ اثر میں امریکی مال کا نرخ بڑھ جانے

کے باعث اس پر منڈیوں کے دروازے بند ہو گئے اور وہ منڈیاں برطانوی مال کے فروخت کے لیے محفوظ ہو گئیں اس کے مقابلہ میں سٹرلنگ پاؤنڈ کی قیمت گر جانے کا اثر انگریزی مال کے نرخوں پر نہ پڑا۔ اس حلقہ کے علاوہ انگریزی مال کے نرخ امریکی مال کے مقابلہ میں پہلے سے بھی ارزاں ہو گئے۔

آخر جب امریکہ کو اس فریب کا پتہ چلا تو اس نے اس کا جواب عالمی منڈیوں سے ہر قسم کے خام مال کو کھینچ لینے کی صورت میں دیا۔ اسے یہ قدرت حاصل تھی کیونکہ اس کی قوت خرید دوسروں سے زیادہ تھی نیز عالمی منڈیوں میں اس کا رسوخ جانچ پڑتال کی قوت اور نقد سکہ نسبتاً زیادہ تھا۔ امریکہ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ برطانوی صنعت کے مقابلہ میں خام مال کی قیمت چڑھا دی جائے۔ اس صنعت کو مقابلہ کی طاقت سے کمزور کر دیا جائے، کیونکہ خام مال کی قیمت بڑھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی صنعت مجبوراً اپنی پیداوار کا نرخ بڑھائے اور اس طرح برطانوی اور امریکی نرخوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے مثلاً اُونی خام مال کی قیمت پانچ سو فیصد بڑھ گئی کیونکہ اُون انگریزوں کی ایک بڑی صنعت ہے۔ اس طرح برطانوی مکر کے مقابلہ میں جدید طرز عمل کی بدولت ہر اس خام مال کی قیمت چڑھ گئی جس کی بنیاد پر انگریزی صنعت قائم تھی۔ گرانی کی وہ لہر جو عالمگیر جنگ کی تیاریوں سے پیدا ہونے والے دوسرے قدرتی اور مادی اسباب کے علاوہ دنیا بھر پر محیط ہو گئی تھی اس کا بڑا سبب یہی تھا۔

لیکن یہ امریکی سرگرمی ایک معین حملہ کی روک تھام کے لئے ہنگامی کارروائی سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکی ورنہ امریکی پیداوار کے تعلق سے منڈیوں کی عام حالت کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئی البتہ اسے

ایک بڑا دھچکا یہ لگا کہ عالمی منڈی کے ایک اہم مقام چین کو اشتراکیت نے اپنے جال میں پھانس لیا۔ چین پچاس کروڑ انسانوں کا مسکن ہے جو تقریباً دنیا بھر کے باشندوں کا ایک چوتھائی ہے۔ چین بنیادی طور پر امریکی مال کی منڈی نہ تھا لیکن جاپان کی شکست کے بعد امید تھی کہ وہ یہ حیثیت اختیار کرے گا لیکن اشتراکیت نے اسے اپنی آغوش میں لے کر یہ راستہ بند کر دیا اور امریکی مصنوعات کو کسی قدر تنگی اور گھٹن کا احساس ہوا۔ اسی طرح اجتماعی حلقوں نے بیکاری پھیلنے کا خدشہ محسوس کیا۔ جنگ کوریا سے کچھ پہلے بیکاروں کی تعداد پچاس لاکھ تک تھی لیکن جنگ ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد گھٹ کر تیس لاکھ رہ گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ اگرچہ کوریا کی جنگ نے بیس لاکھ انسانوں کو ہضم کر لیا تھا لیکن بس ایک جنگ مسئلہ کے حل کے لئے کافی نہ تھی۔ امریکہ کو ایک وسیع پیمانے کی جنگ درکار تھی جو ایک طرف تو تمام بیکار انسانوں کو ہضم کر لے اور دوسری طرف سرمایہ کے لئے پورے نفع کی ضمانت بھی دے۔ پس آج امریکی نقطۂ نظر سے جنگ قومی زندگی کی ایک ضرورت بن چکی ہے اور تقاضائے حال کے بموجب عالمی کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی قومی خواہش اس پر مستزاد۔ عالمی اشتراکیت کا یہ سیلاب ہر روز ایک نئی سرزمین کو فتح کرتا اور ایک نئی منڈی پہ قفل چڑھاتا جا رہا ہے۔"

امریکی سیاست کے حربے

سید قطب نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کس طرح روس اور امریکہ یورپ

دنیا کو اپنی شکار گاہ سمجھتے ہیں۔ وہ برابر اس فکر میں ہیں کہ باقیماندہ دنیا کو آہستہ آہستہ اپنے اپنے حصار میں کھینچ لیں اور دنیا کے تمام اقتصادی، جغرافیائی اور انسانی وسائل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ فاضل مصنف کے نزدیک سرمایہ داری امریکی قیادت میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حربے آزماتی ہے:

۱۔ پوری دنیا اور خاص طور پر جاگیردارانہ عرب ملکوں کے سرمایہ داروں کو اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ کرتی ہے اور سامراجیت اور سرمایہ داری کے درمیان مشترک امور کی موجودگی کی وجہ سے مقامی اور عالمی سرمایہ داریوں میں طبعی طور پر معاہدہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ جو ممالک سامراجیت کی براہ راست یا بالواسطہ غلامی میں مبتلا ہیں، ان میں سیاسی و اقتصادی دباؤ کام میں لاتی ہے اور بسا اوقات مسلح تشدد بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتی۔ تمام عرب ممالک میں یہی صورت حال ہے۔

۳۔ کئی عنوانات کے تحت ڈالر کی ساحری کو استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ مارشل پلان کے بعد "اقتصادی امداد" کا عنوان یہی کام کر رہا ہے۔ یا ٹرومین کے پلان میں "چوتھے نقطہ" کا عنوان یہی محرک رکھتا ہے۔[8]

فاضل مصنف کے نزدیک یہ لابی عام طور پر حاکم اور استحصالی طبقوں کو اپنا مخاطب بناتی ہے اور عوام کو زیادہ منہ نہیں لگاتی کیونکہ ان طبقوں کے مفادات سرمایہ دار لابی کی فتحیابی سے وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ لابی ان کے لئے بڑے معرکے سر کرتی ہے لیکن قومی و عوامی مقاصد سے بالکلیہ انحراف کرتی ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک امریکی قیادت میں چلنے والی سرمایہ داری کا یہ موقف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ قومیں اپنے پیروں پر خود کھڑی نہیں ہو جاتیں اور اس بات کا واضح ثبوت بہم نہیں پہونچاتیں کہ وہ اپنے شعبدہ باز سرداروں اور لیڈروں کی

شعبدہ بازی سے مسحور نہیں ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ سامراج اور سرمایہ داروں کے لیے حقیقی مشکلات کا باعث بنیں گی اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اس لابی اور اس کی فوجوں کے مصالح کو حقیقی خطرات کی راہ میں نظر انداز کر دیں گی۔ فاضل مصنف کے نزدیک، جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تبھی سامراجی سرمایہ دار لابی ان قوموں کی چیخوں پر کچھ کان دھرنے کی فکر کرے گی۔[9]

کمیونزم پر تبصرہ

فاضل مصنف کا اصل نشانہ امریکی سرمایہ داری رہا ہے۔ ان کی آتشیں تحریروں کا رخ اصلاً سامراجی امریکہ کی طرف ہے لیکن روس کی چالبازیوں، کمیونزم کی فکری بے راہ روی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ناپاک ہتھکنڈوں کے خلاف خاموشی اختیار نہیں کی۔ آپ نے اشتراکی حربوں سے بھی بحث کی ہے اور انسانیت کو ان دونوں بلاکوں سے متنبہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکی بلاک عوام سے مخاطب ہوتا ہے جنھیں طویل عرصہ سے محروم رکھا گیا ہے۔[10] وہ ہتھکنڈے کے طور پر سامراج کی بدکاریوں اور جرائم کو استعمال کرتا ہے۔ غلام قوموں کی اس خواہش کو کام میں لاتا ہے کہ وہ اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ اس طرح یہ بلاک مغربی صلیبیت اور مقامی سرمایہ داری کے ہر حقیقی اسلامی دعوت کا مقابلہ کرنے سے فائدہ اٹھاتا اور ہر اسلامی اجتماعی عدل و انصاف کی تحریک کو ناکام کرنے میں مدد لیتا ہے۔[11]

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی تضاد نہیں ہے:

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اس وقت دو بلاکوں میں منقسم ہے ایک سرمایہ داری

کا بلاک ہے جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا کمیونزم کا بلاک ہے جس کی سربراہی روس کر رہا ہے اور ان دونوں بلاکوں میں افکار و نظریات اور مفادات کے تعلق سے اینٹ اور کتے کا بیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ سید قطب کے نزدیک ان دونوں بلاکوں کے درمیان یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تقسیم مصالح و مفادات کی تو ہو سکتی ہے افکار و نظریات کی نہیں ہو سکتی۔ یہ منڈیوں اور شکار گاہوں کا بٹوارہ ہے اصول کا عقیدے کا نہیں۔ روح کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جوہر دونوں کا ایک ہے۔ دونوں زندگی کی مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک روحانیت کی کوئی ضرورت اور بنیاد نہیں ہے۔ تاریخ اور حیات و کائنات کی مادی تعبیر و تصور میں دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں جو مادی فکر رائج ہے وہ اخلاقی اخلاقی اقدار کو اضافی قرار دیتی ہے اور مصالح و مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ وہ زندگی سے روحانی عنصر کی نفی کرتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر ایمان کی تردید کرتا ہے اور اعلیٰ قدروں کی تذلیل کرتا ہے اور Pragmatism فلسفہ کی طرح اشیاء کی حقیقت بس ان کے وظائف و اعمال سے معلوم کرتا ہے۔ اس پورے فکر کے پس پردہ وہی مادیت کام کر رہی ہے جو مارکسزم کی روح ہے۔ روسی و امریکی فکر کے مزاج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ معاشرتی و معاشی حالات میں ہے۔ عام امریکی شہری کو کمیونزم کی طرف مائل ہونے میں جس رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے وہ زندگی کا کوئی ایسا تصور اور نظریہ نہیں ہے جو کائنات، حیات اور تاریخ کی مادی تفسیر کا انکار کرتا ہے بلکہ اس کے سامنے محض یہ امید رہتی ہے کہ امریکی معاشرے میں دولت کمانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور مزدور کو اجرت بھی زیادہ ملے گی اور کمیونزم کی دنیا میں یہ مواقع چھن جائیں گے۔

سید قطب کے نزدیک حقیقی رزم گاہ مشرقی و مغربی بلاک اور اسلامی ممالک ہیں۔ اسلام کے مقابلہ میں یہ دونوں دشمن متحد ہیں افکار و نظریات کی سطح پر بھی اور مفادات و مصالح کی سطح پر بھی۔ یوروپ، امریکہ، روس اور چین وغیرہ ممالک کی مادیت کی راہ میں حقیقی رکاوٹ صرف اسلام ہے۔ صرف اسلام وہ نظام ہے جو وجود اور حیات سے متعلق ہمہ گیر، جامع اور مکمل تصور دیتا ہے اور باہم کشمکش اور رزم پیکار کی جگہ باہم تعاون و تعامل قائم کرتا ہے۔ انسانیت کو وہ روحانی اصول دیتا ہے جو خالق ارض و سماء سے انسان کا رشتہ جوڑتے ہیں اور زمین پر اس کی مرضی قائم کرتے ہیں، محض مادی اغراض کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے اگرچہ مفید مادی عمل کو عبادت الٰہی کا درجہ دیتے ہیں۔[۱۲]

سید قطب نے فراستِ مومنانہ سے کام لیکر جو بات اپنے زمانہ میں کہی تھی وہ اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ ایرانی انقلاب کے خلاف امریکہ کی ریشہ دوانیاں، افغان جہاد کی روسی درندوں سے مزاحمت اور لبنان و فلسطین میں دونوں بڑی طاقتوں کا کھیل اس حقیقت کو منوانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ دونوں بظاہر باہم دشمن اسلام کے خلاف متحد ہیں اور مسلمانوں کے مسائل پر ان کی پالیسی ایک رہتی ہے اور یہ کہ اسلام ہی ان دونوں انسانیت کش طاقتوں کا توہا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مصری سیاست کا محاسبہ

سید قطب ان مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں تھے جو عالمی افکار و نظریات پر تو بڑھ چڑھ کر تنقید کرتے ہیں لیکن ملکی و مقامی فکر کو شتر بے مہار چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کا محاسبہ کرنے سے مفادات خطرے میں پڑجائیں گے یا انھیں اپنے

گرد وپیش کے باطل کا سراغ لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور اس طرح مقامی صورت حال میں عالمی طاغوت کی تلاش سے وہ عاری ہو جاتے ہیں جبکہ تحریک اسلامی کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر پہلے نظر ڈالے اور ارد گرد کی برائیوں اور غلط افکار پر پہلے تنقید کرے پھر عالمی و بین الاقوامی دشمنان دین کا بھی بے لاگ محاسبہ کیا۔ شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے ادوار پر نگاہ ڈالی اور ان کی سامراجی خدمات پر بھی بھرپور وار کیا اور اسی وجہ سے مصری حکام نے آپ کے خلاف سخت نوٹس لیا۔

مصری معاشرہ میں ایسے ارباب کمال اور فضلاء کی کمی نہ تھی جو اسلام کی تعلیمات کو جرأت سے پیش کر رہے ہوں اور زندگی کے ہر میدان میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی علمی سطح پر نہ کرتے ہوں۔ کمی صرف اس بات کی تھی کہ اصولی طور پر اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے ساتھ موجودہ معاشرہ پر اس کا عملی انطباق بھی کیا جاتا اور مومنین و منافقین، یہود و کفار اور دوسرے قرآنی کرداروں کو موجودہ سوسائٹی میں تلاش کیا جاتا، عالمی سامراج کی خدمت کرنے والوں کا پتہ چلایا جاتا اور تحریک اسلامی ان ساری طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی۔ اخوان المسلمون نے یہی کام انجام دیا۔ اس کے مصنفین میں سید قطب کو وہ امتیازی مقام حاصل ہے جس نے انھیں عالمی و مقامی استعمار کا دشمن قرار دیا۔ اور ساری طاقتیں مل کر ان کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔

شاہ فاروق کے زمانے میں حکومت وقت کو سامراج کا ایجنٹ قرار دیا اور اس پر کڑی تنقید کی:

"مقامی سرمایہ داری اور مغربی سامراج کے درمیان فطری مادی معاہدہ موجود ہے۔ غلام بنانے والوں اور سامراجیوں کا یہ ایک مشترکہ مفاد ہے۔ یہاں

کے سرکش اور سامراجی اس ظلم و استحصال سے ذرا بھی نیچے اترنے کو تیار نہیں ہیں جس پر وہ مسلسل ڈٹے رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سامراج ہی ان کا واحد مادی سہارا ہے۔ ان کا خالق اور پرورش کرنے والا وہی ہے اور اسی نے انھیں اقتدار اور سرمایہ بخش رکھا ہے۔ اس سامراج نے ان غداروں کو صلہ دیا تھا جنھوں نے عرابی کے لشکر کو دھوکہ دیا تھا اور مصر میں سامراجی حملہ آور فوج کی مدد کی تھی۔ اس نے انھیں زمینیں اور مال و دولت عطا کئے تھے۔ حتیٰ کہ آج وہ شریف گھرانوں کے افراد کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور باعزت خاندانوں کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔[13]"

سفید فام انگریزوں کی جگہ سیاہ فام انگریزوں کی حکمرانی

انگریزوں کے مصر سے رخصت ہو جانے کے بعد آزاد مصر میں جن لوگوں نے عنانِ حکومت سنبھالی وہ اپنے فکر و نظر، رہائش و زیبائش وابستگی و وفاداری طرزِ سیاست و معاشرت میں انگریزوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے فرق صرف یہ تھا کہ سفید فام کی جگہ سیاہ فام تھا۔ بیرونی مداخلت کی جگہ اندرونی سامراجیت تھی۔ انگریزوں نے ملک تو چھوڑ دیا لیکن معیشت و سیاست اور فکر و تربیت میں اپنے متبنّیٰ حکمرانوں کو قائم مقام بنا دیا۔ اس صورت حال پر سید قطب کی تنقید ملاحظہ فرمائیے:

"انگریزوں کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر مصر کو چھوڑنا پڑے گا چنانچہ نوآبادیاتی افواج کے علاوہ مقامی لوگوں کو استعمار کا تعاون ناگزیر تھا چنانچہ مصری بازاروں کو اپنی نوآبادیات میں شامل رکھنے اور مصری پیداوار کو عالمی منڈیوں میں جانے سے روکنے کے لئے انھوں نے اقتصادی میدان میں

امداد کا سلسلہ شروع کیا اور کرنسی وغیرہ کے تبادلوں کے ذریعہ مالی دنیا میں
تعاون کا آغاز ہوا لیکن ان تمام امدادی پروگراموں سے انگریزوں کی بقا کا سامان
فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس اندرونی سامراج کا وجود نہ ہوتا جس نے ماضی میں
کارنامے انجام دیئے تھے اور جس کی سرپرستی ان دنوں بطور خاص کی جارہی
ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے سفید فام انگریز رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ
اُن سیاہ فام مصری انگریزوں نے لے لی جن کے افکار و نظریات پر انگریزوں
کا قبضہ تھا اور جو سامراج کی سرپرستی میں سامراجی مقاصد کے لئے ڈھالے
گئے تھے۔ سفید فام انگریز نے وزارت تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی جو نوجوان
نسلوں کی تربیت کا کام کرتی تھی اب یہ وزارت سیاہ فام انگریزوں کے
حوالے ہوئی تو سفید فاموں کو پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ نظام تعلیم، طریق تعلیم
کتابیں اور منصوبے سب فکر و روح کو نو آبادیاتی مقاصد کے لئے ڈھال رہے
ہیں اور یہ سب دین کے تھوڑے سے عنصر کو شامل کر کے صرف حکومت
ہی میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں جاری و ساری ہے۔

اس نو آبادیاتی نظام نے کئی نسلیں پروان چڑھائیں جو وزارت تعلیم
کی نگراں عقلیت اور اس منطق و فلسفہ سے مالا مال ہیں کہ اسلام دور
انحطاط کی ایک یادگار ہے اور جمود و جہالت کے الزام سے بچنے کے لئے
اور مصر کی آزادی و ثقافت کو روشن رکھنے کے لئے اس سے پیچھا چھڑانا
ناگزیر ہے۔

مصری مدارس اور کتب میں تاریخ کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ
آخر سامراج نے کسی مقصد کے تحت ہی شروع کیا تھا۔ مقصد تھا کہ
قومی و دینی روح کو یکساں طور پر قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا

ایک طالب علم بلکہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل بھی تاریخ کے مطالعہ سے فارغ ہوتا ہے اور اسے اسلام کی اجتماعی فکر اور اس کے انسانی نظریہ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ تاریخ اسلامی کے نام پر بس غزوات وسرایا اور واقعات وحادثات کا انبار جمع کر لیتا ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اسلام ایک جنگی تحریک تھی اور وہ کبھی فکری انقلاب یا اجتماعی یا انسانی پیغام نہیں تھا۔"[۱۴]

اس طرح سید قطب نے مصر کے اندرونی نظام پر انگلی رکھ کر بتایا کہ خرابی کہاں ہے۔ وزارت تعلیم پر آپ نے خاص توجہ دی اور نظام تعلیم، طریق تعلیم اور نصاب تعلیم پر کافی تنقید کی کیونکہ فاضل مصنف کو تعلیم وتدریس کا کافی تجربہ تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے انسپکٹر آف اسکولس تھے اور امریکہ جاکر آپ نے ولسن ٹیچرس کالج، گریلی کولوراڈو ٹیچرس کالج، واشنگٹن اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں تھوڑے وقفہ کے لئے قیام کیا اور وہاں کے نصاب ونظام تعلیم کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور انگریزوں کو امریکیوں کی اس چال کا علم ہوا کہ

توپ کھسکی، پروفیسر پہونچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

تعلیم کے ذریعہ مغربی نظام نے نئی نسل کے اندر جو تباہ کن جراثیم پھیلائے اور کتابوں اور خطبات کے ذریعہ نوجوانوں کو اخلاقی اقدار اور مذہبی تعلیمات سے بیگانہ کیا اس پر سید قطب کی گہری نگاہ تھی اسی لئے اپنی تنقیدوں کا زور

وزارت تعلیم پر صرف کرتے رہے ہیں۔[۱۵]

مذہبی ٹھیکیداروں کا جائزہ

سید قطب نے ان تنخواہ دار سرکاری علماء پر بھی کڑی تنقید کی اور طاغوت کی حکمرانی میں ان کے ظالمانہ کردار پر انگلی اٹھائی جنھیں عوام غلطی سے مذہب و ملت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خواہشات کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ایک طرف ذہنی تنگی اور مسلکی تعصب میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری طرف روح اسلام سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"فکر اسلامی کا چہرہ مسخ کرنے میں استعمار کی مدد کرنے والا ایک عنصر اور ہے جس سے زیادہ مفید اور بار آور عامل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ شیوخ اور درویش ہیں جنھیں عوام الناس نے دینداری کا سرٹیفکیٹ عطا کر رکھا ہے۔ جمودِ فکر اور تنگئ ذہن کی بہترین نمائندگی یہی لوگ کرتے ہیں۔ خرافات اور جہالت کے سراپا ترجمان ہوتے ہیں اور ان ساری غیر اسلامی و غیر انسانی رسوم و روایات پر دین کا لیبل لگا دیتے ہیں اور دین کی وکالت اس طرح کرتے ہیں کہ آدمی کو اس سے نفرت آجائے اور وہ منہ موڑ کر دوسری طرف چلا جائے۔ یہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں بڑے گھناونے جرائم کرتے ہیں اور دین کے احترام و تکریم اور افادیت کو مشکوک بنا دیتے ہیں خاص طور پر جبکہ آیاتِ الٰہی کے عوض یہ سودے بازی کرنے پر اتر آتے ہیں اور قرآن و اسلام کے نام پر ظلم و استحصال کی مدد کرنے لگتے ہیں۔"[۱۶]

ہر مجدد ملت اور مصلح وقت نے ان علمائے سوء کے کردار پر تنقید کی ہے۔ باطل نے ہر دور میں اپنے مظالم اور غیر اسلامی اقدامات کی تائید علمائے دین اور جاہل مشائخ

سے حاصل کی ہے۔ انھی دنیا دار مذہبی رہنماؤں کی بدولت وہ ہر زمانے میں اسلام کا لیبل لگا کر غیر اسلام کی ترویج کرتا رہا ہے اکبر کے دین الٰہی کی ایجاد میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ مثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کا جواز حاجی ابراہیم سرہندی نے نکالا تھا۔ بادشاہ کے سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خاں بدخشانی نے دیا تھا اور ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا کہ ہائے مجھے یہ کیوں نہ سوجھی[17]۔ غرضیکہ اس کے دور میں جتنی خرافات پرورش پائیں ان سب کا سہرا علمائے سوء ہی کے سر بندھتا ہے چنانچہ مجدد سرہندیؒ کو ان علمائے سوء کے خلاف بھی محاذ بنانا پڑا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشرہ کے تمام طبقوں پر تنقید کرنے کے ساتھ علمائے دین اور طالبانِ علم دین کو بھی خطاب کیا اور ان کے نقائص پر بھرپور چوٹ کی[18]۔ سید قطب نے بھی انھیں معاف نہ کیا اور ان کی دنیا دارانہ روش پر گرفت کی۔

اس طرح سید قطب نے استعماری صحافت کا بھرپور جائزہ لیا اور اس پر بھی تنقید کی۔ اخبارات و رسائل جو ہمیشہ جمہوری مفادات کا دم بھرتے ہیں اور ملک کی سالمیت و یکجہتی کا نعرہ لگاتے ہیں، کس طرح بڑی طاقتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں اور معاشرے کو اسلامی و اخلاقی عادلانہ قدروں سے دور رکھنے کے لئے کیا حربے اپناتے ہیں ان پر آپ نے بے لاگ گفتگو کی[19]۔

سید قطب کی یہی وہ تنقیدی نگاہ اور سیاسی بصیرت تھی جس کی وجہ سے دشمنوں کی نگاہ میں آپ خار کی طرح کھٹکتے تھے اور امریکہ، روس اور مصر کی استعماری نام نہاد شاہی اور پھر بعد میں فوجی حکومت آپ کے خلاف سازشوں کے جال بُننے میں ہمیشہ مصروف رہتی تھیں۔ آپ کی شخصیت میں وہ مومنانہ فراست بدرجۂ اتم موجود تھی جس سے ہر دور میں شیطان اور اس کے حواری لرزاں رہے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ یوسف العظم، الشہید سید قطب، دار القلم بیروت ۱۹۸۰ء ص ۲۰۶

۲۔ مثال کے طور پر سوڈان میں اخوان المسلمون نے نمیری حکومت کے ساتھ تعاون کر کے جو کچھ حاصل کیا اور عوام میں اثر و نفوذ اور حکومتی مشینری میں عمل دخل حاصل کرنے کی جو کوشش کی اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا نقصان جو اس تعاون کا ہوا وہ تحریک کی انقلابیت کی منفعلانہ حیثیت تھی۔ انقلاب اسلامی کا پورا تصور مجروح ہوا۔ مزید برآں نمیری حکومت نے تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر اس کے خلاف جو اقدامات کئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ تحریک کو عوام کی نظر میں بدنام کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جو حکومتی اداروں کی طرف سے رچی گئی تھی۔ اس تجربہ سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ حکمرانوں کے ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام چلانے اور ان میں تعاون دینے کی پالیسی بہت زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اس سے تحریک اسلامی کو نقصان پہونچنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

۳۔ یہاں امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ جناب ڈاکٹر عرفان احمد کی ایک گفتگو نقل کرنا دلچسپ ہوگا۔ انھوں نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ء علی گڑھ میں منعقدہ افسو [International Islamic Federation of Student Organazations] ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات نقل کی کہ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندوستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ

میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وہ اس مسئلے میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں۔

۴۔ انور سادات کی ڈائری یا دلدی ھنذا عمک جمال الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر بتاریخ ۱۱ر۸ر ۱۹۶۵ء ۳۱۲۔

۵۔ السلام العالمی والاسلام، مکتبہ وھبۃ مصر، الطبعۃ الثانیۃ۔ ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔

۶۔ نفس مصدر، ص ۱۵۹۔ ۱۶۰۔

۷۔ نفس مصدر، ص ۱۶۰۔ ۱۶۲۔

۸۔ نفس مصدر، ص ۱۶۳۔ ۱۶۴۔

۹۔ نفس مصدر، ص ۱۶۴۔

۱۰۔ نفس مصدر، ص ۱۶۵۔

۱۱۔ نفس مصدر، ص ۱۶۶۔

۱۲۔ العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبعۃ عیسٰی بابی الحلبی مصر، چھٹا ایڈیشن، سنہ ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۰۔ ۲۹۱

۱۳۔ السلام العالمی والاسلام، ص ۱۷۱۔ خود ہندوستان میں یہی صورت حال تھی۔ جب انگریزی فوج یہاں حملہ آور تھی تو ہندو اور مسلم خاندان کتنے ایسے تھے جنھوں نے ہندوستانی مصالح و مفادات کے علی الرغم انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ مل کر لوٹ کھسوٹ مچائی اور انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے باوجود آزاد ہندوستان میں اقتدار میں سب سے زیادہ شرکت انہی کی ہے اور اپنی بے ضمیری اور تملقانہ ذہنیت کی وجہ سے حکومت کے مناصب سے زیادہ وہی اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح مراکش میں

مسلم باشندوں پر فرانسیسی حملے کے وقت کچھ مسلمان خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں سے غداری کرکے فرانس کی فوج کا ساتھ دیا، اُن میں ایک مشہور نام الجلادی بھی ہے جس نے فرانسیسی حملہ میں اپنا بیٹا بھی کھو دیا تھا لیکن اسے کوئی ندامت نہ تھی۔

۱۴۔ معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ، مطبعۃ دار الکتاب العربی، قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۱۲۷ — ۱۲۸

۱۵۔ بدقسمتی سے آج تک پورے عالم اسلام میں وہی مغربی نظام تعلیم رائج ہے۔ ادھر چند برسوں میں علوم وفنون کی اسلام کاری (Islamization of Knowledge) کی مہم بڑے زور شور سے اٹھی لیکن دشمنوں نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا اور اس کے مایۂ ناز کارکن تحریک اسلامی کے معروف خادم جناب پروفیسر اسماعیل راجی الفاروقی کو امریکہ میں شہید کر دیا۔ یہ تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ دیکھئے اس کے مسلم دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۱۶۔ معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ، ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۹

۱۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے خاکسار کی کتاب "تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے تناظر میں" ہندوستان پبلی کیشنز: دہلی ۱۹۸۴ء ص ۱۰۶۔

۱۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، التفہیمات الالٰہیہ، جلد دوم ص ۱۳۴ ۔ ۱۳۵

۱۹۔ تفصیل کے لئے دیکھئے معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ ص ۱۵۲ ۔ ۱۵۳۔

اسلامی عہد میں اسپین کی علمی و تاریخی کیفیت

(۳)

جناب محمد علی جوہر، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پندرھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی حکومت اسپین سے مکمل طور پر ختم ہو گئی لیکن اس کے سو سال بعد تک ان کی تہذیب پورے طور پر یہاں باقی رہی حتی کہ یہاں آج بھی مسلم تہذیب کے باقی ماندہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً اسپینی زبان میں ہزاروں الفاظ آج بھی عربی زبان کے موجود ہیں بلکہ یہ الفاظ یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی گھل مل گئے۔ اور جدید تحقیق کی سان پر چڑھ کر یہ الفاظ اپنی حقیقت آشکارا کر رہے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کے رسم و رواج یا ان کے بعض اجزاء کو آج بھی اسپین کی معاشرت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کسی قوم کی سیاسی ترقی اور حکومت و سلطنت کا عروج محض فتوحات یا کثرت افواج سے نہیں ہوتا۔ اگر فوجی قوت یا سیاسی اقتدار سے قوموں کی ترقی ہوا تو چنگیز و ہلاکو کی قوم سب سے آگے ہوتی۔ قومی ترقی ہمیشہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور فکر و نظر سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کے ساتھ ساتھ اگر علوم و فنون، تحقیق و تدقیق، اخذ و فیض اور علمی کوششوں کا ذہن نہ پہنچتا تو یہ فتوحات

ہرگز دیرپا ثابت نہ ہوتیں اور دین واخلاق اور اخلاص واحسان کی خوبیاں اس پرمستزاد ہیں جس نے ایک مکمل صالح اور پرکشش نظام زندگی عطا کی، جس سے اغیار بھی ان کی قدر دانی پر مجبور ہوئے اور اسی سے ان میں وہ وسیع النظری بھی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے غیر اقوام کو ان کے علوم وفنون اور تہذیب واخلاق سے آزادانہ خوشہ چینی کا موقع ملا۔

اسپین میں علماء، حکماء اور صلحاء کے درس وافادے کی جو مسند بچھائی گئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسویں صدی عیسوی تک ہسپانیہ کے ہر شہر میں مدرسے، کالج، کتب خانے عام ہو چکے تھے۔ عربی کتابوں کی دکانیں کوچے کوچے میں نظر آتی تھیں۔ بڑے شہروں اشبیلیہ، طلیطلہ، غرناطہ اور قرطبہ میں بڑے بڑے کالج تھے جن میں جامعہ قرطبہ کو مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی جہاں انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ سے آکر طلبہ داخلہ لیتے اور عربی زبان سیکھتے۔ عرب عہد عباسیہ میں ہمہ جہت علمی ترقیوں کا منبع ومرکز بن چکا تھا۔ یہاں قدیم یونانی علوم کو ہی منتقل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ہندستان سے سنسکرت کے عالم اور ریاضی دانوں کو بلا کر علم کی ایک ایک شاخ کو مکمل کر لیا گیا تھا۔

بعد میں اس سرمایہ میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور اپنی پوری شان وشوکت اور آن وبان کے ساتھ یہ سرمایہ اسپین پہونچا تھا۔ اسپین کے مدارس اور جامعہ قرطبہ کے ان طلبہ کے ذریعہ یہ سرمایہ حسب ضرورت یورپ کے ممالک کو منتقل ہوا۔ اسلامی دنیا میں بغداد کے بعد دوسرا علمی مرکز قرطبہ تھا۔ محدود صفحات میں ہم ان تمام علوم وفنون کا مختصر ذکر بھی نہیں کر سکتے جو مسلم اسپین میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ذیل میں ہم صرف خاص خاص علوم کا اجمالی ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلم ہسپانیہ یا اندلس کی علمی کاوشوں کے وسیع دائرے کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکے۔

۱۔ فلسفہ:

فلسفے کے میدان میں اسپین کے مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفے کی تاریخ میں اگر اندلس کے مسلم فلسفیوں کو شامل نہ کیا جائے تو اسلامی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی۔ اس میدان میں خاص طور پر ابن رشد، ابن طفیل اور ابن باجہ کے نام زیادہ اہم ہیں اور ان میں بھی خاص طور پر پہلے دو نام ہیں۔ ابن رشد کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ابن رشد کا تعلق بارہویں صدی عیسوی سے ہے۔ فلسفے میں ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ارسطو کی کتابوں پر تنقید کی اور بہت سی غلطیوں کی اصلاح بھی کی۔ ارسطو کی بعض کتابیں ابن رشد کی تنقید کے ذریعہ سے ہم تک پہونچی ہیں۔ اس تنقید کے علاوہ ابن رشد کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی فلسفے کو اسلامی عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی۔ سولہویں صدی کے آخر تک ابن رشد کے فلسفہ کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ امام غزالی نے گیارہویں صدی میں یونانی فلسفے کے دفاع میں امام غزالی کی کتاب کا جواب لکھا۔ ابن رشد نے ایک طبیب کی حیثیت سے بھی بڑا نام پایا اور شاہی طبیب کا درجہ حاصل کیا لیکن اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے زندگی کے آخر میں ان کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔

ابن طفیل:

ابن طفیل کا تعلق بھی بارہویں صدی سے ہے۔ ابن رشد کے ساتھ ان کا تعلق استاد کے علاوہ دوست جیسا بھی رہا۔ بلکہ ابن رشد کی ترقی کا ذریعہ بھی یہی بنے تھے۔ مسلم فلسفیوں میں ان کا مقام بلند ہے اگرچہ ابن رشد کے مقام تک نہیں

پہونچے ۔ انھوں نے بھی اسلامی فکر اور یونانی فلسفے کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ ان کا اہم کارنامہ وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے فلسفہ کو ایک ایسے شخص کی زندگی کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک ویران جزیرے میں اکیلا پرورش پاتا ہے ۔ اور ہر چیز کو آہستہ آہستہ خود اپنے تجربے اور دماغ سے سیکھتا اور سمجھتا ہے اور یہاں تک کہ ایک بڑا فلسفی بن جاتا ہے ۔ اس کتاب کا نام "حی بن یقظان" ہے ۔

ابن باجہ :

ابن باجہ پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے ۔ ان کا اصلی نام محمد تھا ۔ ابتدائی زندگی شاعری میں گذری ۔ انھوں نے ایک مرتبہ ابوبکر یعنی ابراہیم سرقطہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا اس پر امیر نے خوش ہو کر ان کو اپنا وزیر بنا لیا ۔ ۵۱۲ھ میں ابن باجہ اپنا وطن چھوڑ کر مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے مراکش پہونچے ۔ وہاں کے بادشاہ یوسف بن تاشقین نے انھیں اپنے دربار میں وزیر بنا لیا اور تقریباً بیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے ۔ ابن باجہ نے جوانی کے عالم میں ۵۳۳ھ میں شہر فاس میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ۔ ابن باجہ بہت بڑے فلاسفر اور ادیب تھے ۔ صرف و ہیئت میں بھی انھیں مہارت تھی ۔ وہ فلسفہ کے اتنے زبردست عالم تھے کہ جلال الدین سیوطی نے فلسفے میں مغرب کا ابن سینا تسلیم کیا ہے ۔ اس کے علاوہ ابن باجہ نے منطق اور ریاضی پر بھی کتابیں لکھیں ۔

تاریخ :

تاریخ کے میدان میں سب سے اہم نام ابن خطیب اور ابن خلدون کا ہے ۔

ان دونوں کا تعلق اسپین کی مسلم حکومت کے اس آخری دور سے ہے جبکہ صرف غرناطہ میں مسلمانوں کی حکومت رہ گئی تھی۔ دونوں نے غرناطہ کے دربار سے بلند مقام حاصل کیا اور وزیر بھی بنے لیکن آپس کے اختلاف کی وجہ سے ابن خلدون غرناطہ کے دربار کو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ ابن خلدون نے بعد کی زندگی شمالی افریقہ اور مصر میں گزاری اور مصر کے سفیر بن کر تاتاری بادشاہ تیمور سے صلح کی بات چیت کرنے گئے۔ اس کے برعکس ابن خطیب نے اپنی زندگی غرناطہ میں ہی پوری کی۔

علامہ ابن حزم نے مذہبوں کی تاریخ میں ایک نہایت زبردست کتاب لکھی، اس میں اسلام، عیسائیت، یہودیت کی تاریخ کے ساتھ اسلام کے اندر پیدا ہونے والے مختلف فرقوں کی تاریخ بھی شامل ہے۔ یہ اس موضوع پر پہلی قابل ذکر کتاب ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے میدان میں سب سے اہم کارنامہ ابن خلدون کا ہے۔ جنھوں نے ساری دنیا کی تاریخ اور خاص طور پر شمالی افریقہ کی بربری قوم کی مکمل تاریخ بہت عمدہ لکھی ہے۔

ابن خلدون کی سب سے مشہور کتاب عرب اور بربر قوموں کی تاریخ ہے لیکن اس کتاب سے بھی زیادہ مشہور کتاب کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ فلسفۂ تاریخ پر ہے اور اس کو آج عمرانیات (SOCIOLOGY) کی پہلی کتاب اور ابن خلدون کو اس فن کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابن خلدون دنیا کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس مقدمہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ابن خلدون شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تاریخ کے میدان میں ان کی شخصیت زیادہ اہم اور حیثیت زیادہ مسلّم ہے۔ ان کا کارنامہ غرناطہ کی وہ تاریخ ہے جو اپنے موضوع پر آج تک واحد و بے نظیر کتاب ہے۔

علم طب :

طب بالخصوص جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں مسلم اسپین کا حصہ بہت زیادہ اور اہم ہے اور اس میدان میں سب سے اہم نام ابن زہر اور ان کے خاندان کا ہے جن میں چھ نسلوں تک بڑے بڑے طبیب اور حکیم پیدا ہوتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ابن رشد کا نام بھی آتا ہے ۔ ابن رشد فلسفی ہونے کے علاوہ زبردست طبیب بھی تھے اور خاندان زہر کے ساتھ مل کر علامہ ابن رشد نے فن طب کی کلیات لکھی یعنی وہ کتاب جس میں علاج کے اصولوں پر اور امراض کی قسموں پر نظریاتی طور پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ساتھ ہی مختلف بیماریوں کی دوائیں اور ان دواؤں کی خصوصیات کو بھی تفصیل سے لکھا ہے ۔ اس میں انھوں نے جڑی بوٹیوں کے میدان میں ابن زہر کے تجربے سے بہت فائدہ اٹھایا جنھوں نے سینکڑوں نئی جڑی بوٹیاں دریافت کیں ۔ تجربے سے ان کی خصوصیات معلوم کیں اور بتایا کہ کن بیماریوں میں اور کس طرح یہ بوٹیاں مفید ہیں اور ان جڑی بوٹیوں کے نام بھی انھوں نے رکھے تھے ۔ خود ابن طفیل بھی اسپین کے بڑے طبیب تھے لیکن علم طب میں ان کی تحریر نہیں ملتی ۔

ادب :

مسلم اسپین میں عربی ادب اور شاعری کو بھی فروغ ملا ۔ عربی شاعری میں بعض نئی قسموں کا بھی اضافہ ہوا ۔ اسپین کے مسلم زعماء اور عام مسلمان ہی نہیں بلکہ بادشاہوں نے بھی گہری دلچسپی لی ۔ زجل اور موشحات اسپین کی عربی شاعری کی اہم اصناف ہیں جو یہاں پیدا ہوئیں ۔

اسپین میں بنو امیہ کی حکومت کے پہلے ادیب عبدالرحمٰن الداخل کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا تھا اور اس کے بعد کے مسلمان حکمرانوں میں ہشام، حکم، عبدالرحمٰن سوم وغیرہ بھی بیشتر اچھے شاعر تھے۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد اشبیلیہ کے عبادی خاندان کے بادشاہ معتمد کو اسپین کے بڑے شاعروں میں سمجھا جاتا تھا اور ان کے بھی بہت سے اشعار محفوظ ہیں۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر ابن زیدون خیال کیا جاتا ہے۔ ابن زیدون نے زیادہ تر موشحات کی صورت میں شاعری کی ہے۔ اس کے اشعار بڑے سادہ اور پرتاثیر ہوتے ہیں اور اس کے زیادہ تر شعروں کا تعلق اس کی محبوبہ ولادہ سے ہے۔ جو بنو امیہ کے آخری دور سے تعلق رکھنے والی ایک خلیفہ کی بیٹی تھی اگرچہ یہ دونوں آپس میں گہری محبت رکھتے تھے لیکن مختلف وجہوں سے اس کی شادی نہیں ہوسکی ابن زیدون خلیفہ مکتفی کے دربار میں وزیر تھے اور بنو امیہ کی حکومت ختم ہونے کے بعد اشبیلیہ کے بادشاہ ابن عباد کے دربار میں فوج کے سپہ سالار تھے۔ اس کے بعد کی زندگی اشبیلیہ میں گزار دی۔

فرانس اور انگلینڈ جو جہالت کے شکار تھے۔ وہاں کے طلبہ اسپین کی جامعات سے علوم و فنون کی سندیں حاصل کرنے کی بدولت اپنے ملکوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن سکے۔ انگریزی شاعر چاسر کے عہد میں یہ فیضان عام ہو چلا تھا۔ پورے مغرب میں چودھویں اور پندرہویں صدی میں رونما ہونے والی نشاۃ ثانیہ کے لئے جس نے خشت اول کا کام کیا وہ دراصل اسپین کے ہی اسلامی مدارس تھے اور مابعد کی تمام علمی و ادبی ترقیوں کا سہرا بجا طور پر اسپین کے مسلم حکمرانوں کے سر بندھتا ہے۔ بالفاظ دیگر یورپ اگر اسپینی مسلمانوں کے علوم سے استفادہ نہ کرتا تو آج سینکڑوں سال پیچھے ہوتا۔

آج اسپین میں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے لیکن مسلم عہد کے اسپین کی تہذیب و تمدن اور علمی فتوحات کے تابندہ نقوش اب بھی اسلامی تاریخ کے صفحات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

ماخذ:

اس مضمون کی تیاری میں جو کتابیں زیر مطالعہ رہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ "تاریخ اندلس"۔ مولانا سید ریاست علی ندوی
۲۔ "اخبار مجموعہ" اسلامی اندلس کی ایک جامع عربی تاریخ۔ مولوی زکریا صاحب مائل
۳۔ "اخبار الاندلس" منشی محمد خلیل الرحمٰن صاحب
۴۔ "مسلمان اندلس میں" رشید اختر ندوی
۵۔ "دولت ہسپانیہ عرب" مرتبہ شمیم انہولوی
۶۔ A POLITICAL HISTORY OF MUSLIM SPAIN BY S.M IMAMUDDIN
۷۔ SPANISH ISLAM, A HISTORY OF THE MUSLIMS IN SPAIN. BY REINHART DOZY
۸۔ A LITERARY HISTORY OF THE ARABS BY REYNOLD NECHOLSON

قرآن کریم میں ترادف

(دوسری قسط)

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی
پروفیسر مطالعات قرآنی شعبہ دینیات،
جامعہ القرویین مغرب

عربی سے ترجمہ:۔
محمد رضی الاسلام ندوی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مبرد نے دو مختلف الفاظ ایک معنی کیلئے آنے کی جو مثالیں دی ہیں وہ محل نظر ہیں اس لیے کہ ظن وحسب اور قعود وجلوس اور ذراع وساعد اور انف ومعطس مترادف نہیں ہیں۔ مبرد دوسری جگہ ترادف کا انکار کرتے ہیں جیساکہ ہم آگے نقل کریں گے۔

ترادف کے قائلین میں قطرب، فخر الرازی، تاج السبکی قابل ذکر ہیں تقریب قریب یہی سیوطی کا بھی مسلک ہے۔ جبکہ دوسرے علماء ترادف کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ان میں سے "ثعلب" بھی ہیں جنھوں نے ابن اعرابی کا قول نقل کیا ہے

"دو الفاظ جنھیں اہل عرب نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے ان میں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں۔ بسا اوقات ہمیں وہ معلوم ہوگیا ہے تو ہم نے بتلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکے

ہیں کہ اہلِ عرب کو بھی وہ معلوم نہیں تھے"۔

ثعالبی نے 'فقہ اللغہ' میں جو مسلک بیان کیا ہے اسکی رو سے وہ ترادف کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ابن الانباری 'کتاب الاضداد' میں کہتے ہیں کہ ایک معنی کیلئے دو الفاظ ہوں تو ان کے پیچھے پوشیدہ لغوی علت ہوتی ہے ان میں سے ہر لفظ معنی میں دوسرے لفظ سے کچھ مختلف ہوتا ہے" بسا اوقات دونوں میں فرق اتنا دقیق ہوتا ہے کہ اسے صرف عربی زبان جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے"۔[1]

ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب 'الفروق اللغویہ' تصنیف کی جس میں ایسے الفاظ کے معنی کے درمیان دلالتوں کے فرق بیان کئے ہیں۔ جنھیں مترادف کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں ایک باب ہے" فی الابانۃ عن کون اختلاف الالفاظ فی لغۃ واحدۃ یوجب اختلاف المعانی" (اس چیز کا بیان کہ ایک زبان میں الفاظ کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے) جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب ایک زبان میں دو الفاظ ایک معنی یا ایک چیز کیلئے آئیں تو ان میں سے ہر ایک کا مقتضی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دوسرا فضول اور زائد قرار دیا جائے جس کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ کہتے ہیں:

"یہی محققین اہلِ علم کا مسلک ہے ۔۔۔۔ اسی کی طرف مبرد نے ارشاد باری 'لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا' کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے۔ کہا ہے کہ" منہاج کا عطف شرعۃ پر ہے اس لیے کہ شرعۃ چیز کے ابتدائی حصے کو کہتے ہیں اور منہاج اس کے بڑے اور وسیع حصے کو ۔۔۔ چیز کا عطف چیز پر اس وقت صحیح ہوگا جب ایک معنی میں دوسرے

---

[1] ابن الانباری: الاضداد ص۷

سے مختلف ہو، خواہ دونوں کا مرجع ایک ہی ہو۔ لیکن جب دوسرے سے مراد وہی ہو جو پہلے سے ہو تو ایک کا دوسرے پر عطف نہ ہوگا۔

ابوہلال کہتا ہے کہ: "یہاں مبرد نے عطف کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں عربی زبان میں جو دو الفاظ ایک معنی میں آئے ہیں جیسے العقل واللب، المعرفۃ والعلم، الکسب والجرح، العمل والفعل۔۔۔ ان کا ایک دوسرے پر عطف جائز ہے اس لیے کہ ان دونوں میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زید کا عطف ابو عبداللہ پر جائز نہ ہوتا اس لیے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔۔۔۔ جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک لفظ دو معانی کیلئے استعمال ہو اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ ایک معنی پر دلالت کریں۔ اس لیے کہ اس سے زبان میں بے فائدہ اضافہ ہے"۔

ابن فارس نے اپنی کتاب "الصاحبی" میں لکھا ہے:

"ہمارا مسلک یہ ہے کہ ایک چیز کے بارے میں وارد متعدد صفات میں سے ہر صفت کے معنی دوسری صفت کے معنی سے مختلف ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہوں مگر معنی ایک ہی ہو"

× × ×

میری معلومات کی حد تک یہ مسئلہ معلق رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے جدید لغوی مطالعات کے لغت، صوتیات اور اجتماع کے علوم کی جدید تحقیقات سے ملنے کے بعد بھی عربی کے اہل زبان کسی رائے پر متفق نہ ہو سکے۔ اگرچہ ترادف کا مسلک بعد کے زمانوں میں غالب اور رائج رہا۔ اور آج فقہ اللغہ اور علم الاجتماع

اللغوی کے متعدد ماہرین اس کے قائل ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر علی عبد الواحد قابل ذکر ہیں جنھوں نے مجلۃ الثقافہ ۱۹۶۳ء میں ایک مقالہ "عربی زبان کی خصوصیت" کے بارے میں قلم بند کیا تھا۔ اس میں انھوں نے عربی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عربی زبان اپنی ثروت کی وجہ سے ایک معنی دسیوں الفاظ کے ذریعے ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابراہیم انیس نے اپنی کتاب 'دلالات الالفاظ' میں عربی میں ترادف کے وجود کو قطعی طور پر ثابت کیا ہے۔ چنانچہ انھیں 'لم یسمع' 'وفی اذنیہ صمم' اور 'وفی اذنیہ وقر' تینوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا انھوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے:۔

"واذا تتلیٰ علیہ آیاتنا ولّیٰ مستکبرا کأن فی اُذنیہ وقرا (لقمان)[۵۵]

قریب کے زمانے تک دوسری بحثوں کے ساتھ ترادف کی بحث بھی المجمع اللغوی قاہرہ کا موضوع بنی رہی۔ اس کے ایک موتمر کو ننے یہ تجویز رکھی کہ ہم مترادفات کے بوجھ سے ہلکے ہونے کیلئے عربی زبان کی ایک ڈکشنری تصنیف کریں جو ایک معنی کے لیے ایک ہی لفظ کو طے کر دے جسے 'مجمع' کے ممبران الفاظ کے ڈھیر میں سے اختیار کرلیں اور بقیہ الفاظ کو مستبعد قرار دے دیں'[۵۶]

قرآن کریم عربی زبان کی عظیم کتاب ہے۔ حق یہ ہے کہ ہم اس بحث میں کسی رائے کو اختیار کرنے سے پہلے اسے کتاب عربی مبین پر پیش کریں۔ اس لیے کہ وہی

---

[۵۵] میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انیس نے بعد میں اپنے اس مسلک سے رجوع کرلیا چنانچہ وہ ترادف کے مسئلہ میں المجمع اللغوی قاہرہ میں لجنۃ الاصول کے تحت ہونیوالے مناقشہ میں، ترادف کا انکار کرنیوالوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔

[۵۶] دیکھیے مجلۃ المجمع اللغوی قاہرہ شمارہ ۸ میں احمد امین کا مقالہ۔ اس میں انھوں نے قرآن میں ترادف نہ ہونیکی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس طویل اختلاف میں فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔
قرآنی مطالعات ۔ جس میں میں عرصہ دراز سے اختصاص کر رہی ہوں۔
کے سیاق میں الفاظ قرآنی کا استقرائی تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن
اس معنی میں جس کیلئے لغت اور تفسیر کی کتابوں میں متعدد الفاظ بیان کئے گئے ہیں
ہر لفظ متعین دلالت کیلئے استعمال کرتا ہے جسے کسی دوسرے لفظ کے ذریعے نہیں
ادا کیا جا سکتا۔

• کیا دو الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں؟:
الرؤیا اور الحلم:

مثلاً سورۂ یوسف کی دو آیتوں میں:
أفتونی فی رؤیای، إن کنتم للرؤیا تعبرون (۴۳)
قالوا أضغاث أحلام، وما نحن بتأویل الأحلام بعالمین (۴۴)
لغات میں "حلم" کی تشریح "رؤیا" کے ذریعے کی جاتی ہے۔
کیا عصرِ بعثت میں خالص اہلِ عرب نہیں قرآن کے مثل ایک سورت لانے
کا چیلنج کیا گیا تھا دونوں الفاظ میں سے ایک دوسرے کی جگہ رکھ سکتے تھے اور کہہ
سکتے تھے:
أفتونی فی حلمی، ان کنتم للحلم تعبرون"؟
ہرگز نہیں۔ ایسا عربی زبان کی صحیح حس رکھنے والا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا۔
قرآن میں جب ہم ان دونوں الفاظ کا استقراء کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے
کہ دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ قرآن نے "احلام" تین مرتبہ استعمال کیا ہے۔
ان کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد پریشان کن اور پراگندہ خواب اور مخلوط

اور بے حیثیت ہونے سے ہیں۔ تینوں جگہ جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے جو خلط و تشویش پر دلالت کرتا ہے جس میں کوئی "حلم" دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتا۔

سورۂ انبیاء میں ہے:

"بل قالوا أضغاث أحلام، بل افتراه، بل هو شاعر، فليأتنا بآية كما أرسل الأولون" (الانبیاء - ۵)

دوسری جگہ عزیز کی قوم کے ساتھ درباریوں کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ جب عزیز نے ان سے کہا کہ اس کے خواب کی تعبیر بتائیں۔

"قالوا أضغاث أحلام وما نحن بتأويل الأحلام بعالمين" (یوسف ۴۴)

لفظ "رویا" قرآن میں سات مرتبہ آیا ہے۔ تمام جگہوں پر سچے خواب کے معنی میں ہے اور مفرد کے صیغے میں آیا ہے جو اس کے واضح، جلی اور صاف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

سات جگہوں میں سے پانچ جگہ انبیاء کیلئے آیا ہے جہاں اس سے مراد سچا الہام ہے جو وحی سے قریب ہوتا ہے۔

سورۂ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب:

"وناديناه أن يا ابراهيم قد صدقت الرؤيا، انا كذلك نجزي المحسنين" (۱۰۹)

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب، جب آپ کے والد یعقوب علیہ السلام نے آپ سے کہا تھا:

يا بني لا تقصص رؤياك على إخوتك، فيكيدوا لك كيداً، إن الشيطان للإنسان عدو مبين (یوسف - ۵)

اسی سورہ میں ہم اس کے سیاق کا تتبع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ خواب

شرمندۂ تعبیر ہو گیا:

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (یوسف - ۱۰۰)

سورۂ اسراء میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب:

" وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ " (۶۰)

اور سورۂ فتح میں آپؐ کا خواب:

" لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا " (۲۷)

یہ وہ پانچ مقامات ہیں جہاں قرآن نے انبیاء کیلئے " رؤیا " کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آخری دو مقامات عزیز مصر کے رؤیا کے بارے میں ہیں جو سچ ثابت ہوئے اس آیت میں قرآن نے دو مرتبہ بادشاہ کی زبان سے " رؤیا " کا لفظ ادا کیا خواب میں اس کے واضح، جلی اور صاف ہونے کی وجہ سے اگرچہ اسکی قوم کے درباری اسے ہواجس، اوہام اور برے خواب سمجھ رہے تھے:

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ۝ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ (یوسف ۴۳ - ۴۴)

قصۂ قرآنی سیاق میں جاری رہتا ہے کہ اچانک بادشاہ کا خواب سچا الہام ثابت ہوتا ہے۔ اور ڈراونا خواب نہیں ہوتا جیسا کہ اس کے درباریوں نے کہا تھا۔

آنس اور أبصر:

لغت میں آنس الشئ کے معنی دیکھنا، آنس الصوت کے معنی سننا اور استأنس کے معنی اجازت طلب کرنا بیان ہوئے ہیں۔ تو کیا پاکیزہ عربی زبان یہ جائز قرار دیتی ہے کہ قرآن جہاں "آنس نارًا" کہتا ہے وہاں اسکی جگہ أبصر یا نظر یا شھد یا دوسرے الفاظ جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ آنس کے ہم معنی ہیں۔ لائے جاسکتے ہیں۔

جب ہم قرآنی استعمال کا استقراء کرتے ہیں تو اس سے ہمیں عربی زبان کی تیز حس حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کو دیکھنے یا سننے کیلئے "آنس" نہیں کہا جائے گا جس میں کوئی انسیت نہ ہو۔ ایک عربی جب "آنست" کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے ایسی چیز دیکھی یا سنی ہے جو انسیت بخشتی ہے۔

قرآن نے فعل "آنس" کو پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ چار جگہ اس آگ کے بارے میں جسے موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا جب وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ وہ آیات یہ ہیں:

طٰہٰ۔ ۱۰: إذ رأى نارًا فقال لأهله امكثوا إني آنست نارًا لعلي آتيكم منها بقبس أو أجد على النار هدى۔

النمل۔ ۷: إذ قال موسى لأهله إني آنست نارًا سآتيكم منها بخبر أو آتيكم بشهاب قبس لعلكم تصطلون۔

القصص۔ ۲۹: فلما قضى موسى الأجل وسار بأهله آنس من جانب الطور نارًا قال لأهله امكثوا إني آنست نارًا لعلي آتيكم منها بخبر أو جذوة من النار لعلكم تصطلون۔

پانچویں جگہ سورۃ النساء میں آیا ہے:

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشداً فادفعوا الیھم اموالھم (۶)

یہاں ایناس سے مراد محض سن بلوغ کے مادی وحسی مظاہر رشد کا دیکھنا نہیں بلکہ آزمائش وامتحان کے بعد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ واقعی وہ سن رشد کو پہنچ گئے ہیں۔

اسی مادے سے سورۃ نور میں استئناس کا فعل مضارع کا صیغہ آیا ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتیٰ تستأنسوا وتسلموا علیٰ اھلھا" (۲۷)

یہاں استئناس سے مراد محض استئذان (اجازت طلب کرنا) نہیں جیسا کہ بعض مفسرین کو وہم ہوا۔ بلکہ اس سے مراد داخل ہونے سے پہلے گھر والوں کو انسیت کا احساس دلانا ہے۔

عربی زبان کا ذوق یہ گنجائش نہیں دیتا کہ پولیس ٹیکس، تفتیش یا قرضی خواہ کے اجازت طلب کرنے کے لیے استئناس کا لفظ استعمال کیا جائے گا بلکہ یہاں 'استئذان' کا لفظ استعمال ہوگا اس لیے کہ یہاں انسیت کی حس کا فقدان ہے۔ اسی طرح دشمن کو دیکھنے یا کہیں آگ لگی ہوئی دیکھنے کو یا بجلی کڑک یا پرندے کی آواز سننے کو "آنس" نہیں کہیں گے۔

النائی اور البعد:

بیشتر اہل لغت اور مفسرین النائی اور البعد دونوں کے درمیان کسی فرق کی طرف اشارہ کئے بغیر ایک کو دوسرے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن ترادف کا انکار کرنے والوں نے دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔

ہم النائی اور البعد کے قرآنی استعمال کے مقامات کا استقراء کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ 'النائی' اعراض' روگردانی اور منہ پھیرنے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں اس کا صریح سیاق دلالت کرتا ہے:

الاسراء-۸۳: وإذا أنعمنا على الإنسان أعرض ونأى بجانبه
[ساتھ ہی دیکھئے سورۂ حم السجدہ - ۵۱]

الانعام-۲۶: "حتى إذا جاءوك يجادلونك يقول الذين كفروا إن هذا إلا أساطير الأولين وهم ينهون عنه وينأون عنه وإن يهلكون إلا أنفسهم وما يشعرون"

"البعد" تو یہ قرآن میں حقیقت ومجاز پر مختلف صیغوں کے ساتھ مکانی یا زمانی بعد اور مادی یا معنوی بعد کے معنوں میں آتا ہے:

التوبہ-۴۲: لو كان عرضا قريبا وسفرا قاصدا لاتبعوك ولكن بعدت عليهم الشقة۔

الزخرف - حتى إذا جاءنا قال يا ليت بيني وبينك بعد المشرقين فبئس القرين۔

الفرقان-۱۲: إذا رأتهم من مكان بعيد سمعوا لها تغيظا وزفيرا۔

سبا-۵۲: وأنى لهم التناوش من مكان بعيد۔

هود-۸۳: وما هي من الظالمين ببعيد

الانبیاء-۱۰۱: إن الذين سبقت لهم منا الحسنى أولئك عنها مبعدون

ق-۳۱: وأزلفت الجنة للمتقين غير بعيد۔

الانبیاء-۱۰۹: وإن أدري أقريب أم بعيد ما توعدون۔

المعارج - ۶ : إنهم یرونه بعیداً ونراه قریبا۔

آل عمران - ۳۰ : یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضراً وما عملت

من سوء تود لو أن بینها وبینه أمداً بعیداً۔

سبا - ۱۹ : فقالوا ربنا باعد بین أسفارنا وظلموا أنفسهم

فجعلناهم أحادیث ومزقناهم کل ممزق۔

النمل - ۲۲ : فمکث غیر بعید فقال أحطت بما لم تحط به وجئتک

من سبأ بنبأ یقین

مندرجہ بالا تمام آیات میں مکانی یا زمانی بعد مراد ہے :

اسی طرح 'بعد' کا استعمال قرب کی ضد کے معنی میں مندرجہ ذیل آیات میں ہوا ہے :

ھود - ۹۵ : ألا بعداً لمدین کما بعدت ثمود۔

ھود ۴۴، ۶۰، ۶۸ : "وقیل بعداً للقوم الظالمین"

[ساتھ ہی سورۃ المومنون : ۴۱، ۴۴]

اسی طرح 'بعد' کا استعمال معنویات کیلئے بھی ہوتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل

آیات میں ہے :

"شقاق بعید" البقرہ ۱۷۶، الحج ۵۳، حم السجدہ ۵۲۔

"ضلال بعید" ابراہیم ۳، ۱۸، النساء ۶۰، ۱۱۶، ۱۳۶، ۱۶۷، الحج ۱۲۔

الشوریٰ ۱۸، سبأ ۸، ق ۲۷

ان تمام آیات میں 'بعد'، 'قرب' کی ضد آیا ہے جبکہ 'النائی' صرف اعراض

کے معنی میں آتا ہے جو 'توجہ' کی ضد ہے۔

الحلف اور القسم

بکثرت ایک کی تشریح دوسرے سے کی جاتی ہے اور لغت کی کتابوں میں

دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا ہے "حلف" متعدد جاہلی اشعار میں
قسم کے معنی میں آتا ہے جیسے:

النابغۃ الذبیانی: حلفت فلم أترک لنفسک ریبۃ۔

الاعشی : حلفت لہ بالراقصات الی منی۔

شاش بن عبدۃ: حلفت بما ضمّ الحجیج الی منی۔

لیکن پاکیزہ عربی زبان کی حس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ کہا جاتا ہے حلفۃ
فاجر، أحلوفۃ کاذبۃ یہ کبھی نہیں سنا گیا ہے۔ حلفت بر، احلوفۃ صادقۃ
الا یہ کہ شعر میں آئے۔ اسی طرح عرب میں کہتے ہیں "أحلف الغلام" جب لڑکا
سن بلوغ کو تجاوز کر جائے اور اسکی بلوغت میں شک کیا جانے لگے۔ اسی طرح
عرب کہتے ہیں "ناقۃ محلفۃ السنام" اس اونٹنی کے بارے میں جسکی عمر میں
شک ہو اور "کمیت محلفۃ" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسکا رنگ سرخ و سیاہ کے
درمیان ہو۔ اور "کمیت غیر محلفۃ" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا رنگ سرخ
ہو اور کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ اسی طرح کہتے ہیں: "حضار والوزن
محلفان" ان دو ستاروں کے بارے میں جو "سہیل" نامی ستارے سے قبل
نکلتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ سہیل
ہے۔ تو کیا شعر میں "حلف" کا شک و ارتیاب کے علاوہ دوسرے معنی کیلئے
استعمال ہونا ضرورت شعری کا میں سے ہے؟

جب ہم قرآن کے اعلیٰ بیان سے اس سلسلہ میں فیصلہ چاہتے ہیں تو اس
کے مکمل استقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں "ح ل ف" کا مادہ تیرہ جگہ
آیا ہے۔ اور تمام جگہ۔ بغیر کسی استثناء کے۔ جھوٹی قسم کیلئے آتا ہے۔

اکثر فعل کا اسناد منافقین کی طرف ہے۔ جیسے سورۂ توبہ کی آیات جن
میں نفاق کا کھوٹ ظاہر کیا گیا ہے:

"وسیحلفون باللہ لو استطعنا لخرجنا معکم، یھلکون انفسھم واللہ یعلم انھم لکاذبون (۴۲)

"ویحلفون باللہ انھم لمنکم وما ھم منکم (۵۶)

"یحلفون باللہ لکم لیرضوکم، واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین (۶۲)

"یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر وکفروا بعد اسلامھم (۷۴)

"یحلفون لکم لترضوا عنھم، فان ترضوا عنھم فان اللہ لا یرضی عن القوم الفاسقین (۹۶)

"ولیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ، واللہ یشھد انھم لکاذبون (۱۰۷)

ان آیات کے ساتھ منافقین ہی کے بارے میں حسب ذیل آیات بھی ہیں :

النساء ۶۱-۶۲: واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رایت المنافقین یصدون عنک صدودا، فکیف اذا اصابتھم مصیبۃ بما قدمت ایدیھم ثم جاءوک یحلفون باللہ ان اردنا الا احسانا وتوفیقا، اولئک الذین یعلم اللہ ما فی قلوبھم فاعرض عنھم وعظھم وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا"

المجادلہ ۱۴: الم تر الی الذین تولوا قوما غضب اللہ علیھم، ما ھم منکم ولا منھم، ویحلفون علی الکذب وھم یعلمون۔

المجادلہ ۱۸: یوم یبعثھم اللہ جمیعا فیحلفون لہ کما یحلفون لکم ویحسبون انھم علی شیء، الا انھم ھم الکاذبون۔

القلم ۱۰: ولا تطع کل حلاف مھین، ھماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد اثیم

فعل کا اسناد صرف ایک مرتبہ "الذین آمنوا" کی ضمیر کی طرف ہوا اس وقت النا پر

'حلف' کا کفارہ واجب ہو گیا۔

"ذلك كفارة ايمانكم اذا حلفتم" (المائدہ - ۸۹)

(۲) "القسم" تو اس کا استعمال 'سچی قسموں' کیلئے ہوا ہے۔ سورۂ واقعہ میں اس کی صفت 'عظیم' بیان کی گئی ہے۔

"وانه لقسم لو تعلمون عظيم" (۷۶)

سورۂ فجر میں اللہ تعالیٰ سوال کرتا ہے:

"هل فى ذلك قسم لذى حجر" (الفجر - ۵)

سورہ مائدہ آیات ۱۰۷-۱۰۸ میں 'قسم' وصیت کے خلاف شہادت دینے کی حرمت کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں جھوٹی قسم کی حرمت کا بیان ہے۔

سورۂ قلم میں جن باغ والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ اپنی قسم میں سچے تھے:

"إذ أقسموا ليصرمنها مصبحين، ولا يستثنون" (القلم - ۱۷)

اسی طرح وہ مجرم بھی جھوٹے نہیں ہوں گے جو قیامت کے دن قسمیں کھا کھا کر کہیں گے: "ويوم تقوم الساعة يقسم المجرمون، ما لبثوا غير ساعة" (الروم ۵۵)

قسم کا اسناد 'ضالین' (گمراہ لوگوں) کی طرف بھی ہوا ہے۔ اس لیے کہ خود ان پر اپنی گمراہی عیاں ہونے سے پہلے، ان کی قسم سچے دل سے ہوتی تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں ہے:

الانعام - ۱۰۹: "وأقسموا بالله جهد ايمانهم لئن جاءتهم آية ليؤمنن بها، قل إنما الآيات عند الله، وما يشعركم أنها اذا جاءت لا يؤمنون"

فاطر - ۴۲: وأقسموا بالله جهد ايمانهم لئن جاءهم نذير ليكونن أهدى من إحدى الأمم، فلما جاءهم نذير ما زادهم إلا نفورا

الأعراف - ۴۹: "ونادى أصحاب الأعراف رجالا يعرفونهم بسيماهم،

قالوا ما أغنى عنكم جمعكم وما كنتم تستكبرون، أهولاء الذين أقسمتم لا ينالهم الله برحمة"

ابراھیم - ۴۴: "وأنذر الناس يوم يأتيهم العذاب فيقول الذين ظلموا ربنا أخرنا إلى أجل قريب نجب دعوتك ونتبع الرسل، أولم تكونوا أقسمتم من قبل ما لكم من زوال"

النحل - ۳۸: "وأقسموا بالله جهد أيمانهم لا يبعث الله من يموت بلى وعدًا عليه حقا ولكن أكثر الناس لا يعلمون۔"

سورہ مائدہ میں ہے:

ويقول الذين آمنوا أهولاء الذين أقسموا بالله جهد أيمانهم انهم لمعكم حبطت أعمالهم فاصبحوا خاسرين (۵۳)

اس کے سیاق میں اس بات کا احتمال ہے کہ یہ قسم منافقین کی اس آزمائش سے پہلے کی ہو جس سے ان کا کذب ظاہر ہو گیا ہو۔

اس بیان قرآنی کے سامنے یہ بات آسان نہیں کہ ہم قسم کی تشریح حلف سے کریں قرآن کا انداز ان دونوں کے درمیان دقیق فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر ہم یہ نہ کہیں کہ 'قسم' علی الاطلاق سبھی قسموں کیلئے (خواہ وہ حقیقی طور ہوں یا وہمی طور پر) کیلئے آتا ہے۔ اور 'حلف' جھوٹی قسموں کیلئے۔ تو کم از کم یہ تو کہہ ہی سکتے ہیں کہ ان کی دلالتوں میں عام و خاص کا فرق ہے۔ قسم کا اطلاق تمام قسموں پر ہوتا ہے اور حلف جھوٹی قسموں کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ بیان قرآنی کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔

التصدّع اور التحطّم:

سورۂ حشر کی آیت ہے:

"لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعاً من خشیۃ

اللہ وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون" (الحشر - ۲۱)

اس آیت میں "تصدع" "تحطم" کے مترادف نہیں ہے۔

"تصدّع" صدع سے مشتق ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں ٹھوس اجسام کا پھٹنا

عربی میں مجازاً صداع (درد سر) کیلئے استعمال کرتے ہیں گویا درد اور چکر سے سر

پھٹا جاتا ہے۔ اسی معنی میں سورۂ واقعہ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

"لا یصدّعون عنھا ولا ینزفون" (۱۹)

اسی طرح معنوی طور پر "تصدّع" تفریق و تمزق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

اور "الصدع بالامر" کے معنی ہیں "کسی قطعی بات کے ذریعے کسی کام کا فیصلہ کرنا"

اسی معنی میں سورۂ حجر کی آیت ہے

"فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین" (۹۴)

لیکن "حطم" کے معنی عربی میں "ھشم" (چور چور ہونے) کے ہیں۔ اس کا استعمال

ان چیزوں کے ساتھ خاص ہے جو خشک ہوں۔ خواہ سخت اور ٹھوس ہوں یا نہ ہوں یا

عربی میں شیر کو "حطوم" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ شکار کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے اور

ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اسی طرح منحوس سال کو حاطوم اور حطمۃ کہتے ہیں اس

شخص کو جو ہر چیز نگل لے پھر بھی پیٹ نہ بھرے۔ "رجل حطم" کہتے ہیں۔ اور سنگ

دل چرواہے کو راع حطمۃ یا راع حطم کہتے ہیں۔ گویا وہ جانوروں کو ہانکتے وقت

اپنی سختی سے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

یہ اصل معنی (یعنی سختی اور سنگ دلی کے ساتھ توڑ پھوڑ) قرآن کے ان

چھ مقامات میں پایا جاتا ہے جہاں اس مادہ کا استعمال ہوا ہے۔

سورۂ نمل میں ہے:

قالت نملة یاأیها النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون (۱۸)

سورۂ الزمر اور سورۂ الحدید میں زرد، سوکھی اور چورچور کیلئے حطام کا لفظ آیا ہے:

"ألم تر أن اللہ أنزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع الأرض ثم یخرج بہ زرعا مختلفا ألوانہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یجعلہ حطاما (الزمر-۲۱)

"اعلموا أنما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الأموال والأولاد کمثل غیث أعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما (الحدید-۲۰)

سورۂ ھمزہ میں حطمۃ اس آگ کیلئے آیا ہے جو لوگوں پر طعن کرنے اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والے شخص کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی:

"الذی جمع مالا وعددہ، یحسب أن مالہ أخلدہ، کلا لینبذن فی الحطمۃ وما أدراک ما الحطمۃ، نار اللہ الموقدۃ" (۲-۶)

حطم کا استعمال جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے چورچور ہوجانے والی اور خشک چیزوں کیلئے ہوتا ہے جبکہ تصدع کا استعمال سخت اور ٹھوس چیزوں کیلئے ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ حشر میں پہاڑ کیلئے ہوا اور سورۂ طارق کی مندرجہ ذیل آیت میں زمین کیلئے ہوا ہے:

"والسماء ذات الرجع، والأرض ذات الصدع، إنہ لقول فصل وما ھو بالھزل" (۱۱-۱۴)

الخشوع والخشیۃ اور الخضوع والخوف

سورۂ حشر میں پہاڑ کیلئے تصدع کا لفظ اس کے اصل لغوی معنی میں

استعمال ہوا ہے۔ اس میں بیان کا اعجاز یہ ہے کہ خشوع کی نسبت پہاڑ کی طرف کی گئی ہے جبکہ پہاڑ کی شان یہ نہیں ہے کہ اس پر خشوع یا خشیہ طاری ہو۔ خشوع اور خشیہ دونوں دل کے افعال ہیں۔ جن کا صدور جمادات سے نہیں ہوتا۔ یہ بیان اس کا اعجاز ہے کہ اس نے بے جان پتھر میں زندگی کی روح پھونکی ہے۔

خشیۃ معنی میں خوف سے مختلف ہے اس لیے کہ اس کا صدور اس ذات کی عظمت پر سچے یقین سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ اسی طرح خشوع معنی میں خضوع سے مختلف ہے۔ خشوع کا صدور اس ذات کی جلالت سے سچے تاثر سے ہوتا ہے جس سے ہم ڈرتے ہیں جبکہ خوف قہر و دہشت کے تسلط سے بھی پیدا ہوتا ہے اور خضوع میں نفاق اور خوف کی وجہ سے تصنع یا تقیہ یا مدارات ہو سکتی ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں خشع قلبہ، وہ خضع قلبہ نہیں کہتے۔ إلا تجوزا۔

قرآن کے اس معجزانہ بیان میں حیرت انگیز نسق و ترتیب، لطیف دلالتیں اور خیرہ کن اسرار ملتے ہیں۔ قرآن خشیۃ کے مختلف صیغے دنیاوی زندگی کے بارے میں آئے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا ہی آزمائش کا میدان ہے۔

قرآن میں "خشیۃ" کی نسبت جن امور کی طرف کی گئی ہے۔ وہ ہیں غیب، قیامت، آخرت یا تنگی و پریشانی، فقر فاقہ، تجارت کا ماند پڑ جانا، یتیموں کا مال ہڑپ کر لینا اور سرکشی اور کفر کے ذریعہ تنگ کرنا۔

لیکن اس کی نسبت اگر کسی ذات کی طرف کی گئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کی نسبت کسی مخلوق کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ یہ نکتہ قرآن کے ان تمام مقامات میں پایا جاتا ہے جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یٰس ۳۱: إنما تنذر من اتبع الذكر وخشي الرحمن بالغيب
[ساتھ ہی دیکھئے آیات: ق ۳۳، الانبیاء ۴۹، فاطر ۱۸، الملک ۱۲، الرعد ۲۱، المومنون ۵۷]

البیّنۃ - ۸ : رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ، ذٰلک لمن خشی ربّہ

النازعات - ۱۹ : واھدیک إلی ربک فتخشی

الاحزاب ۳۷ : وتخشی الناس واللہ أحق أن تخشاہ

[ساتھ ہی دیکھئے آیات : المائدہ ۳، ۴۴، التوبہ ۱۳، البقرہ ۱۵۰، النساء ۷۷]

التوبہ ۱۸ : ولم یخش إلا اللہ

آل عمران : الذین قال لھم الناس إن الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم ۱

فزادھم إیمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل

قرآن میں اللہ کی خشیت کی نسبت ان لوگوں کی طرف کی گئی ہے جو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتے ہیں، جو ذکر کا اتباع کرتے ہیں، جو ایمان اور علم کے حامل ہوتے ہیں اور جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے لیکن جب اللہ کی خشیت پہاڑ پر طاری ہونے لگے جیساکہ سورۂ حشر کی آیت ۲۱ میں ہے۔ یا پتھر پر طاری ہونے لگے جیساکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۷۴ وإن منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ" میں ہے تو یہ قرآن کا اعجاز بیان ہے جو بے جان جمادات میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے اور اسے حس و حرکت کرنے والا، تاثر قبول کرنے والا، اور خشیۃ اور خشوع پیدا کرنے والا بنا دیا ہے۔

اسی طرح "خشوع" بھی جامد پہاڑ کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ دل کا فعل ہے عربی میں خشع الصوت، خشع الوجہ، خشع البصر استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی خشوع قلب ہی سے ہے۔

(باقی آئندہ)

اپنے موضوع پر نادر اور بے مثال کتاب

سرجری اسلام کے قرونِ اُولیٰ میں

اور

اس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

مؤلفہ

مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی

رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

عہد رسالت اور عہدِ خلفاء و تابعین میں سرجری کی موجودگی اور اہم آپریشنوں کا وجود اور اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس کی مختلف قسموں اور اس کے نوع بنوع طریقوں کا رواج خود عہد نبوی میں پلاسٹک سرجری کے واقعات نہایت مستند حوالوں کے ساتھ بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

اس مقالہ میں ایسے حیرت انگیز واقعات وحقائق کا انکشاف کیا گیا ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور ملک وبیرون ملک کے بڑے بڑے ممتاز اہلِ علم ومحققین نے اس مقالے کو غیر معمولی طور پر سراہا ہے، یہ مقالہ اولاً برہان میں قسط وار شائع ہوا تھا اب پہلی بار کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا ہے۔

اعلیٰ معیاری عکسی طباعت، رنگین کی خوبصورت جلد

قیمت چالیس روپے

عمید الرحمن عثمانی

ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

تبصرے

نام کتاب : قوموں کا کردار
مصنف : ڈاکٹر احسان اللہ خاں
صفحات : ۱۳۴
طباعت : فوٹو لیتھو ورکس دہلی
تبصرہ نگار : محمد سعید الرحمٰن شمس

ڈاکٹر احسان اللہ خاں ملک کے ایک معروف اسکالر اور مشہور مصنف ہیں جن کی چھوٹی بڑی دو درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو کوشش یہی کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع کے ساتھ انصاف کر سکیں۔ اس لیے کہ موصوف تصویر کے دونوں (مثبت و منفی) پہلوؤں کو اپنی دقتِ نظر، وسیع معلومات اور علمی زرف نگاہی سے پوری طرح اجاگر کر کے خاطر خواہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "قوموں کا کردار" جو اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن بقول ڈاکٹر صاحب انھوں نے سائنٹیفک انداز میں قوموں کے کردار کا محاسبہ کر کے جو مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے اس سے فکر و نظر کے کئی دروازے وا ہوئے ہیں۔ زبان و بیان عام فہم اور سادہ ہے۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔

"قوموں کا کردار" اگرچہ یہ موضوع انتہائی اہم، علمی، تاریخی اور تحقیقی ہے اور اس عنوان پر متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں تاہم جو لوگ جدید رجحانات اور تقاضوں کے پیش نظر اس موضوع پر کام کرنا چاہیں انھیں ڈاکٹر احسان اللہ کی یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(محمد سعید الرحمٰن شمس)

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مُرتّب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" ۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ" ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ سنرلیہ ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنۃ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنۃ جلد دوم ۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ" ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم" بصائر ۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ" ۔ تدوین قرآن ۔ اسلام کا نظام مساجد ۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ" جار[illegible] برنارڈ شا ۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے ؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات [illegible]ہ اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابت حدیث ۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت ۔ قرآن اور تعمیر سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

جلد ۱۰۲	ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۸ء	شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

اسلام ہی دنیا کا تنہا اور آخری مذہب ہے جس کی تمام تر بنیادی تعلیمات ایک اٹل اور دائمی نظامِ اخلاق پر استوار کی گئی ہیں۔ جس میں مغرب کی افادیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ خیر و شر کا ایک اٹل اور ابدی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ونتیجہ حالات زمانہ کے تغیرات۔ تبدیلیوں، اور مصلحت وقت کے تقاضوں سے اس کے بنیادی اصولِ اخلاق کو ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ ان بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اسلام کے جملہ قوانین تمدن و معاشرت زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جو اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔ یا شریعت اسلامی کی رُوح اس کے مقاصد، اور اسلامی زندگی کے نصب العین کا ساتھ نہ دیتی ہو۔ بنیادی اصولوں اور عقائد کا یہ ثبات و استحکام اور ان کا اس طرح ناقابل تغیر ہونا ایک بہت بڑا تحفظ اور ضمانت ہے جس کی نظیر دوسرے مذاہب و ادیان میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ ورنہ آج جس طرح مغربی ذہن و فکر نے اپنے وقتی اور ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت ہر اخلاقی اصول اور ضابطہ کو توڑ ڈالا ہے۔ یہی حال خدا نخواستہ اسلامی اصول و مقاصد کا ہوتا۔ اس کے بنیادی عقائد اور شریعت اسلامی کے اخلاقی اصولوں میں انسانی خود غرضیوں اور کم ہمتیوں کے اثرات راہ نہیں پا سکتے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام کا اخلاقی نظام عقل و فکر

کی ترجمانی کا دشمن نہیں ہے بلکہ وہ فکر و تعقل کی بے قید آزادی کا سب سے بڑا مخالف ہے وہ عقل کو معطل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسے انسانی اور اخلاقی اصولوں کا تابع بناتا ہے۔ اسلامی نظام زندگی عقل کو یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ وہ شریعت کے بنیادی مقاصد اور اسلامی زندگی کے مجموعی نصب العین میں کوئی تبدیلی کر سکے اور نہ اسے یہ حق پہونچتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو مختلف شعبے کے لیئے زندگی کے جو ہدایات دیئے ہیں اور جو اصول ان کے لیئے وضع کیئے گئے ہیں ان میں دخل اندازی کرے۔ ہاں اسے یہ آزادی ضرور عطا کی گئی ہے کہ وہ تفصیلی امور اور ذیلی قوانین پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ شریعت کے مقاصد سے متصادم تو نہیں ہوتے ہیں عقل کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں اسلامی قوانین (فقہ اسلامی) اگر اسلامی مقاصد کا اصول کا رسے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ تجویز کرے۔ اسلامی زندگی میں عقل و فکر کا مرتبہ یہ ہے کہ جب حوادث کے طوفان اور انقلاب کی آندھیاں زمانہ میں نئے باب کا اضافہ کریں۔ نت نئے حالات رونما ہوں۔ قدیم نظام معاشرت و تمدن درہم برہم ہو جائے اور زندگی کو نئے مسائل و مشکلات کا سامنا ہو تو وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان مطالبوں کو پورا کرے اور زمانے کے چیلنج کا جواب دے۔ اسلامی زندگی کے لئے نئے قوانین اپنی ذاتی بصیرت اور فکر و عقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی عطا کی ہوئی روشنی میں وضع کرے۔ اس طرح گویا اسلام نے عقلی ارتقاء اور انسانی فکر و ذہن کے پرواز کی راہ بھی متعین کر دی ہے لیکن عملی ارتقاء میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی ہے۔

اسلام میں اخلاق کا دائرہ اثر اور احاطہ کار محدود نہیں ہے اس وجہ سے محسن انسانیت رحمۃ للعالمین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و

غایت اور مدعا و مقصود اخلاق عالیہ کی اتمام اور تکمیل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے آپ کی نبوت محض اصلاح معاشرت اور تطہیر سماج کے لئے نہیں بلکہ عالم گیر پیمانے پر اصلاح عقائد و اعمال، تشکیل تہذیب، تعمیر تمدن اور اعلیٰ انسانی قدروں کے فروغ کے لئے بھی ہے۔ آپ صرف انفرادی معاملات کی اصلاح کے لئے مبعوث نہیں کئے گئے تھے بلکہ تمام اجتماعی معاملات کو سنوارنا اور نکھارنا بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھے۔ اس لئے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دعوت ہے ایک تحریک ہے، ایک پیغام ہے، ایک انقلاب ہے جو انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں پر محیط ہے۔

آپ کی عالم گیر دعوت، انقلابی پیغام اور آفاقی تعلیمات زندگی کے کسی خاص پہلو کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر شعبہ کے لئے اپنی مستقل ہدایات واضح پالیسیاں، صاف ستھرا موقف اصلاحی تدابیر اور فکری نظریات رکھتا ہے۔ اس کا ایک مخصوص نظام تہذیب و تمدن، ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست و حکومت ہے۔ اس نے زندگی کے معاشی اور اقتصادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کو مناسب اہمیت دی ہے۔ زندگی کے اور گوشوں کو جس طرح اس نے یہاں بھی واضح احوال و ہدایات دیئے ہیں۔ اس نے خارجی نظامات باطنی محرکات پر بھی یکساں توجہ صرف کی ہے اور ایک دوسرے کے مابین گہرا ربط اور تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت کا مفہوم صرف روزہ اور نماز ہی نہیں بلکہ ہر وہ عمل عبادت شمار کیا جاتا ہے جو اللہ کے وضع کردہ اصولوں اور ہدایات کے مطابق ہوں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا جماعتی زندگی کے معاملات سے اس کا تعلق ہو۔ اسی لئے دین اسلام ایک اصول عمل، ایک ضابطہ اخلاق، عقائد کا ایک مجموعہ، تمدن کا

ایک نظام، حکومت کا ایک تصور اور معاشرت کا ایک نظریہ ہی بلکہ وہ فکر کا ایک صحیح ترین اصول اور عقل کے ارتقاء کا سب سے سیدھا راستہ، صراط مستقیم (RAIGHT PATH) بھی ہے فکر کی سلامت روی اور عقل کی راستی جو کچھ، جہاں کہیں اور جتنی کچھ ہے، وہ سب اسی میں اور اسی سے ہے دنیا کے اور تمام فلسفہائے نظام، انسانی ذہن کے تراشیدہ خود ساختہ نظریے اور ''ازم'' اور عقل کی تمام راہیں انسانی کو بالیقین منزلِ مقصود سے بھٹکانے والی اور اجتماعی زندگی کے لیے ہلاکت خیز ہیں۔

اخلاق دین اسلام کی ایک جامع اور مکمل اصطلاح ہے اس سے مراد محض خوش روئی، خوش کلامی اور خندہ پیشانی ہی نہیں بلکہ یہ وہ آئینہ ہے جس میں انسانی زندگی کی پوری تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خلق شخصیتِ انسانی کا آئینہ ہوتا ہے فرد سے اجتماع اور ذات سے معاشرے تک اس کا نفوذ و اثر ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا مفید اور قابل ذکر پہلو نہیں جو اخلاق کے زمرے میں شامل نہ ہو، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے سے لے کر اہم ترین مسائل حیات اور امور نظم مملکت سبھی کچھ اس اخلاق کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہادیٔ عالم نبی آخر الزماں حضرت اقدس محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب العالمین نے ''خلق عظیم'' کا طرۂ امتیاز دے کر منصبِ جلیل پر فائز فرمایا ہے۔ عظمتِ خلق کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ظرف میں وسعت و پہنائی اور عادات، خصائل، افعال اور کردار میں رفعت و خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ آپ چونکہ نبی رحمت ہیں اس لئے پروردگار عالم نے آپ کو دنیا میں حسنِ اخلاق اور اعلیٰ کردار کا عظیم ترین معیار قائم کرنے کے لئے مبعوث فرمایا تھا، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے محض فکری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر (PRACTICALLY) عظمت خلق کا عظیم معیار قائم فرمایا اور بلاشبہ اس میں آپ طرح کامیاب رہے جس کے نقوش و اثرات چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود

آج بھی محسوس کیے جا رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں "امت وسط" کا انحطاط جس حد تک پہونچ چکا ہے اور مجموعی طور پر ہم جس انحطاط اور پستی کے دور سے گذر رہے ہیں یہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے لیکن اس کے اسباب باہر نہیں بلکہ ہمارے اندر ہے ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ اپنے اجتماعی کردار کا جائزہ لیں، تو معلوم ہوگا کہ ہمارے زوال کا محل خود ہمارے اپنے ہی اعمال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسلام نے عزت و سربلندی اور قیادت و وقار کے ساتھ دنیا میں زندگی گذارنے کا جو ہمیں گر سکھایا تھا افسوس اسے ہم نے فراموش کر دیا، اور شعوری وغیر شعوری طور ان راہوں پر ہی چل پڑے جو بظاہر ہیں تو پر کشش، لیکن وہ زوال پذیر قوموں کی گذرگاہوں ہیں۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال اخلاقی پہلو اور آپ کا بے داغ کردار ہمارے لئے نئے حالات، ماحول اور تقاضوں میں بھی پیغام رکھتا ہے اور وقت کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں، ایمان و یقین کی بے بہا اور لازوال دولت کے ساتھ اپنے اجتماعی اور ملی کردار میں مثبت اور نمایاں تبدیلی پیدا کریں، اور زندگی کی شاہراہ میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لازم سمجھیں۔

شکریہ

قبلہ جمیل مہدی مرتب "برہان" کے وصال کے بعد دو تین ماہ تک برہان کے "نظرات" ملک کے معروف صحافی اور کہنہ مشق اہلِ قلم محترم ظہیر صدیقی لکھتے رہے جس کے لئے ادارہ موصوف کا بے حد شکر گذار ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی صدیقی صاحب اپنے گرانقدر مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں گے۔

اپیل

قارئینِ کرام و ہمدردانِ ملت! ادارۂ ندوۃ المصنفین اکابر اور بزرگوں، خاص طور پر مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کی آخری علمی یادگار ہے۔ جو اپنے قیام کی مدت سے لیکر آج تک انتہائی ناخوشگوار حالات کے باوجود پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ ملت کی ٹھوس، مثبت اور تعمیری خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

لیکن اب ادارہ کے وسیع تر منصوبوں کی تکمیل اور مستقبل کے تحفظ، بقا اور ارتقاء کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ادارہ کے مخلصین، محبین اور بہی خواہ حضرات اولین فرصت میں اس طرف توجہ دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس کمر توڑ مہنگائی اور دورِ گراں بازاری میں ایسے ادارے بغیر کسی مستقل فنڈ کے قیام کے ہرگز نہیں چلائے جاسکتے۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب

انتہائی جانفشانی، ذاتی محنت اور توجہ سے اس کا نظام چلاتے رہے اور اس کا تحقیقی و علمی معیار ہر قیمت پر باقی رکھا۔ اب یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ کچھ علمی منصوبے جو تشنۂ تکمیل اور کچھ اہم مطبوعات جو زیر طبع ہیں ان کے اتمام کے لئے ایک "مستقل فنڈ" قائم کیا جائے، تاکہ بسہولت ادارہ مالی بحران سے بچ کر اپنا علمی، تحقیقی اور تاریخی سفر جاری رکھ سکے۔

نوٹ: جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے ہمیشہ وقت کے اکابر اور بزرگوں کو ساتھ لے کر ادارہ کا نظام چلایا ہے اور ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ ادارہ اسی منہاج اور خطوط پر ہمیشہ چلتا رہے۔

امید ہے کہ اربابِ خیر اور بہی خواہانِ ادارہ اس ذیل میں اپنا بھرپور مالی تعاون پیش کر کے ہماری سرپرستی فرمائیں گے! —— چیک، ڈرافٹ یعنی آرڈر اس پتہ پر ارسال کیا جائے۔

منیجر
ندوۃ المصنفین
اردو بازار، دہلی

محمد حسین ہیکل اپنی تحریروں کے آئینہ میں

جناب محمد صلاح الدین عمری، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جدید مصری ادب ـــ جس کو دنیائے عرب کے تمام آداب پر فوقیت حاصل ہے، اور جس نے قدیم وجدید عربی فکر وفلسفہ کا حسین امتزاج پیش کرکے ادب وفن کو ارتقائی مراحل سے ہم کنار کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے ـــ کا مطالعہ بڑا متنوع اور دلچسپ ہے۔ علم وادب اور فکر وفن کو برتنے میں سرزمین مصر کو ہمیشہ سے ہی قیادت حاصل رہی ہے۔ یہ مصر ہی تو تھا جس کی قدیم عربی یونیورسٹی جامع ازہر نے مدتوں عالم اسلام کے مسائل کو حل کرنے اور برطانوی تسلط نیز اس سے قبل مسلمانوں کی بھنور میں پھنسی کشتی کو پار لگانے کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔ اسی سرزمین مصر کو تو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس نے عظیم مجددین اور مصلحین کی شخصیت سازی کی، اسی مصر نے تو جمال الدین الافغانی کے لئے اپنے بازو وا کئے اور ان کی اصلاحی دعوت کو اپنے یہاں پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے تھے۔ اسی مصر نے تو شیخ محمد عبدہٗ کے اجتماعی، تعلیمی اور اصلاحی نظریات کی اشاعت کے لئے راہیں ہموار کیں۔ اسی کی آغوش میں تو شیخ رشید رضا نے پناہ لی تھی۔ اسی مصر کی آنکھوں کا تارا انقلابی لیڈر

مصطفیٰ کامل تھا اور اسی مصر کا جگر گوشہ تو انقلاب مصر کا بیباک قائد سعد زغلول تھا، اس کی کوکھ سے تو لطفی السید نے جنم لیا تھا۔ اسی مردم خیز سرزمین کی تو پروردہ ناقد ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین، عظیم عالم ڈاکٹر احمد امین، فلسفی ناقد استاذ محمود العقاد کی گوناگوں شخصیتیں تھیں۔ اس خطۂ ارض کے جمال و رعنائی کے نغمے حافظ ابراہیم نے گائے تھے۔ اسی گنج حسن کے نقوش نے تو احمد شوقی کے قصائد کی نوک پلک سنواری تھی۔ اسی سرزمین میں بہنے والے دریائے نیل کی عظمت اور اس کی قدیم تہذیب و تمدن کے راگ ہیکل نے الاپے ہیں۔ وہی ہیکل جن کو جدید عربی ادب میں پہلے فنی ناول کی تخلیق کا شرف حاصل ہے۔ اسی مصر کے چند سر پھرے نوجوانوں نے اگر ایک طرف مصری قومیت کی آواز لگائی تو دوسری طرف اس کے فرزندانِ توحید نے، اسلام کی عطا کردہ حضارتِ سلیم کو اپنانے کی دعوت دی۔ اسی سرزمین کے چند جیالوں نے کمربستہ ہوکر، اسلام اور اسلامی حضارت سے محبت وعشق کے بیج بوئے اور اسلامی اخوت و مودّت کے پرلطف نغمے چھیڑے۔ پھر، چراغ سے چراغ جلے اور کارواں بنتا گیا۔ اخوان المسلمون، جماعۃ شباب محمد اور جماعۃ الشبان المسلمین کی طاقت ابھری۔

اسی مصر نے تو عربی زبان کے ارتقاء اور فنون ادبیہ ونقدیہ کی ترویج و اشاعت میں عملی حصہ لیا اور تعلیم و تدریس کی سطح کو بلند کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اسی سرزمین کی حضارت نے کھلے دل سے مغربی حضارت و تمدن کو اپنے یہاں پھلنے پھولنے اور بننے کے بھرپور مواقع فراہم کئے تاکہ قدیم و جدید تہذیبوں کا ایک حسین آمیزہ تیار ہو کر مصری قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں معاون ثابت ہو۔

مصر ہی کے ایک فرزند محمد حسین ہیکل کی جدید عربی ادب کا اجمالی جائزہ، ہماری اس بحث کا موضوع ہے۔ جی ہاں! وہی ہیکل جس کی شخصیت عرب دنیا میں سب سے پہلے ناول نگار کی حیثیت سے معروف ہے۔ جو افسانہ نویسی اور ناول نگاری کے میدان میں عربی ادب کے پہلے معلم شمار کیے جاتے ہیں، جن کو عربی ادب و تنقید میں بھی ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ ہیکل ہی تو ہیں جنھوں نے حیاۃ محمد پیش کر کے، اسلام دشمن مستشرقین کے بے بنیاد الزامات کا خالص تحقیقی اسلوب میں جواب دیا ہے۔ انھیں نے تو اسلامی سلطنت کو ایسی حضارت کے روپ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن عالم کی ضمانت دیتی ہے۔ اسی طرح ان کو ادبی، سیاسی اور تنقیدی مقالات نیز صحافتی مضامین کو فنی انداز میں پیش کرنے کا بھی خاص ملکہ حاصل ہے۔ سیرت و تراجم ادبیہ میں بھی ان کا تنوع ان کی فکری ارتقار کا غماز ہے۔ دل کو چھو لینے والی ہر بات اور ذہن کو جھنجھوڑنے والا ہر احساس، ان کے یہاں الفاظ کا جامہ پہن کر قاری کو دم بخود کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک طویل عرصہ تک ایک مخلص اور خوددار سیاسی قائد اور مفکر کی حیثیت سے زندگی گذارتے رہے اور ساری زندگی، مصر میں نیابتی حکومت اور آزادی کی تلاش جستجو میں سرگرم رہے۔ وہ سیاستداں، ادیب، ناقد، ناول نگار اور صحافی سب ہی کچھ تھے مگر اس سے بڑھ کر وہ غیور، خوددار اور حریت کے دلدادہ انسان تھے۔ حریتِ رائے اور حریت قلم ان کی سب سے بڑی دولت ہے جس سے وہ کسی قیمت پر بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔

ادبی اور اجتماعی ارتقار کی کہانی، سیاسی حالات کے نشیب و فراز کے پس منظر میں ہی چھپی ہوتی ہے، لہٰذا کسی ادیب یا فنکار کا مطالعہ، اس وقت کے سیاسی،

سماجی اور تمدنی حالات کے پس منظر میں ہی کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ عمل کا ٹکراؤ جب ردعمل سے وقوع پذیر ہوتا ہے تو لاتعداد منفی پہلوؤں کے سامنے آنے کے باوجود چپکے سے رونما ہو جانے والے مثبت پہلوؤں کی تلاش بھی ایک جگر سوز لیکن دلچسپ مشغلہ ہے۔ اور یہی مثبت پہلو ادب وفن اور فکر و فلسفہ کے ارتقاء کی کہانی سناتے ہیں۔ مصر میں عمل اور ردعمل کا کچھ ایسا ہی تصادم اس وقت رونما ہوا جب عثمانی حکومت کے زیر نگیں مدت سے چلے آرہے ملک پر ۱۷۹۸ء میں نیپولین نے اپنا جھنڈا گاڑ کر باشندگانِ مصر کو بوکھلا دیا۔ اس اچانک تسلط کے ردعمل نے، مصر پر حکومت کرنے کے، فرانسیسیوں کے خوابوں کو چکنا چور ضرور کر دیا، لیکن یہ فرانسیسی سیلاب جاتے جاتے اپنے کچھ ایسے اثرات چھوڑ گیا جن سے مصریوں کو لاشعوری طور پر مستفید ہونا ہی پڑا۔ فرانسیسی حملہ، مصر میں تمدنی اور علمی ترقی کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ یہ فرانسیسی اپنے ساتھ تہذیب و تمدن اور علم وادب کا جو اثاثہ لائے تھے، اس کے اثرات کا نتیجہ ہی تھا کہ مصر میں محمد علی پاشا کے ہاتھ میں زمام حکومت آتے ہی عام اصلاحات، قوم کی سیاسی سطح کو بلند کرنے اور ان میں علمی شعور پیدا کرنے کی غرض سے ایسے قوانین کا نفاذ کرایا گیا جن کے نقوش پر ہی مصر میں سیاسی، علمی اور ادبی ارتقاء کی راہیں ہموار ہوئیں[۱]۔ اسی نیپولین کے حملہ کے نتیجہ میں غالباً باشندگانِ مصر کو قومیت کا احساس ہوا۔ جس نے بعد کے ادوار میں کہیں فوجی انقلاب کا روپ دھارا، تو کہیں عُرابی انقلاب کی تخم ریزی کی، لیکن چونکہ ابھی مصریوں کے سیاسی شعور میں

۱۔ دیکھیئے عمر الدسوقی: فی الأدب الحدیث ج ص ۱۲ تا ۱۴۔

ومحمد فہمی لہیطہ: تاریخ مصر الاقتصادی ص ۵۷ تا ۶۸۔

وہ پختگی نہیں آئی تھی جو اقوام کو اپنا راستہ خود متعین کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور خود اپنے تحفظ کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے، لہٰذا کچے ذہن کی ناعاقبت اندیشیوں کا احساس کرکے، انگریزوں نے مصر کو لقمۂ تر سمجھ کر اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور جلد ہی مصر انگریزوں کی استعماریت کے شکنجہ میں کستا چلا گیا۔ لیکن، تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت نے ظلم وعدوان پر کبھی اطمینان کی سانس نہیں لی، بلکہ اسے ہمیشہ ظلم وزیادتی کی کرخت آوازوں کے پس پردہ قومیت کی للکار سنائی دیتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں غیر ملکی تسلط پر، وہاں کے باشندوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی چین کی سانس نہیں لی، بلکہ جوں جوں استعماریت کی جکڑبندیاں سخت ہوتی گئیں، وطنیت کا شعور بڑھتا گیا[1]۔ اسی استعماریت کی ظلم وتعدی کا ثمرہ تھا کہ وہاں جلد ہی قومی لیڈر ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے عوام کو نجات دلانے اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کی انتھک جدوجہد شروع کردی[2]۔ حزب الوطنی، حزب الوفد، حزب الأمتہ اور حزب الاحرار الدستوریین، اور کتنی ہی سیاسی وسماجی جماعتوں نے اس استعماری تسلط کو مزید برداشت نہ کرنے کے عزم کا اعلان کرکے، ہنگامے شروع کردیئے، ملک کے طول وعرض میں مظاہرے ہونے لگے، آگ وخون کی ہولی کھیلی جانے لگی، اور مصری بچہ بچہ مصری تشخص کے تحفظ کا عزم لے کر سینہ سپر ہوگیا۔ آخر کار ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں فوجی انقلاب برپا ہوگیا[3] اور اس طرح مصر

۱۔ ملاحظہ ہو، محمد مصطفیٰ صفوت: مصر المعاصرۃ ص ۸۷۔

۲۔ عبداللطیف حمزۃ: الصحافۃ المصریہ فی مائۃ عامہ ص ۸۱۔

۳۔ ہیکل: مذکرات ج ۲ ص ۳۴۹ - ۳۸۲

میں ایک طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد آزادی کا پرچم لہرایا۔
سیاسی انقلابات اور تبدیلیاں، علم وادب کی ترقی وتنزلی کی ضامن ہوتی ہیں۔ اور غیر ملکیوں سے سیاسی وثقافتی روابط، علم وادب کا لین دین اور خیالات وافکارات کا تبادلہ، ذہنی وسعت اور ثقافتی ترقی کا وسیلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ غیر ملکی ثقافت اور ان کے اصول وتمدن سے واقفیت نے مصر کو مغربی تہذیب وتمدن کے معائب ومحاسن سے روشناس کرایا، جس نے وہاں کے علمی وادبی افق کو اگر ایک طرف وسعتوں اور پہنائیوں سے آشنا کیا تو دوسری طرف ہم کو، مصری ادب وفن کا اِس جدید تہذیب وتمدن سے شناسائی کے نتیجہ میں، ادب وفن میں آہستہ سے در آنے والی کشمکش اور اضطراب کا احساس بھی ہوتا ہے جو مغربی تہذیب کی چکاچوند کرنے والی تیز روشنی کے پس پردہ تہ بہ تہ تاریکیوں کا خاصہ ہے۔ پھر، اگر ایک طرف مصری ادبار اور مفکرین نے عربی زبان وادب کے دامن کو جدید اصلاحات اور سائنسی وثقافتی تعبیرات سے مالا مال کرنے میں اپنی زبان دانی کی قوتیں صرف کی ہیں تو دوسری طرف ہم کو جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہ جیسے مصلحین مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے مذہبی اصلاح کا دین کو فرسودہ رسوم ورواج اور لایعنی اوہام وخرافات سے پاک کرنے[1] اور نوجوان نسل کو — جو مغربی تہذیب پر فریفتہ ہوکر دین ومذہب سے بیزار نظر آرہی تھی — دین کی اصل روح سے آشنا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان مصلحین نے اسلامی ثقافت کی اشاعت اور مسلم معاشرہ میں اسلامی فکر وشعور کو

۱۔ ملاحظہ ہو تشارلز آدمس: الاسلام والتجدید فی مصر ص ۱۷-۱۸
وگب الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام ص ۶۸ — ۶۹ -

بیدار کر کے ان کی علمی و شعوری سطح کو بلند کرنے کی جدوجہد کو ہی اپنا مطمح نظر بنالیا تھا۔ پھر، ہماری توجہ مصری یونیورسٹی کے قیام[۱] اور اس کے پس پردہ، قوم کی جدید تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے بلند مقصد پر بھی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قدیم امہات الکتب کی دوبارہ اشاعت، تالیف و ترجمہ کے لئے کمیٹیوں کا قیام، کرم خوردہ مخطوطات کے احیاء کی جدوجہد[۲]، جرائد و رسائل کا اجراء اور ان کا، مصر میں ادباء و علماء کی ایک بڑی تعداد کی ذہنی تربیت کا سنجیدہ عمل، قاسم امین کی تحریک حریت نسواں[۳] کا مصری ماحول پر گہرا اثر، اور پھر قوم کا جدید تہذیب و تمدن کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں گم ہو کر، اسلامی و عربی تشخص سے آہستہ آہستہ دست بردار ہو جانے کے خطرناک نتائج کا احساس کر کے چند سر پھرے خدا پرستوں کا سوز عمل اور مصری قوم کو ورطۂ ہلاکت سے باہر نکالنے کی پرعزم کوششیں، اور جدید مصری تاریخ کے سوز و ساز کے مطالعہ سے اس قدیم اضطراب و کشمکش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جو حق و باطل کے درمیان ازل سے ہی نوشتہ ہے۔ اگر باطل کی راہ خوشنما، لذت آشنا اور عیش و طرب کے بے شمار احساسات سے مزین ہے، لیکن اس راہ کی منزل بہرحال ہلاکت، تباہی، ذہنی گھٹن اور ازلی اضطراب پر ختم ہوتی ہے۔ اور حق کی راہ تموں کی دھوپ میں جھلساتی ہوئی، سنگ باریوں کے خطرات سے الجھتی اور انگار افشانیوں سے لہو لہان ہوتی ہوئی، آلام و مصائب سے گھری ہوئی اور

۱۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۵۲ ۔ ۵۳۔

۲۔ عمر الدسوقی : فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۶۱ ۔ ۶۲۔

۳۔ دیکھئے : چارلز آدمس : الاسلام والتجدید فی مصر ص ۲۲۳

سنگلاخ راستوں کے نشیب و فراز سے پُر ہے، لیکن اس راہ کا اختتام بہر حال سُرخ روئی، ذہنی سکون اور ابدی طمانیت کی منزل پر ہوتا ہے۔

ہیکل ۲۰ اگست ۱۸۸۸ء کو کفرغنام نامی بستی میں حسین آفندی سالم ہیکل کے گھر پیدا ہوئے[۱]۔ مختلف مدارس میں ابتدائی اور پھر ثانوی تعلیم کی تکمیل کی[۲]۔ ۱۹۰۵ء میں لا کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۰۹ء میں قانون کی ڈگری لینے کے بعد فرانس چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ۱۹۱۲ء میں 'دین مصر العام' کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی[۳]۔ گویا ڈاکٹر محمد حسین ہیکل پہلے مصری ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی[۴]۔

ہیکل کی ادبی زندگی کا آغاز، لطفی السید کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات سے تاثر کا نتیجہ تھا۔ لطفی السید نے ہی ہیکل کو ادبی اور اجتماعی موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی اور ہمہ وقت ان کی ہمت افزائی کرتے رہے[۵]۔ اس کے بعد جب ہیکل فرانسیسی ادب و ثقافت خصوصاً Hippolyte Taine کے

۱۔ مقالہ، ڈاکٹر حسین فوزی النجار (الدکتور محمد حسین ہیکل اعداد لطفی السید) ص ۵۔

۲۔ ہیکل: مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ ج ۱ ص ۲۴، دسوقی ضیف: الادب العربی المعاصر فی مصر، ص ۲۷۰۔

۳۔ Antonie Wessils : A modem Arbic Biography of Mohammad P 35

۴۔ حسین فوزی النجار ص ۱۴۔

۵۔ ہیکل: مذاکرات ج ۱ ص ۳۰۔

ادبی و تنقیدی افکار سے متاثر ہوئے[1]، تو عربی و فرانسیسی ثقافت کے امتزاج سے جو شکل بنتی ہے، وہ ہیکل کی تحریروں کی حلاوت میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ فرانس سے واپس آنے کے بعد ہیکل نے اگرچہ وکالت کا پیشہ شروع کر دیا تھا، لیکن مستقبل کا ہیکل ابتدا ہی سے ان کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وکالت کی مشغولیات کے باوجود وہ سیاست، ادب و نقد اور اجتماعی موضوعات پر قلم اٹھاتے رہے حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا کہ ہیکل نے وکالت کا پیشہ ترک کر کے صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 'السیاسۃ' کی ایڈیٹر شپ سے ہوتا ہے۔ جو حزب الاحرار کا روزنامہ اخبار تھا[2]۔ پھر چند سال بعد انھوں نے ایک ہفتہ وار ادبی میگزین 'السیاسۃ الاسبوعیۃ' نکالنا شروع کیا[3]۔ جس نے جلد ہی اس وقت کے ادبی و تنقیدی رجحانات اور جدید فکر و شعور کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر لی۔ ایک طویل عرصہ تک صحافت سے منسلک رہنے کے بعد جب انھوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا تو کئی بار وزارت تعلیم کا قلمدان ان کے سپرد کیا گیا۔ پھر، اس کے بعد رئیس مجلس الشیوخ کے معزز عہدہ پر بھی کئی بار سرفراز ہوئے[4]۔ ان کی صحافتی و سیاسی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ یہی تو ان کا طرۂ امتیاز ہے جو ان کو بہت عزیز ہے۔ تقلید اور دوسروں کے نقش قدم پر چل پڑنا یا مادی مقصد

۱۔ ہیکل: تراجم مصریۃ و غربیۃ ص ۲۴۷۔

۲۔ حسین فوزی النجار، حوالہ سابق ص ۸۔

۳۔ Antanie Wessels: opcit P36

۴۔ ہیکل: مذکرات ج ۲ ص ۸۹ و ص ۳۰۲۔

کے حصول کی خاطر ہاں میں ہاں ملانے والے تو بے تلاش کیے، قدم قدم پر ملتے ہیں
لیکن حریت رائے اور آزادیٔ فکر کو برتنے کے لئے نہ صرف اپنے ہر ذاتی مقصد
کو پسِ پشت ڈالنا پڑتا ہے، بلکہ قدم قدم پر مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کا نشانہ
بھی اس راہ کو اپنانے کا لازمی جزو ہے۔ حریتِ فکر کی راہ بظاہر بڑی پرخطر اور
دشوار گذار نظر آتی ہے اور اس کے راہی کو اس راہ کے انتخاب کا حساب
کرب واذیت اور طویل تر تنہائی کے احساسات سے چکانا پڑتا ہے لیکن کارزارِ حیات
میں یہ ہمہ اپنوں کے ستائے ہوئے، تنہائی کے احساس تلے دبے کرب زدہ چند نفوس
اپنا مقام بنانے میں بالآخر کامیابی کی منزل سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور ذاتی اغراض و
مقاصد کے پرستار، اور فرسودہ تقلید کے بندے، اپنے ہی جیسے بے شمار انسانوں
کے سیلاب میں بہتے بہتے نہ صرف اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ان کی یادوں کے
نقوش بھی نقش بر آب سے زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔ ہیکل کا شمار بھی ان چند
خوش نصیب نفوس میں کیا جاسکتا ہے، جس نے حریتِ فکر کا کبھی کوئی سودا
نہیں کیا، اور تقلید کی سہل انگیزی سے منہ موڑ کر، اپنی راہ خود بنانے کی صعوبتیں
جھیلنے ہی میں سکون وطمانیت کے پہلو تلاش کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
پرعزم کوشش میں انھوں نے لغزشیں بھی کھائی ہیں، اور کبھی غلط راہوں پر بھی چل پڑے
لیکن بالآخر حق کی تلاش کے جذبۂ صادق نے ان کو جس منزل پر پہونچایا وہ تھی منزلِ حق،
امن وسکون کی علامت اور صالح فکر وحرارت کی ضامن۔[1]

سیاسی وصحافتی مصروفیات کے باوجود، خوب سے خوب تر کی تلاش ان
کو لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرتی رہی اور وہ، کبھی 'زینب' لکھ کر اپنے اندرونی کرب

۱۔ دیکھئے تقدیم فی منزل الوحی"

اور فرسودہ تقلید کے خلاف اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہیں،[1] تو کبھی عظیم مصری شخصیات اور مغربی مفکرین سے اپنے دل کے رشتے جوڑ کر مصریوں کو اپنے فکر سے آشنا کرتے ہیں[2]۔ فرانسیسی اصول تنقید اور حضارت و تمدن کے قوانین کا موازنہ مصری اور عربی ادب نقد سے کرتے ہیں تو زبردست مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ اپنے مقالات و مضامین میں ادب و نقد کے مسائل چھیڑ کر جدید اصولِ نقد اور خالص تحقیقی اسلوب کو اپنانے کی دعوت دیتے ہیں[3]۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں[4] تو اپنے مخصوص تحقیقی، علمی اور ادبی اسلوب میں ایسے نادر نمونے پیش کرتے ہیں کہ خود ہی اپنی تحقیق پر رشک آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "حیاۃ محمد" میں انھوں نے بعض ایسے پہلوؤں پر تاریخی بحث کی ہے جو مستشرقین کا ہدفِ ملامت بنے ہوئے تھے۔ اس تالیف کی ترتیب میں ہیکل کی بعض زبردست لغزشوں سے قطع نظر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جدید دور میں جدید اسلوبِ تحقیق کے پیش نظر لکھی جانے والی سیرت پر یہ پہلی تالیف ہے، پھر، حضرت ابوبکرؓ[5] اور حضرت عمرؓ[6] کی شخصیت

۱۔ ملاحظہ ہو ہیکل کی ناول "زینب"

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "تراجم مصریۃ وغربیۃ"، اور "ثورۃ الأدب"

۳۔ دیکھئے ثورۃ الأدب۔

۴۔ حیاۃ محمد۔

۵۔ الصدیق ابوبکر۔

۶۔ الفاروق عمر۔

کو ہیکل نے جس تاریخی اسلوب میں پیش کیا ہے اور جدید مصر کی سیاسی تاریخ کی تدوین کی، اس سے ان کی علمی دیدہ وری، ادبی مہارت اور تاریخی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی متنوع شخصیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ (باقی)

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

"طبقات الصوفیہ"

آصفیہ لائبریری حیدرآباد کا ایک عربی مخطوطہ

جناب عبدالرشید صاحب، صدر شعبۂ عربی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

چند سال پہلے مجھے حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ آصفیہ لائبریری میں ایک مخطوطہ پر میری نگاہ پڑی، یہ مخطوطہ ناقص الاول ہے، مجموعی اوراق ۲۲۴ ہیں۔ ۸۷۰ھ میں اس کی کتابت کی گئی ہے۔ صوفیاء اور مشائخ کے تراجم و اقوال پر مشتمل ہے۔

اس ناقص الاول کتاب کی ابتداء مشہور صوفی بشر الحافی کے تذکرہ میں اس عبارت سے ہوتی ہے "فاشتری خبزاً" الخ۔ پوری کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہے۔ مؤلف نے پہلے صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے پھر ہر تذکرہ کے ضمن میں اس شیخ سے متعلق متبعین اور مریدین کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب ایک خاتمہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ۲۱ اوراق پر مشتمل ایک ذیل تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نہ مصنف کا نام کہیں مذکور ہے اور نہ کتاب کا، مگر یہ کتاب چونکہ صوفیاء اور مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے اس لیے کتاب کا اصل نام کچھ بھی ہو "طبقات الصوفیاء" یا "طبقات الاولیاء" کے نام سے موسوم کرنا قرین قیاس ہے۔

"الفہرست المشروح للکتب الخطیۃ النفیسۃ" کے نام سے فارسی زبان میں آصفیہ لائبریری کی ایک تفصیلی فہرست ہے۔ اس فہرست کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو العباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ کی تالیف ہے، اور ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے، مگر مؤلف ذیل نے اپنے خطبہ میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس حصہ میں اپنے یمنی شیوخ کا تذکرہ کریں گے۔

مرتب فہرست کی اس تحریر سے مخطوطہ کے متعلق تین باتوں کا انکشاف ہوتا ہے:

۱۔ اصل کتاب کے مؤلف چوتھی صدی کے ایک شیخ ابو العباس احمد بن محمد السوسی متوفی ۳۹۶ھ ہیں۔

۲۔ ذیل کے مؤلف کا نام غیر معلوم ہے اور اس کے مؤلف اور اصل کتاب کے مؤلف دونوں دو آدمی ہیں۔

۳۔ ذیل میں اس کے مؤلف نے اپنے یمنی شیوخ کے حالات درج کئے ہیں۔

مرتب مذکور نے اپنے پہلے دعویٰ کی تائید میں کشف الظنون کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ حاجی خلیفہ نے "طبقات الصوفیاء" کے ضمن میں لکھا ہے کہ ابو العباس احمد بن محمد سوسی متوفی ۳۹۶ھ کی بھی ایک "طبقات الصوفیاء" ہے۔ کشف الظنون دیکھنے پر معلوم ہوا کہ شیخ ابو العباس سوسی نے بھی اس فن میں ایک کتاب تصنیف کی ہے مگر حاجی خلیفہ نے شیخ سوسی کی کتاب کی خصوصیت کے بارے میں ایک بات بھی تحریر نہیں کی ہے جس سے اس بات کا شک بھی ہو سکے کہ زیر بحث مخطوطہ شیخ سوسی کی تالیف ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے کہ مؤلف کے نام کی تحقیق و تفتیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے خطبہ کی تھوڑی سی عبارت آپ کے سامنے آجائے جس سے

مرتب فہرست کے دونوں دعووں کے متعلق آپ اپنی رائے قائم کر سکیں:

"واذا فرغنا عن ھذہ الخاتمۃ الذی [التی] عقدھا یمین فلنذیل علیہا بسادات أدرکہم فبلغناھم بالیمن، حشرنا اللہ فی سلکھم ولا أخرجنا من عقدھم۔"

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ اصل کتاب اور ذیل کے مؤلف ایک ہیں نہ کہ دو۔

۲۔ مصنف نے ذیل میں اپنے ان مشائخ کا تذکرہ لکھا ہے جن کے زمانہ کو انھوں نے پایا اور تبرک و تیمن کے طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، "الیُمن" بضم الیاء اس لئے پڑھنا ضروری ہے کہ ذیل میں شیخ دمیری قاہری اور دوسرے مصری شیوخ کا تذکرہ موجود ہے۔

اصل کتاب اور ذیل دونوں کے کاتب ایک ہیں۔ اب ذیل میں کاتب صاحب کا ترقیمہ بھی دیکھتے چلئے:

"وافق الفراغ سنہ سنۃ ۸۷۰ ھ، ابقی اللہ للمسلمین مولفہ"

اس کتاب کی کتابت سے ۸۷۰ھ میں فراغت ہوئی۔ اللہ اس کے مؤلف کو مسلمانوں کے لئے باقی رکھے۔

اس عبارت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مؤلف (ذیل اور مؤلف کتاب) ۸۷۰ھ میں بقید حیات تھے۔ اس لئے شیخ ابو العباس احمد بن محمد سوسی متوفی ۳۹۶ھ اس کے مؤلف کیسے ہو سکتے ہیں۔

مزید براں اصل کتاب میں بعض ایسے مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ساتویں اور آٹھویں صدی میں ہوئی ہے اور کتاب الذیل میں شیخ محمد بن کریم الدمیری کا تذکرہ ملتا ہے جن کی وفات ۸۵۷ھ میں ہوئی ہے اور یہ قاہرہ کے مضافات میں

قیام پذیر تھے۔ پھر شیخ دمیری کے بعد شیخ شہاب الفرموی کے تذکرہ پر کتاب الذیل ختم ہو جاتی ہے جو کہ کتاب کی تالیف کے زمانہ میں بقید حیات تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ سوسی کی تالیف کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ وہ دلائل کسی اور پہنچ سے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اب آئیے اس کتاب کے مؤلف کے بارے میں صحیح اور حتمی فیصلہ کیا جائے جس کی طرف خود اس کتاب کی بعض باتیں رہنمائی کر رہی ہیں۔ "تذکرہ النوادر" کے مؤلف نے تحریر کیا ہے کہ یہ کتاب شیخ ابو حفص سراج الدین عمر بن علی بن عمر الانصاری الشافعی المصری المعروف بابن الملقن (۷۲۳ ـ ۸۰۴ھ) کی تالیف ہے۔ اور انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "معجم المصنفین" کے مصنف کی بھی یہی رائے ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ ٹونکی نے اپنے اس فیصلہ کو کس کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ بہرحال ان دونوں اکابر کی رائے سے راقم السطور بھی متفق ہے۔

دلائل پیش کرنے سے پہلے ابن ملقن کے بارے میں چند کلمات کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے ——— ابن ملقن کے والد اندلس کے باشندہ تھے، وہاں سے کوچ کر کے مصر چلے آئے، اور مصر ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہ جید عالم تھے، مختلف علوم وفنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ علم لغت اور علم نحو کے امام مانے جاتے تھے۔ مصر ہی میں ۷۲۳ھ میں ابن ملقن کی پیدائش ہوئی۔ یہ سال بھر کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وفات کے بعد اخیافی والدین گئے، اور انہی کی گود میں ابن ملقن کی نشو ونما اور تعلیم وتربیت ہوئی۔ عیسیٰ مغربی جامع طولون میں درس قرآن دیا کرتے تھے اس لئے یہ ابن الملقن کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بہرحال بعد میں یہ بہت بڑے صاحب فضل وکمال ہوئے۔ درس وقضاء کے فرائض ایک طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ برقوق کے زمانہ میں بعض ناگزیر حالات

کی بنا پر عہدۂ قضاء سے سبکدوش ہو گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تقریباً تین سو کتابیں تحریر کی ہیں، شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس میں ان کی کوئی تصنیف نہ مل سکے۔ ان کی ایک کتاب "العقد المذہب فی طبقات حلۃ المذہب" ہے جس کے ایک حصہ کو راقم السطور نے کئی سال پہلے ایڈٹ کیا ہے۔ مقدمہ میں ۷۸ کتابوں کا نام شمار کرایا گیا ہے، جن میں سے بعض کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ بہت سی کتابیں بانکی پور، پٹنہ، آصفیہ لائبریری اور سعیدیہ لائبریری حیدر آباد میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ تقریباً تیس کتابوں کا نام خود مصنف نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں شمار کرایا ہے۔ ان کتابوں میں "طبقات الصوفیہ" کا نام بھی ملتا ہے۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی تالیفات میں طبقات الصوفیہ کا ذکر کیا ہے، بعض تذکرہ نگاروں نے طبقات الاولیاء لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ نے ایک جگہ طبقات الصوفیہ اور دوسری جگہ طبقات الاولیاء تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی کتاب ہو یا ایک دوسرے کا اختصار یا مطول ہو، جیسا کہ ابن ملقن کی عادت رہی ہے کہ پہلے مطول کتاب تحریر کرتے ہیں پھر اس کا اختصار کرتے ہیں، پھر اس کا خلاصہ تیار کرتے ہیں، اور کبھی پہلے مختصر کتاب تحریر کرتے ہیں پھر مطول تیار کرتے ہیں۔

ابن ملقن کے بہت سے شیوخ ہیں جن سے مختلف علوم و فنون میں تعلیم حاصل کی ہے۔ راقم السطور بہت تفصیل سے العقد المذہب کے مقدمہ میں ان کے شیوخ و تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ قطب الدین عبد الکریم الحلبی متوفی ۷۳۵ھ ان کے محبوب ترین شیوخ میں سے ایک ہیں، جن کی تاریخ مصر کا حوالہ بکثرت اپنی تالیفات میں دیتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اب آئیے مخطوطہ کا جائزہ لیا جائے جس کا اس مجموعے

مؤلف کا صحیح تعین ہوسکے:

۱۔ اس کتاب میں بار بار یہ عبارت ملتی ہے: "قال شیخنا قطب الدین عبد الکریم الحلبی فی تاریخہ" اور یہ بات مسلم ہے کہ شیخ قطب الدین متوفی ۷۳۵ھ ابوالعباس سوسی کے شیخ نہیں ہوسکتے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ شیخ قطب الدین ابن ملقن کے محبوب ترین شیخ ہیں۔ ابن ملقن نے اپنی کتاب "العقد المذہب" میں کثرت سے ان کی تاریخ مصر کا حوالہ ٹھیک انہی الفاظ میں دیا ہے۔

۲۔ بہت سے تراجم میں مصنف کی یہ عبارت ملتی ہے: "ذکرتہ فی طبقات الفقہاء" اور ہمیں معلوم ہے کہ ابن ملقن کی ایک کتاب "طبقات الفقہاء" پر مشتمل ہے جو کہ العقد المذہب کے نام سے موسوم ہے، بلکہ بودلین لائبریری، آکسفورڈ کے مخطوطہ کے ٹائیٹل پیج پر طبقات الفقہاء ہی درج ہے۔

۳۔ شیخ عبد الکریم بن ہوازن قشیری متوفی ۴۶۵ھ کے ترجمہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے ان کے دونوں بھائیوں کا تذکرہ طبقات الفقہاء میں کیا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے: "ذکرت أخویہ فی طبقات الفقہاء"۔ طبقات الفقہاء دیکھنے پر معلوم ہوا کہ امام قشیری کے دونوں بھائیوں کے علاوہ ان کے چھ لڑکے اور بعض احفاد کے بھی تذکرے مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

۴۔ کتاب الذیل کے خطبہ کی عبارت سے یہ بات طے پاچکی ہے کہ اصل کتاب ذیل دونوں کے مؤلف ایک ہی شخص ہیں۔ اور ذیل میں شیخ محمد بن کریم دمیری کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ قاہرہ کے مضافات میں اقامت پذیر تھے اور ان کی وفات ۷۸۵ھ میں ہوئی ہے، ان کے بعد شیخ شہاب فرموی کے تذکرہ پر ذیل ختم ہوجاتا ہے جو کہ ذیل کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کم از کم ذیل کی تالیف ۷۸۵ھ اور ۷۸۶ھ کے درمیانی عرصہ میں ہوئی۔ ہے اور آٹھویں صدی کا

نصف آخر ہی ابن ملقن کی کثرت تالیف کا زمانہ ہے۔

یہاں یہ بات کھٹکتی ہے کہ ابن ملقن کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ طبقات الفقہاء کی تالیف کی ابتداء ۷۵۳ھ میں ہوئی اور اس کی تکمیل ۷۶۲ھ میں ہوئی، مگر تکمیل کے بعد بھی اس میں حذف و اضافہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پھر بعد میں اس کا بھی کتاب الذیل ابن ملقن نے تیار کیا۔ مکتبہ خلیل العدالمدراسی حیدرآباد میں اس کا قدیم ترین مخطوطہ محفوظ ہے جس کی کتابت ۷۷۵ھ میں کی گئی ہے۔ اس کا ٹائیٹل پیج مؤلف کے قلم سے تحریر کردہ ہے۔ اس نسخہ میں اصل کتاب کے آخری حصہ میں مؤلف نے اپنی تالیفات میں شمار کرایا ہے جن میں طبقات الصوفیاء کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس لئے دونوں کتابوں کے درمیان مطابقت کی چند صورتیں ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ طبقات الفقہاء اور طبقات الصوفیاء دونوں ایک ساتھ تالیف کی گئیں اور طویل عرصہ کے بعد کتاب الذیل تیار کیا گیا۔ یا دونوں یکے بعد دیگرے تالیف کی گئیں مگر ذیل میں حذف و اضافہ ۸۵ھ تک جاری رہا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ طبقات الصوفیاء دوسری کتاب ہے اور زیر بحث کتاب طبقات الاولیاء ہے جیسا کہ کشف الظنون سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ملقن کی اس فن میں دو کتابیں ہیں۔ ایک طبقات الصوفیاء اور دوسری طبقات الاولیاء۔ صاحب اعلام خیر الدین زرکلی نے بھی طبقات الاولیاء ہی کا نام ذکر کیا ہے اور ابن ملقن کی عادت بھی یہی ہے کہ ایک فن میں مطول و مختصر کئی کئی باتیں تحریر کرتے ہیں۔

"اسلام کا نظام عدل ۔۔ ایک جائزہ"

محمد سعید الرحمان شمس ۔۔ مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر۔

اسلام کوئی نیا مذہب اور دین نہیں ہے بلکہ اس الٰہی مشن اور پیغام و دعوت کی آخری حتمی اور تکمیلی شکل ہے جسے جملہ انبیائے کرام اپنے اپنے وقت اور دور میں چلاتے اور عروج بخشتے رہے۔ جس کی ابتدا سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ حضرت آدمؑ جہاں پہلے انسان تھے وہاں پہلے رسول بھی تھے، اس کے بعد حضرت عیسیٰ مسیحؑ تک مسلسل خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ سیدنا حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معوث انبیائے کرامؑ کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں تین سو پندرہ رسول ہوئے۔

(بحوالہ مسند احمد و ابن حبان)

خدا کے ان برگزیدہ بندوں اور منتخب نمائندوں نے مختلف قوموں اور آبادیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا اور خدا سے ڈر کر ستھرا زندگی گذارنے کی تلقین کی رسالت و نبوت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات سے کی گئی۔ آپؐ جملہ انبیاء و رسل کے خاتم تھے جب کہ دوسرے حضرات صرف نبی اور رسول تھے اور آپؐ پیغمبر ہونے کے ساتھ خاتم النبین بھی

"ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین" (الاحزاب)

اسی طرح آپ کی ورسالت کے ساتھ دینِ الٰہی کی ہر ہر پہلو اور جہت سے تکمیل ہوگئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔" (المائدہ ۵)

یعنی آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت (تم پر) تمام کردی اور اسلام کے دین ہونے کی حیثیت سے تم سے راضی ہوگئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ببانگِ دہل یہ بھی اعلان فرمادیا گیا کہ۔

"ان الدین عند اللہ الاسلام ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل"

بلاشبہ اسلام ہی حضرت حق جل مجدہ کے نزدیک پسندیدہ (مذہب) اور دین ہے اور جو کوئی اسکے علاوہ دوسرا مذہب تلاش کرے وہ ہرگز قابل قبول نہیں۔

خود ایک حدیث پاک کے اندر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔
"میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلانے آیا ہوں جس کی تعلیم انبیائے سابقین نے دی ہے۔ میں ان تمام رسولوں کی عزت اور ان کا احترام کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مامور تھے، میں ان سب کی توثیق و تصدیق کرتا ہوں"۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ اور قرآنی آیات میں اس حقیقت کی ترجمانی اور وضاحت کی گئی ہے یہاں تک کہ ایمان کی بنیاد جن چھ چیزوں پر ہے ان میں ایک اہم بنیاد تمام انبیائے سابقین پر اجمالی ایمان بھی ہے۔

اسلام نام کا مذہب کوئی ایسا مذہب اور ایسا عقیدہ نہیں ہے جس کی ابتداء اور آغاز کا کوئی سال یا سن یا زمانہ بتایا جاسکتا ہو۔ بلکہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے

جس کی عمر ٹھیک اتنی ہی کہی جا سکتی ہے جتنی ابو البشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے اب تک بنی آدم اور اولاد آدم کی بنتی ہے، مذہب اسلام نے جو اپنے متبعین اور پیروں کاروں کو تعلیم دی ہے وہ آفاقی اور عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ تمام نوع انسانی (HUMAN BEING) کی ہدایت اور رہبری کے لیے بھیجے جانے والے خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ بندوں پر ان کی تعلیم پر ایمان لانے سے شروع ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام انبیاء و مرسلین کے اسمائے گرامی قرآن مجید میں بالترتیب بیان فرمانے لگتے تو بے شبہ اس پر پوری طرح قادر تھے لیکن یہ چیز لا حاصل تھی۔ اور سوچئے! اس طرح پر قرآن مجید کی ضخامت اور حجم کس قدر بڑھ جاتا ہے لیکن حکیم مطلق نے نہایت ہی مختصر مگر جامع اور مانع طریقۂ بیان اختیار فرمایا۔ کہ پوری انسانی دنیا ایمان و عقیدہ کے اعلان کرتے وقت اس بات کا صدق دل سے اقرار کرے کہ ہم تمام انبیاء علیہ السلام اور ان کی ربانی تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں۔

ادیم ارض پر یہی وہ واحد مذہب ہے جو اپنے وسیع تر دامن میں انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے ایک مکمل نظام حیات، نظام زندگی اور مقصد حیات رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے متنوع اور مختلف گوشوں اور شعبوں میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کی تکمیلی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہوئے ہمیں درج ذیل مقالہ میں "اسلام کے نظام عدل" پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے اس سلسلہ میں کیا کچھ ہدایات دی ہیں اور کون سے اصول وضع کئے ہیں جس سے انسانیت کے درد کا مداوا اور زخم کا مرہم بن سکے۔

اسلامی اور مغربی نظام عدل کا تقابل

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو متضاد قوموں کا حامل بنایا ہے۔ ایک وصف اس

میں ملکوتیت کا پایا جاتا ہے جو اسے اچھے اخلاق و کردار کی طرف مائل کرتا ہے اور اس میں نیکی اور پرہیز گاری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ دوسرا وصف بہیمیت ہے جو انسان کو ظلم و جور، لوٹ مار، قتل و غارت، حرص و ہوس اور نفسانی و شیطانی خواہشات کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چونکہ نفسانی خواہشات میں تلذذ اور رنگینی ہوتی ہے اس اکثر انسان بغیر سوچے سمجھے اور نتائج و ثمرات سے بے پرواہ ہو کر خواہشات کی وادی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ انسانی معاشرہ کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانے اور لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ دینے کے لیے دو قسم کے نظام رائج ہیں ایک نظام تو وہ ہے جو انسانی ذہن و فکر کا ساختہ اور پرداختہ ہے جسے ہر ملک کے معاشرے اور موجودہ حالات نے اپنی خواہشات اور جذبات کو مدنظر رکھ کر تیار کیا ہے اور اس کے ذریعے اس ملک کے افراد اپنے معاشرے میں عدل کا نظام قائم رکھتے ہیں۔ دوسرا نظام ہے جسے انسانوں کے خالق و مالک نے اپنے بندوں کی حاجت و ضرورت، اس کی کمزوریوں، خامیوں، خوبیوں اور خرابیوں کو مدِنظر رکھ کر تیار کیا اور اپنے منتخب بندوں اور نمائندوں (انبیاء و رسل) کے ذریعے عالم انسانیت تک پہونچایا ہے۔ یہ نظام سرور کونین حضرت اقدس محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اور طفیل میں تکمیل پذیر ہوا۔ "اسلامی نظام عدل" اور مغرب کے نظام عدل میں یہی بنیادی فرق ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ہے اس لیے اس میں وہ تمام کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں جو ایک انسان میں عموماً ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اس نظام میں مملکت کا سربراہ یا اس کے حاشیہ نشین ہر قسم کی مسئولیت اور (IMPEACHMENT) سے مامون ہوتے ہیں مظلوم عوام کا ہاتھ ان کے گریبان تک تو کیا ان کے دامن تک نہیں پہونچ سکتا۔ کیونکہ قانون سازی کرتے وقت وہ اپنے تحفظ کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی نظام عدل میں مساوات اور برابری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بحیثیت بندہ

تمام بندے برابر اور مساوی ہیں۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ اس واقعہ سے لگائیے کہ "ایک مرتبہ رحمۃ اللعالمین جناب محمد الرسول اللہ صلی علیہ وسلم کے دست مبارک کی چھڑی سے ایک صحابی رضؓ کو ہلکی سی خراش آجاتی ہے اور وہ اپنی تکلیف کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ذاتِ پاک جس کی خاک پاک ملک و ملکوت کے لیے سر چشمہ تھی۔ اپنی پشتِ مبارک کھول کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور صحابی کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا بدلہ لو"!

کیونکہ مغربی نظامِ عدل انسانوں کا بنایا ہوا ہے اس لیے نہ اس کو استقرار حاصل ہے اور نہ دوام، آج ایک قانون پاس ہوتا ہے اور کل جب دوسری پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہ قانون اس کے مفادات کے منافی ہوتا ہے تو فوراً اسے (AMEND) کردیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسے یوں کہیے کہ مغرب کا نظام عدل عوام کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ حکمراں ٹولے کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اس کے برخلاف اسلام کے عدل پر نہ تو حکومتوں کی تبدیلی کا اثر پڑتا ہے اور نہ زمانہ کے انقلابات و حوادث کا۔ رب العالمین کا واضح ارشاد ہے۔

"لا تبدیل لکلمات اللہ" (یونس) اللہ تعالیٰ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی معاشرہ قیامت تک کن کن مسائل سے دوچار ہوگا۔ اور ان کا حل کیا ہے؟ اس لیے اس نے اپنی نازل کردہ کتاب اور اپنے پاک رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں ان تمام مسائل کا حل رکھ دیا ہے۔

ایک نکتہ

اس سلسلہ میں ایک نکتہ اور بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ چونکہ مغرب

کا نظامِ عدل انسان کا بنایا ہوا ہے اس لئے وہ انسانی خواہشات کے تابع ہے۔ اور اسلامی نظامِ عدل چونکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اس لیے وہ انسانی خواہشات پر کنٹرول کرتا ہے۔

اسلامی نظامِ عدل میں حاکم اور محکوم دونوں کے دل میں یہ بات راسخ کی جاتی ہے کہ وہ دونوں ایسے سمیع و بصیر اور علیم و منتقم اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہیں جو عالم الغیب والشہادہ ہے جو بندوں کی نیت و ارادہ سے واقف ہے اور جس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بندوں کے اعمال سے غافل نہیں ہوتیں۔ جواب دہی کا یہ احساس اور تصور بندوں کے دل میں خوف و خشیت کو جنم دیتا ہے اور وہ ایسے اعمال کے ارتکاب سے پرہیز کرتے ہیں جن کے ارتکاب سے اسلامی شریعت نے منع کیا ہے اس کے باعث جرائم کے ارتکاب کی شرح کم سے کم ہو جاتی ہے۔

تاریخ اسلام کا یہ مشہور اور سچا واقعہ سننے کے لائق ہے۔

... لڑکی کو جب اس کی ماں نے دودھ میں پانی ملانے کے لیے کہا تو لڑکی نے پانی ملانے سے انکار کر دیا جب ماں نے جواب طلبی کی تو اس نے کہا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ فاروق نے دودھ میں پانی ملانے سے منع کیا ہے

ماں نے کہا کیا اس وقت عمرؓ دیکھ رہے ہیں؟ کہ تو دودھ میں پانی ملا رہی ہے؟ لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔ ماں یہ صحیح ہے کہ عمرؓ نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن عمرؓ کا رب تو دیکھ رہا ہے: بچی کی بات سن کر ماں لاجواب ہو گئی۔

ماں کو یہ بات معلوم نہیں تھی اس کے مکان کے دروازے سے لگے ہوئے حضرت عمرؓ ماں بیٹی کے مکالمے کو سن رہے تھے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ سیدنا حضرت عمرؓ کو اس بچی کا جواب اس قدر پسند آیا کہ آپ نے بعد میں اس لڑکی کو اپنی بہو بنالیا۔ غور کیا جائے مسئولیت کا یہ خوف اور شدید احساس اس مغربی نظامِ عدل

ہیں کہاں سے آسکتا ہے؟ محافظ پولیس کا ایک سپاہی ہوتا ہے جو اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے رشوت کے ذریعے رام بھی کیا جاسکتا ہے۔ جیسے دھوکہ اور فریب بھی دیا جاسکتا ہے۔ اور جسے ضرورت پڑنے پر جرائم پیشہ افراد قتل بھی کر دیتے ہیں۔

ایک اور بنیادی فرق

اسلامی اور مغربی نظام عدل میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت نے مسلم معاشرے کی بنیاد اخلاقِ فاضلہ پر رکھی ہے اس لیے اس بات کا مختلف طریقوں سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ ملت میں اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوں اور اگر کوئی فعل اخلاقِ فاضلہ کے خلاف دیکھا جاتا ہے تو اس پر سزا دی جاتی ہے۔ لیکن مغربی نظامِ عدل میں اخلاق فاضلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ البتہ اگر کسی فرد کا کوئی عمل سوسائٹی کے دیگر افراد کے لیے مضر ہو یا اس کے امن عامہ میں خلل پڑنے کا امکان ہو۔ یا حکومت کے انتظامی امور میں دشواری پیدا کرنے والا ہو تو مغربی قانون حرکت میں آجاتا ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر ایک مرد اور عورت باہمی رضامندی سے زنا کا ارتکاب کریں یا کوئی شخص گھر میں یا بار میں بیٹھ کر شراب پیئے یا کلب میں جاکر جوا کھیلے تو مغرب کا نظام عدل اس سے کوئی تعرض نہیں کریگا۔ اس لیے کہ اس نظام میں فرد کے اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے زنا بالجبر کرے۔ یا شراب پی کر شارع عام پر غل غپاڑہ مچائے۔ جس سے لوگوں کے آرام میں خلل واقعہ ہوتا ہو۔ یا نشے کی حالت میں موٹر چلائے یا جس سے کسی کے کچل جانے کا اندیشہ ہو تو فوراً مغربی قانون حرکت میں آجائے گا۔

اسلامی نظام عدل میں یہ بات نہیں ہے۔ اسلامی شریعت سب سے زیادہ زور لوگوں کے اخلاق سنوارنے اور ایک صالح معاشرہ کی تخلیق پر دیتی ہے۔ کیونکہ

سارے فساد کی جڑ اخلاق کی تباہی ہے۔ اگر لوگوں کے کردار بہتر ہو جائیں تو بغیر کسی تادیبی کارروائی کے جرائم خود بخود کم یا ختم ہو جاتے ہیں۔ مغربی نظام عدل چونکہ تعمیر کردار پر زور نہیں دیتا اس لیے باوجود تمام تر کوششوں اور پروپیگنڈوں کے، جرائم کی شرح میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، مغربی نظام عدل کا ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے۔ عدالتوں کے چکر کا یہ عالم ہے کہ معمولی قسم کے فیصلے میں تین تین اور چار چار سال لگ جاتے ہیں اس کے بعد اپیلوں کا چکر چلتا ہے جس میں اتنی دشواریاں ہیں کہ مظلوم کی دادرسی تو درکنار وہ خود کو عذاب میں گرفتار سمجھنے لگتا ہے۔ دیوانی معاملات کی طوالت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ ایک ایک مقدمہ کے فیصلہ میں چودہ اور پندرہ سال کی مدت لگ جانا تو معمولی سی بات ہے۔ اور بسا اوقات حصول انصاف کے لیے صبر ایوبؑ اور عمر نوحؑ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کے نظام عدل میں بڑے بڑے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمہ کا فیصلہ دو چار دنوں میں ہو جاتا ہے اور "حقیقی عدل" کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ "انصاف کی تاخیر بھی اپنی جگہ پر خود بہت بڑی بے انصافی ہے"۔

اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں دراصل عدل و انصاف ہی ایک ایسا معیار اور ہتھیار ہے جس سے انسانیت کے جائز، جمہوری اور بنیادی حقوق کی حفاظت ممکن ہے۔ چھوٹے بڑے کے مفادات کی نگہداشت اور تحفظ ہوتا ہے اور حق بحق دار رسید والا معاملہ سامنے آتا ہے تو پورا انسانی سماج اور معاشرہ سکھ چین، اطمینان و سکون، لطف و کرم، امن و آشتی، بھائی چارہ، وسیع النظری، رواداری اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن جاتا ہے اور دنیا حقیقی سکون اور اطمینان کی سانس لے سکتی ہے یہ دور، بدقسمتی سے جس سے ہم گذر رہے ہیں نہال نکر

عمل کا بحرانی دور ہے اور جس کے مہلک اثرات سے پوری انسانی آبادی متاثر نظر آرہی ہے۔ دوسری اقوام و مذہب کی بات تو ہم نہیں کرتے' اور نہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ابھی ہم عالمی سطح پر اس پوزیشن میں ہیں۔ البتہ ملّت اسلامیہ' اور "امت مرحومہ" کے تعلق سے اتنا عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر یہ موجودہ خطرناک سماجی ناانصافی اور حق تلفی و استحصال جیسے اجتماعی امراض کے علاج کی متلاشی ہے تو بے شک اسے پوری مضبوطی سے اسلام کے ہی درخشاں نظریہ عدل و انصاف کے پاکیزہ روح پرور' سچا' پختہ' انمٹ اور راسخ' ذہن و دماغ کو اپیل کرنے والے اصول و ہدایات اپنانے ہوں گے جس کا سلسلہ محض اس دنیا میں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کا ربط اور سلسلۂ آخرت کی دائمی زندگی تک متواتر رہتا ہے۔ جی ہاں "عدل و انصاف" کو یقینی بنانا جس کا حکم بارگاہِ ایزدی سے نازل ہوا ہے بڑا ہی نازک اور فرض شناسی چاہتا ہے۔ اس لیے بتایا گیا ہے کہ "جسے کرسیٔ عدل پر بیٹھا دیا گیا گویا ذمہ داری کی شدت کے پیش نظر اسے کند چھری سے ذبح کر دیا گیا" اور جس نے خوف خدا اور محض حضرت حق جل مجدہٗ سے ڈر کر حق و انصاف کے مطابق پوری دیانت داری کے ساتھ فیصلہ دیا۔ وہ قیامت کے دن نور کے منبر پر بیٹھا دیا جائے گا۔ نیز ایک حدیث پاک کے اندر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میدان محشر میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم ہو گا اور ہر فرد و بشر اپنی جگہ حیران و پریشان ہو گا۔ جن سات قسم کے خوش بختوں اور سعادت مندوں کو "عرش خداوندی" کے زیر سایہ جگہ ملے گی۔ ان میں سر فہرست "الامام العادل" ہو گا۔ دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا اپنے ظالمانہ فیصلہ سے اپنے لیے دوزخ خرید لیتا ہے اور منصفانہ فیصلہ سے جنّت کا مستحق اور حقدار بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ظالم و جابر نظام حکومت کے تحت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہؒ نے قصر عدالت کے

کے بجائے پابندِ سلاسل ہونا، جیل کی تاریک کوٹھری میں بیٹھنا اور شاہانہ طمطراق اور کر و فر کے بجائے اپنی پیٹھ پر مسلسل کوڑے کھانا پسند فرمایا لیکن عہدۂ قضا اور تختِ عدل کو قبول فرمانے سے گریز کرتے رہے۔

قرآن مجید کے اندر رب العالمین کا بے غبار ارشاد ہے۔

"ان اللہ یامر بالعدل والاحسان" بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ (النحل)

آیت بالا کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں۔

قرآن مجید کو "تبیاناً لکل شیء" فرمایا گیا۔ یہ آیت اس کا ایک نمونہ ہے حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "خدائے تعالیٰ نے ہر ایک خیر و شر کے بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے گویا کوئی عقیدہ، خلق، نیت، عمل، معاملہ اچھا یا برا ایسا نہیں جو امراً و نہیاً اس کے تحت میں داخل نہ ہو گیا ہو۔" بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہی آیت "تبیاناً لکل شیء" کا ثبوت دینے کے لیے کافی تھی۔ شاید اس لیے خلیفہ راشد حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں اس کو درج کرکے امت کے لیے اسوۂ حسنہ قائم کر دیا۔ اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لیے تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے تاہم تھوڑا سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں تین چیزوں کا امر فرمایا ہے، عدل، احسان، اور ایتاء ذی القربیٰ۔ "عدل" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کے ترازو میں تلے ہوں۔ افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے

نہ چھوڑے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے پسند نہ کرے۔

"احسان" کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل، عفو، اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع اور تبرع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا۔ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اُدھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی سے ملے گا۔

"الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"

(صحیح بخاری)

"وھل جزاء الاحسان" الا الاحسان (القرآن)

یہ دونوں خصلتیں (عدل و احسان یا بالفاظِ دیگر انصاف و مروت) تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سے متعلق ہیں، لیکن اقارب کا حق ولجابت سے کچھ زائد ہے" الخ۔ (بحوالہ ترجمہ شیخ الہندؒ)

بہرحال اپنے تو اپنے غیروں اور دشمنوں کے بارے میں حضرت حق جل مجدہٗ، شریعت مصطفیٰؐ اور اسلام کے نظام عدل کو یہ گوارہ نہیں کہ ان کے ساتھ فیصلہ کرتے وقت کہیں ان کی دشمنی اور جذبۂ انتقام آڑے نہ آجائے۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

"ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون ۰"	اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ کے اور اللہ سے ڈرتے

رہو اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

(المائدہ) (ترجمہ شیخ الہند)

مذکورہ آیت کی شرح میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم خامہ فرسا ہیں۔ "عدل" کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلہ کو جھکا نہ سکے۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجے میں مضر ہیں ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام "تقویٰ" ہے۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب بعیدہ بہت سے ہیں تمام اعمالِ حسنہ اور خیر کو اس کے اسباب و میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و" یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات، محبت، و عداوت سے قطعی مغلوب نہ ہونا یہ یہ خصلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اس لئے "فرمایا" یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے کہ اس کی فراولات کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں یعنی ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک سکے۔ اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا خوف اور اس کی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف "ان اللہ ... تعلمون" کے مضمون کے بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

جب کبھی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو اس کا قلب خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں "عدل وانصاف" کا راستہ اختیار کرے گا اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پراس کے نتیجہ پر ثمرہ وہ ملے گا جسے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے"۔

(بحوالہ ترجمہ شیخ الہندؒ)

پیش کردہ آیاتِ بالا اور مختصر تشریح اور تفسیری نوٹ سے ہر صاحبِ نظر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام نے عدل انصاف کی ہر فردِ بشر کے ساتھ کس قدر شدت کے ساتھ تاکید کی ہے اور ذمہ دار حضرات کے سامنے واضح اور بے لاگ اصول بیان کر دیئے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جو عدل وانصاف، اور حریت ومساوات کی جیتی جاگتی تصویر اور شفاف آئینہ ہے۔ آپؐ نے خود اپنا بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

" امرنی ربی بتسع خشیۃ فی السر والعلانیہ، وکلمۃ العدل فی الغضب والرضی۔ الخ

(الحدیث بحوالہ رزینؒ)

میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتا ہوں اور غصے میں ہوں یا خوشی میں ہر حال میں "انصاف" کی بات کہوں۔

معتبر ترین روایات احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مخزومی خاندان کے متمول گھرانے کی ایک عورت نے کسی کے کنگن چرا لیے، پکڑی گئی، مقدمہ دربار رسالتؐ میں پیش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قوانین کے پیش نظر مجرمہ کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا کچھ لوگوں

کو بڑا دکھ، اور حیرت ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصفانہ فیصلہ پر تامل ہوا۔ چنانچہ لوگوں نے حضرت اسامہؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (زید ابن حارثہ حضور کے منہ بولے بیٹے) کے تعلق سے بیحد چہیتے اور محبوب تھے خدمت اقدس میں سفارشی بناکر پیش کیا کہ "فاطمہ" معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے معاملہ رفع دفع کر کے صرف نظر کرلیا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ صورت حال ملاحظہ فرمائی تو غصہ سے چہرۂ انور سرخ ہوگیا اور ارشاد کیا کہ پہلے کے لوگ اسی بنیاد پر ہلاک کر دیئے گئے کہ جب ان میں سے کوئی کمزور (مالی اور سماجی اعتبار سے) اور غریب غلط کام کرتا تو اسے فوری سزا دی جاتی اور اگر کوئی معزز یا طاقت ور ایسا کرتا تو اسے نظر انداز کر دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی اور جگر کا ٹکڑا فاطمہ زہراؓ سے بھی یہ حرکت سرزد ہوتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔ اور "اسلامی حد" جاری کرکے "عدل وانصاف" کو قائم کرتا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ کسی صحابیٔ جلیل کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اللہ ورسول کے معاملہ میں دخل اندازی کریں۔ تفصیلات کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔

اسلام کے نظام عدل کے تعلق سے مستند علماء کی وقیع تصانیف موجود ہیں اور اسیئر تواریخ میں سینکڑوں ایسے معاملات اور مثال ملتی ہیں جو موجودہ ظلم وبربریت، ناانصافی، اور حقوق تلفی کی دنیا میں مشعلِ راہ کی حیثیت اور راہی خطوط کا درجہ رکھتی ہے۔ تاہم اپنے موقف کے اثبات اور اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر بطور نمونہ مشتے از خروارے چند ایک معتبر واقعات وحقائق پیش کیے جاتے ہیں۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا سانحہ پیش آنے کے بعد بااتفاق جمہور اجلہ صحابہ کرامؓ خلافت وقیادت کی ذمہ داری سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی

اللہ عنہ کو سونپی گئی۔ بیعتِ عام کے بعد حضرت صدیق اکبر رضؓ نے منبر پر بیٹھ کر جو پہلا خطبہ دیا اور اپنے آئندہ طرزِ عمل اور پالیسی کی توضیح فرمائی اس میں ایک تاریخی جملہ یہ بھی فرمایا کہ "انشاء اللہ" تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں۔ انشاء اللہ اور تمہارا قوی فرد بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق دلا دوں" (بحوالہ طبقات ابن سعد)

خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کی خلافت و امارت کی کی پوری عدل و انصاف، مساوات و برابری، ہمدردی و بہی خواہی، دردمندی اور دلسوزی کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جبلہ بن الایہم کا واقعہ یاد کرنے کے لائق ہے جو امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضؓ کے ہمراہ مناسک حج ادا کر رہا تھا، حالت طواف میں جبلہ کا تہبند جو امارت اور شوکت کے سبب زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ قبیلہ فزارہ کے ایک شخص کا پیر غلطی سے پڑ گیا۔ جبلہ کو غصہ آگیا اور اس نے زور سے ایک تھپڑ رسید کیا کہ اس شخص کے دانت ٹوٹ گئے۔

مقدمہ خلافت کی عدالت میں پہونچا۔ حضرت عمر رضؓ نے جبلہ سے فرمایا کہ یا تو تم مدعی کو رضامند کر لو ورنہ قصاص لیا جائے گا۔ جبلہ کو یہ خلاف توقع فیصلہ سخت ناگوار گذرا، اس نے کہا کہ ایک معمولی شخص کے عوض مجھ سے قصاص لیا جائے گا، میں اپنی جگہ کا بادشاہ اور اہم آدمی ہوں اور وہ عام رعیت کا ایک فرد، حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ "اسلام نے تم کو اور اس رعیت کو اپنے احکام کے معاملہ میں مساوی کر دیا ہے۔ اگر کسی کو کسی پر فضیلت ہے تو محض اعمالِ صالح اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے ہے"۔

(بحوالہ اسلام کی اشاعت ص ۲۱۰)

رعایت نہیں فرمائی۔ اور دنیا کو بتلا دیا کہ "اسلام کا نظامِ عدل" کیا ہے؟ اور اپنے پرائے کے فیصلہ کے نازک وقت میں کس طرح عہدہ برآ ہونا ہے اور اس وقت اسلام کا مطالبہ کیا ہے؟

تاریخی حوالے سے یہ بات ثابت ہے کہ خلیفہ اعظمؓ کے صاحبزادے فرزندِ ارجمند نے مصر کے اندر شراب پی لی تھی۔ مصر کے گورنر نے یہ سمجھ کر خلیفۂ وقت کے صاحبزادے سے لغزش ہو گئی ہے تنہائی میں کمرہ کے اندر بلوا کر اسلامی حدود کی روشنی میں ہلکی سزا دے دی اور مطمئن ہو گئے۔

شدہ شدہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی، فوراً فرمان جاری کیا اور تحریر فرمایا کہ "تم نے محض یہ جان کر کہ خلیفۂ وقت کا بیٹا ہے۔ اسلامی سزا میں مداہنت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مجرم کو یہاں بھیجا جائے تاکہ میں خود اپنی نگرانی میں شرب خمر کی سزا دوں۔ اور تم کو بھی اپنے عہدے محض اس بنیاد پر معزول کیا جاتا ہے کہ اسلامی عدل کے مظاہرہ اور حد جاری کرنے میں نرم گوشہ کیوں اختیار کیا؟" صاحبزادہ یوں ہی مصر سے مدینہ آیا فوراً سزا کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سفارش کی کہ صاحبزادہ کی طبیعت کچھ علیل ہے اور پھر ایک حد تک سزا مل بھی چکی ہے۔ بہتر ہوگا چند دن تاخیر کیا جائے۔ فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، زندگی کا کیا بھروسہ۔ ممکن ہے اسی حال میں میری موت آجائے! اور میں حدود اللہ کو جاری کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں چلا جاؤں!

بالآخر بھرے دربار میں فرزندِ ارجمند کو شرعی سزا دی گئی اور بغیر کسی رو رعایت کے نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبزادہ کے مرض میں اضافہ ہو گیا۔ اور پھر جانبر نہ ہو کے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کیا دنیا کی متمدن سے متمدن تاریخ کی بھی "عدل و انصاف" کی یہ روحانی نظیر پیش

کرسکتی ہے؟ دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دورِ خلافت وسیادت ہے۔ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوگئی، جو ایک یہود کے ہاں پکڑی گئی، قاضی وقت حضرت شریحؓ (جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ سے ہی عہدۂ قضا پر فائز چلے آرہے تھے) مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت قاضی نے فریقین کے نام سمن جاری کردیا۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک طرف ادنیٰ یہودی ہے (جس کا کوئی مذہب نہیں) اور دوسری طرف خلیفۂ اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدسی الاصل اور پاکیزہ شخصیت گرامی ہے مگر چونکہ عدل وانصاف کا معاملہ ہے۔ اس لیے عدالت میں حاضری ناگزیر اور ضروری ہے قاضی عدالت نے کرسی پر بیٹھ کر حضرت علیؓ سے اپنے دعوے پر گواہ طلب فرمایا آپؓ نے اپنے بیٹے حضرت حسنؓ اور غلام ( ) کو شہادت میں پیش کیا۔ قاضیؒ نے گواہوں کی پوزیشن دیکھ کر فرمایا کہ میرے نزدیک باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی معتبر نہیں ہے کوئی دوسرا گواہ پیش کیجیے۔

خلیفہ وقت نے یہ سن کر فرمایا کہ دوسرا گواہ تو اور کوئی نہیں ہے۔ البتہ میرے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق قابلِ اعتبار ہے!۔

قارئین کرام سوچتے ہوں گے؟ کہ خلیفہ وقت کے حق قاضی نے یہ سن کر فیصلہ دے دیا ہوگا اگر کیسے سمجھایا جائے کہ یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ کہ قاضی نے دوسرا ہی فیصلہ صادر فرمایا۔ مقدمہ خارج اور فیصلہ یہودی کے حق میں یہودی نے جب "عدل وانصاف" کا یہ اسلامی رنگ دیکھا تو انسانی فطرت صحیحہ کے خلاف اور بات ناممکن ہوتی کہ وہ متاثر نہ ہوتا۔ اس بے مثال واقعہ، اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔ فوراً اپنے جرم کا اعتراف کرکے اسلام کی غلامی کا طوق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اور گواہی دی کہ بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے فرستادہ اور رسول برحق ہیں اور دین اسلام کی تعلیمات ہر لحاظ سے تسلی بخش اور فطرتِ انسانی کے ہم آہنگ ہیں۔ دو گروہوں یا دو آدمیوں میں جب کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو اکثر ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر اپنے مفاد پر ہوتی ہے جس جس میں بظاہر فائدہ نظر آئے آدمی اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی یہ ہے کہ "معاملہ" کو حق اور ناحق، انصاف اور بے انصافی اور عدل و ظلم کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ اور جو طریق کار بھی عدل و انصاف کے مطابق ہو اختیار کیا جائے اور جو طریقہ بھی عدل اور حق کے خلاف ہو چھوڑ دیا جائے۔

پوری اسلامی تاریخ الحمدللہ حق و انصاف اور عدل و مساوات کی داستان سے لبریز ہے اور زبانِ حال سے ملک و قوم، اور نوع انسانی کو دعوتِ فکر، دعوتِ عمل اور دعوتِ عدل دے رہی ہے۔

آخر میں ہندوستان کی آزادی کے ممتاز رہنما "گاندھی جی" کا وہ حقیقت افروز تبصرہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو موصوف نے دہلی کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام لیلا گراونڈ (RAM LILA GROUND) برسرعام اظہار و اعلان کیا تھا۔ حقیقت ہے "الافضل

بعد میں خود اپنے اخبار "ہریجن" (HARIJAN) بابت ۲۷-۷-۳۷ میں نقل کیا۔ الفاظ ہیں:۔

"SIMPLICITY IS NOT THE MONOPOLY OF CONGRES SS IS THE GAME NOT GOING TO MENTION THE NAMES OF RAMA AND KRISHANA, BECAUSE THEY ZERE NOT THE HISTURICAL PERSONALITIES, GAME

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

برہان دہلی
دسمبر ۸۸ء

قرآن کریم میں ترادف

(تیسری قسط)

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی ——— عربی سے ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن میں خشوع صرف اللہ کے لیے بیان ہوا ہے، اسے اہلِ ایمان کی صفت یا حال بتایا گیا ہے جو صرف اسی دنیاوی زندگی کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام صریح آیات میں ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں:

الاسراء ۱۰۹: إذا يتلى عليهم يخرّون سجّداً ويقولون سبحان ربنا إن كان وعد ربنا لمفعولا، ويخرّون للأذقان يبكون ويزيدهم خشوعا،

المومنون ۲: قد أفلح المومنون الذين هم في صلاتهم خاشعون

آل عمران ۱۹۹: خاشعين لله لا يشترون بآيات الله ثمنا قليلا

الانبیاء ۹۰: إنهم كانوا يسارعون في الخيرات، ويدعوننا رغباً ورهباً، وكانوا لنا خاشعين،

بیانِ قرآنی میں خشوع کی نسبت جہاں مجرمین اور کفار کی طرف کی گئی ہے وہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا صدور ان کی طرف سے آخرت میں ہوگا جس سے اُن کو ڈرایا دھمکایا ہے۔ جیسا کہ آیات کے صریح سیاق سے معلوم ہوتا ہے:

الغاشیہ ۲: هل أتاك حديث الغاشية، وجوه يومئذ خاشعة، عاملة ناصبة، تصلى ناراً حامية

النازعات ۹: قلوب يومئذ واجفة، أبصارها خاشعة، يقولون أ إنا لمردودون في الحافرة، أإذا كنا عظاما نخرة، تلك إذاً كرة خاسرة

المعارج ۴۴: فذرهم يخوضوا ويلعبوا حتى يلاقوا يومهم الذي يوعدون

یوم یخرجون من الأجداث سراعًا کأنہم إلی نصب یوفضون، خاشعۃ أبصار ہم ترہقہم ذلۃ، ذلک الیوم الذی کانو یوعدون

الشوری ۴۵: وتری الظالمین لما رأوا العذاب، یقولون ہل إلی مرد من سبیل، وتراہم یعرضون علیہا خاشعین من الذل

القمر: فتول عنہم یوم یدع الداع إلی شیء نکر، خشعا أبصارہم یخرجون من الاجداث کأنہم جراد منتشر

مجھے نہیں معلوم کہ مفسرین اور اہل بلاغت میں سے کسی کی توجہ اس پہلو کی طرف مبذول ہوئی ہو کہ خشوع کی نسبت دنیا میں اہل ایمان کی طرف ہے اور آخرت میں کافروں، مجرموں اور ظالموں کی طرف۔ میرے خیال میں اس کا بیانی راز یہ ہے کہ کفار کا خشوع اس دن کے آنے کے بعد ہوگا جس سے انھیں ڈرایا جاتا ہے۔ اس دن خوف، ڈر اور ذلت کی وجہ سے ان میں خشوع پیدا ہوگا۔ جبکہ اہلِ ایمان میں دنیا میں سچے ایمان، تقوی اور خشیت الٰہی کی بنا پر خشوع پیدا ہوتا ہے۔

سورۂ حشر کی آیت کے مطابق پہاڑ میں خشوع اس لیے نہیں پیدا ہوا کیونکہ اس پر قرآن نازل نہیں کیا گیا، ورنہ اگر اس پر قرآن نازل کر دیا جاتا تو تم دیکھتے کہ اللہ کی خشیت سے وہ شق ہو جاتا۔ یہ ایک مثال ہے جسے اللہ نے لوگوں کے لیے بیان کیا ہے تاکہ وہ غور کریں۔

جب بے جان و سخت جان پہاڑ اس قرآن کی جلالت کی وجہ سے خشیت الٰہی سے خاشع اور متصدع دکھائی دیتا ہے تو اس انسان کا کیا حال ہونا چاہیے جو حس وادراک، شعور، قوت تمیز اور سننے اور دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ لیکن انسان پر قرآن نازل ہونے کے باوجود وہ کم ہی اللہ کی خشیت سے خاشع دکھائی دیتا ہے جبکہ اگر قرآن پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ بھی حالت خشوع میں ہوتا۔

عقل کے انکار اور دل کی قساوت کی وجہ سے انسان کی انسانیت کہیں زیادہ بے حس ہوجاتی ہے اور اس میں تاثیر اور عبرت پذیری کی صلاحیت بالکل مفقود ہوجاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دل پتھر سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ بے حس ہوجاتا ہے:

"وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون" (الحشر-۲۱)

زوج اور امرأة

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم وحوا کا قصہ بیان کرتے ہوئے 'زوج' کا لفظ استعمال کرتا ہے [دیکھئے آیات: البقرہ ۳۵، الاعراف ۱۹، طہ ۱۱۷] جبکہ بعض مقامات پر 'امرأة' کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے امرأة العزیز، امرأة نوح امرأة لوط امرأة فرعون۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ میں سے ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوسکتا ہے اس لیے کہ دونوں قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جیسے ہم زوج آدم کی جگہ 'امرأة آدم' اور امرأة العزیز کی جگہ زوج العزیز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کا معجزانہ بیان اس کا انکار کرتا ہے۔

اسی سے ہم پر دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ آدم وحوا جو اس صفحۂ ہستی پر پہلے دو انسان ہیں۔ ان کے درمیان تعلق کا مناط 'زوجیت' ہے آدم کی بیوی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت نہ تھیں۔ بلکہ صرف وہی ان کی بیوی تھیں۔ ان کا آدم سے تعلق اور وجود کا راز صرف اور صرف زوجیت تھا۔

ہم قرآن میں دونوں الفاظ کے استعمال کے سیاق میں تدبر کرتے ہیں تو دلالت کا راز آشکارا ہوتا ہے۔ لفظ 'زوج' اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں مناط 'زوجیت' ہو۔ حکمت اور نشانی کے اعتبار سے یا قانون اور حکم کے اعتبار سے۔

زوجیت کی نشانی (سکون، مودت اور رحمت) کے معنی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم - ۲۱)

"والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ أعین واجعلنا للمتقین اماما" (الفرقان - ۷۴)

اسی طرح آخرت میں ملنے والی بیویوں کیلئے 'ازواج' کا لفظ آیا ہے، دیکھئے آیات: الواقعہ: ۷، البقرہ: ۲۵، آل عمران: ۱۵، النساء: ۵۷، الزخرف: ۷۰، یٰس: ۵۶

لیکن جب خیانت یا عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے زوجیت کی نشانی یعنی سکون محبت اور رحمت مفقود ہو جائے تو قرآن زوج کے بجائے "امرأۃ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

"امرأۃ العزیز تراود فتاھا عن نفسہ" (یوسف: ۳۰)

"امرأۃ نوح وامرأۃ لوط" کانتا تحت عبدین من عبادنا فخانتاھم فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئا (التحریم)

"امرأۃ لوط" العنکبوت ۳۳، النمل ۵۷، الحجر ۶۰، الذاریات ۸۱، الاعراف ۸۳

"امرأۃ فرعون" التحریم - ۱۱

فرعون کی بیوی کیلئے امرأۃ کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ دونوں کے درمیان زوجیت کی نشانی مفقود تھی اس لیے کہ وہ مومن تھی اور فرعون کافر۔

انسان اور دوسری جاندار مخلوقات (حیوانات و نباتات) میں زوجیت کی حکمت توالد و تناسل ہے۔ اسی سیاق میں مندرجہ ذیل آیات میں 'زوجین'

زوجین اور ازواج کے الفاظ مذکر و مونث کیلئے استعمال ہوئے ہیں:
النساء-۱، ھود-۴۰، الشوریٰ ۱۱، یٰس-۳۶، الذاریات ۴۹،
النجم ۴۵، النساء ۸، ساتھ ہی دیکھئے مزید آیات:
المومنون ۲۷، الانعام ۱۴۳، الزمر ۶، الرعد ۳، لقمان ۱۰، الحج ۵، الشعراء ۷، طٰہٰ ۵۳، ق ۷،

جب انسان میں زوجیت کی حکمت بانجھ پن یا بیوگی کی وجہ سے مفقود ہو جائے تو قرآن زوج کے بجائے امرأۃ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (حضرت سارہ) اور عمران کی بیوی کے بارے میں امرأۃ ہی کا لفظ آیا ہے۔ دیکھئے آیات: ھود ۷۱، الذاریات ۲۹، آل عمران ۳۵
حضرت زکریا اللہ تعالیٰ سے تضرع کرتے ہیں:
"وکانت امرأتی عاقراً فھب لی من لدنک ولیاً" (مریم-۵)
"قال رب أنی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامرأتی عاقر" (آل عمران)
پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور زوجیت کی حکمت ثابت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:
فاستجبنا له ووهبنا له یحیی وأصلحنا له زوجه" (الانبیاء-۹۰)
تشریح کی آیات میں احکام 'زوج' 'ازواج' سے اس وقت متعلق ہوتے ہیں جب زوجیت حقیقۃً یا حکماً قائم ہو جیسے میراث کے احکام میں اور ان عورتوں کی عدت میں جن کے "ازواج" وفات پا چکے ہیں (البقرہ-۲۳۴) لیکن جب طلاق یا ایلاء کی وجہ سے زوجیت کا تعلق منقطع ہو جائے تو احکام کا تعلق ازواج کے بجائے نساء سے ہو جاتا ہے جیسے آیات: الطلاق ۱، البقرہ ۲۲۶
سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

"فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره" (البقرہ۔۲۳۰)

اس کا تقاضا ہے کہ طلاق بائن پانے والی عورت اور محلل کے درمیان زوجیت عملاً قائم ہو، اور محض نکاح کی ظاہری کارروائی ہو جانے سے طلاق دینے والے شوہر کی طرف اس کی دوبارہ واپسی جائز نہ ہو۔

سورۂ مجادلہ میں ظہار کی آیت ہے:

"قد سمع الله قول التي تجادلك في زوجها وتشتكي إلى الله" (المجادلہ۔۱)

اس آیت میں "زوج" کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ زوجیت قائم ہے۔ اور آیت "والذين يظاهرون من نسائهم" میں "نساء" کا لفظ اس لیے آیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے ظہار کے ذریعے زوجیت کو معطل کر دیا ہے۔

کیا دو مختلف صیغوں کے الفاظ کے ایک معنی ہو سکتے ہیں؟

عربی زبان کے محققین نے صرف انھیں الفاظ میں ترادف کا انکار نہیں کیا ہے جن کے حروف اور مادے مختلف ہوں۔ بلکہ ان کے الفاظ کے بھی مترادف ہونے کا انکار کیا ہے جن کے مادے اور حروف یکساں ہوں۔ لیکن ان کے صیغے اور وزن مختلف ہوں الّا یہ کہ ان کا استعمال دو لغتوں میں ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی جائز نہیں کہ دو الفاظ میں حرکتوں میں اختلاف ہو اور ان کا معنی ایک ہو۔

ابو ہلال نے اس سلسلہ میں مبالغہ کے صیغوں کی مثال دی ہے کہتے ہیں:

"جب آدمی میں جب کام کرنے کی صلاحیت بالقوی موجود ہو تو "فعول" کہتے ہیں جیسے صبور، شکور، اور جب وہ وقت بوقت کام کرے تو "فعّال" کہتے ہیں جیسے علّام صبّار، اور جب ویسا کام کرنا اس کی عادت ہو جائے تو "مفعال" کہتے ہیں جیسے معوان معطاء، جو شخص معانی کے اس اختلاف کو نہیں سمجھتا وہ گمان کرتا ہے کہ تمام صیغوں

سے صرف مبالغہ کا فائدہ حاصل ہوتا ہے حالانکہ بات صرف اتنی نہیں ہے بلکہ مبالغہ کا فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ مذکورہ معانی بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح تمام کلام میں "فعلت" اور "أفعلت" کے وزن پر آنے والے الفاظ کے معانی میں فرق ہوتا ہے الا یہ کہ دونوں الگ الگ لغت میں ہوں جیسے "سقیت الرجل" کے معنی ہیں "تم نے آدمی کو پینے والی کوئی چیز دی یا اس کے حلق میں ڈال دی" اور "أسقیت الرجل" کا مطلب یہ ہے کہ "تم نے اس کیلئے پانی کا ایک حصہ خاص کر دیا" اسی طرح "شرقت الشمس" کا مطلب ہے کہ سورج طلوع ہوا (غربت کی ضد) اور "أشرقت الشمس" کا مطلب ہے کہ سورج روشنی والا ہوگیا رہا بعض اہل لغت کا یہ قول کہ الشَعَر اور الشَعْر اور النَهَر اور النَهْر ایک معنی میں ہے تو در حقیقت یہ دو لغتیں ہیں۔ جب حرکتوں کے اختلاف سے معانی کا اختلاف لازم آتا ہے۔ تو خود معانی کے اختلاف سے ایسا ہونا زیادہ قرین صواب ہے"۔ ؎

عربی زبان کی عظیم کتاب ۔ قرآن کریم ۔ ہم پر یہ دقیق نکتہ واضح کرتی ہے کہ جو الفاظ ایک مادہ سے ہوں لیکن ان کی حرکتوں یا صیغوں میں اختلاف ہو۔ ان کی دلالتوں میں فرق ہو جاتا ہے ۔ اس کی کچھ مثالیں ذیل کی سطور میں بیان کی جارہی ہیں۔

× × ×

اشتات اور شتی:

دونوں کا مادہ ایک ہے ۔ الشتت اور الشتات لغت میں تفریق و

؎ ۔ ابو ہلال العسکری: الفروق اللغویہ ص ۱۲-۱۳

اختلاف کے معنی آتے ہیں۔ یہ مادہ قرآن میں پانچ جگہ آیا ہے۔ تین جگہ شتی کے صیغے میں، ذیل کی آیات میں:

طٰہٰ ۵۳: وأنزل من السماء ماءً فأخرجنا به أزواجاً من نبات شتّیٰ

اللیل ۴: إن سعیکم لشتّیٰ

الحشر ۱۴: تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتّیٰ

ان آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی اختلاف کے ہیں جو ائتلاف (اتحاد) کی ضد ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل دو آیتوں میں اشتات کے صیغے میں آیا ہے جس کا معنی سیاق کی رو سے تفریق وانتشار (الگ الگ رہنا) ہے۔ جو 'تجمّع' کی ضد ہے۔

الزلزلۃ ۶: یومئذ یصدر الناس اشتاتاً لیروا أعمالھم

النور ۶۱: لیس علیکم جناح أن تاکلوا جمیعاً أو أشتاتاً

الإنس اور الإنسان:

دونوں کا مادہ ایک ہے جو توحش کی ضد ہے۔ لیکن دونوں میں ترادف نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک میں ایک خاص ملحوظ ہے۔ جو اسے دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

لفظ 'إنس' قرآن میں ہمیشہ 'جن' کے ساتھ تقابل کے طور پر آیا ہے۔ کسی بھی جگہ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔ تمام آیات میں 'جن' کے قسیم کی حیثیت سے اس کا استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات کی تعداد ۱۸ ہے اس میں 'انسیت' کا پہلو ہے جو 'توحش' کی ضد ہے۔ 'جن' کے مقابل میں اسے بیان کرنے سے یہی مفہوم بصراحت معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ 'جن'

سے "خفاء" پر دلالت ہوتی ہے جو توحش کے مظاہر میں سے ہے۔ اسی "انسیت" سے ہماری جنس ان جنسوں سے ممتاز ہے جو مخفی، مجہول اور نامانوس ہیں اور جو ہماری زندگی کے قوانین کے تابع نہیں ہیں۔

رہا لفظ "انسان" تو معجزانہ بیان کی آیات کا استقراء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی "انسانیت" کا مناط محض "انس" ہوتا نہیں ہے بلکہ اس میں انسانیت دراصل مکلف ہونے کی اہلیت، بارِ امانت کا تحمل اور خیر و شر کی آزمائش کی منزل تک ارتقاء ہے۔[۵]

قرآن کریم میں لفظ "انسان" ۶۵ مقامات پر آیا ہے۔ جب ہم ان تمام آیات کے سیاق میں غور کرتے ہیں تو ہمیں "انسانیۃ" کی ممتاز دلالت کا اشارہ ملتا ہے

وہ اپنی عام جنس میں "انس" ہے۔

"خلق الانسان من صلصال کالفخار، و خلق الجان من مارج من نار (الرحمن - ۱۴)

"ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون، والجان خلقناہ من قبل من نار السموم (الحجر - ۲۶)

لیکن اپنی "انسیۃ" کے ساتھ انسان مندرجہ ذیل خصوصیات کا بھی حامل ہے:

قرات وعلم : سورۂ العلق ۱ - ۵

بیان : الرحمن - ۳

مکلف ہونا : الدہر، النجم ۳۹، القیامہ ۱۴، الاسراء ۱۷

مجادلہ و خصومت : کہف ۵۴

[۵] اس استقراء کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتب التفسیر البیانی للقرآن الکریم کا دوسرا حصہ

وصیت: لقمان ۱۴، العنکبوت ۸
مشقت کو برداشت کرنا: البلد ۴

اس بار امانت کو اٹھانے والا جسے اٹھانے سے آسمان، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا اور اس کے اٹھانے سے خوف محسوس کیا: الاحزاب ۷۲

آزمائش اور گمراہی سے دوچار ہونے والا: الفرقان ۴۴، ق ۱۶، الحشر ۱۶، الدھر ۲، ۴، الفجر ۱۵

غرور استکبار کرنے والا اور اپنے خالق سے بے نیاز سمجھ کر گمراہ ہو جانے والا: العلق ۶

اسی طرح بکثرت مقامات پر قرآن انسان کو اس کا ضعف اور ناتوانی یاد دلاتا ہے تاکہ اس کا غرور ٹوٹے اور وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے سرکشی نہ کرے کیونکہ اس بات کا گمان تھا کہ سرکشی اسے خالق کے انکار تک پہنچا دے اور اسے کھلا ہوا جھگڑالو بنا دے۔

النحل ۴، مریم ۶۷، الانفطار ۶، حم السجدہ ۴۹، الزخرف ۱۵، عبس ۱۷، العادیات ۶ تا ۹

النعمۃ اور النعیم:

دونوں الفاظ ایک مادہ سے ہیں اور دونوں اپنے مشترک مادے کی عام دلالت میں مشترک ہیں لغت کی کتابوں میں دونوں صیغوں میں کوئی فرق نہیں ملتا۔

---

[۱] مزید تفصیل اور وضاحت کیلئے دیکھئے میری کتاب "مقال فی الانسان: دراستہ قرآنیۃ" طبع المعارف، ۱۹۶۹ء۔

اہل تفسیر 'نعیم' کی تفسیر ان تمام معانی سے کرتے ہیں جو اس مادہ کی لغوی دلالت میں پائے جاتے ہیں۔ ؎۱۰

پورے قرآن میں جب ہم دونوں صیغوں کا استقراء کرتے ہیں تو دونوں کے معنی میں واضح فرق دیکھتے ہیں 'نعمۃ' کا لفظ قرآن میں مختلف اقسام کی دنیوی نعمتوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔ تمام مواقع استعمال میں (خواہ اس کا استعمال مفرد ہوا ہو یا جمع) ایسا ملتا ہے کہیں اس کے برخلاف نہیں ہے۔ ان کی تعداد ۵۳ ہے۔

لیکن 'نعیم' کا صیغہ قرآن میں اسلامی دلالت کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا استعمال صرف آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص ہے۔ ایسا تمام آیتوں میں ہے جن کی تعداد ۱۶ ہے۔

پندرہ آیتوں میں صریح لفظ کے ساتھ وارد ہے جنت کی نعمتوں کے علاوہ کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی

الواقعہ ۸۹: فأما إن كان من المقربين، فروح وريحان وجنة نعيم

المعارج ۳۸: أيطمع كل امرئ منهم أن يدخل جنة نعيم

المطففین ۲۲: إن الأبرار لفي نعيم، على الأرائك ينظرون، تعرف في وجوههم نضرة النعيم

الشعراء ۸۵: واجعلني من ورثة جنة النعيم

الدھر ۲۰: وجزاهم بما صبروا جنة وحريرا . . . وإذا رأيت ثم رأيت نعيما وملكا كبيرا

؎۱۰ دیکھئے تفسیر طبری اور تفسیر کبیر الرازی سورہ التکاثر

المائدة ۶۵ : ولأدخلناهم جنات النعيم
يونس ۹ : تجري من تحتهم الانهار في جنات النعيم
القلم ۳۴ : إن للمتقين عند ربهم جنات النعيم
لقمان ۸ : إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات لهم جنات النعيم
الطور ۱۷ : إن المتقين في جنات النعيم
الحج ۵۶ : الملك يومئذ لله، فالذين آمنوا وعملوا الصالحات في جنات النعيم

[ساتھ ہی دیکھئے آیات : الصافات ۴۳، الواقعہ ۱۲]

التوبہ ۲۹ : وجنات لهم فيها نعيم مقيم

صرف سورہ تکاثر کی آیت میں ان لوگوں کو خطاب کرکے جنھیں ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا کمانے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ کہا گیا ہے:

"ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم" (۸)

تمام آیات میں قرآن کے 'نعیم' کے صیغے کو آخرت کی نعمتوں کے ساتھ خاص کر دینے کے بعد ہم اس آیت کی وہ تفسیر نہیں کرسکتے جو ہمیں تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اور یہاں 'نعیم' سے مراد دنیا کی نعمتیں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ دنیا کی نعمتوں کیلئے بیان قرآنی میں نعمۃ، نعماء اور نعم وغیرہ کے صیغے آئے ہیں۔ اس آیت میں بیانی راز یہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیاوی اسباب کی زیادتی نے آخرت کیلئے زاد فراہم کرنے سے غافل رکھا ان لوگوں سے اس دن جب وہ جہنم دیکھ لیں گے (اور یقیناً اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے) یہ سوال کیا جائے گا کہ حقیقی نعمت (نعیم) کیا ہے؟ اور اس وقت انھیں اس 'نعیم' کی حقیقت کے بارے میں علم الیقین حاصل ہوجائے گا جسے انھوں نے ضائع کردیا اور دنیائے فانی کی نعمتوں پر ٹوٹے پڑے

رہے اور اس کے چند روزہ اسباب کی کثرت نے انھیں اس سے غافل رکھا[11]

× × ×

یہاں میں ان شواہد کے پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہوں جو ان محققین اہل لغت کے مسلک کی تائید کرتی ہیں جو دو الفاظ کے مترادف ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ الا یہ کہ دو لغتوں میں آئیں۔

"لیکن یہ کہ ایک ہی لغت میں یہ محال ہے کہ دو الفاظ مختلف ہوں اور ان کا معنی ایک ہو جیسا کہ بہت سے نحویین اور لغویین کو گمان ہوا۔ انھوں نے اہل عرب کو ان کی حقیقت پر اور عادت کے مطابق جیسا کہ وہ معروف تھے بولتے ہوئے سُنا، بولنے والوں کے نفوس میں ان کے مختلف معانی کا استحضار تھا لیکن سننے والے ان علتوں اور فروق کو نہ سمجھ سکے اور انھوں نے ان کے مترادف ہونے کا گمان کر لیا اور اہلِ عرب کے بارے میں ایسی بات کہہ دی جو صحیح نہ تھی"[12]

× × ×

مجھے اعتراف ہے کہ میں قرآن کے بعض الفاظ (جو بظاہر مترادف معلوم ہوتے ہیں) کی دلالتوں میں فرق جاننے سے قاصر رہی ہوں۔ میں اپنی عاجزی اور جہالت کا پورا اعتراف کرتی ہوں اور ابن الاعرابی کے یہ الفاظ مستعار لیتی ہوں۔

"دو الفاظ جنھیں اہلِ عرب نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے۔ انمیں سے ہر ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے میں نہیں بسا اوقات ہمیں وہ معلوم ہو گیا ہے تو ہم نے تبلا دیا ہے اور کبھی ہم نہیں جان سکے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اہلِ عرب کو بھی وہ معلوم نہ تھے"[13]

---

[11] دیکھئے التفسیر البیانی کے پہلے حصے میں سورۃ التکاثر۔ طبع المعارف۔

[12] ابو ہلال العسکری: الفروق اللغویہ صد ۱۲

[13] ایضاً صد ۶۵

نذرانۂ عقیدت

بحضور مفتی عتیق الرحمن عثمانی بانی ندوۃ المصنفین دہلی

از کمال جعفری، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

اے مفکر، اے مدبر اے امیر کارواں
تو نہیں لیکن زمانے میں ہے تیری داستاں

اے امام قوم اے فخر وطن اے روزگار
تجھ کو قدرت نے عطا کی تھی نگاہِ معتبر

ملک و ملت کے لیئے تھی وقف تیری زندگی
قابلِ صد رشک تیری ذات کی تھی سادگی

گفتگو میں تیری پوشیدہ تھی شانِ دلبری
ایسا لگتا تھا کہ تجھ پر ختم تھی دانشوری

تجھ کو بخشا تھا خدا نے کیا غضب کا حافظہ
آیت قرآن سے کرتا تھا حل ہر مسئلہ

مفتیٔ دیں میں کہوں یا مفتیٔ اعظم کہوں
یا کہ تجھ کو رازہائے قوم کا محرم کہوں

تیری ہر تقریر ہوتی تھی ہمیشہ دل پذیر
جس کی اب دنیا میں مل سکتی ہے مشکل سے نظیر

حوصلہ تیرا ہمالہ عزم تھا تیرا افلاک
تیرے دل میں ہندو مسلم کا تھا درد مشترک

پاکباز و پاک سیرت نیک خواندان تھا
فخر ہند و فخرِ مسلم فخرِ ہندوستان تھا

تو کہ علم و فضل کا تھا ایک بحرِ بیکراں
ناز کرتی تھی خطابت پر تری اردو زباں

فضلؒ جیسے صاحبِ علم و عمل دادا ملے
تربیت پائی چچا شبیرؒ کے سائے تلے

شفقتِ پدرِ عزیزؒ مردِ حق حاصل رہی
درسِ انور شاہؒ سے عرفان کی دولت ملی

دیوبند سے کرکے جب تعلیم تو فارغ ہوا
درس دینی مدرسوں میں جابجا دیتا رہا

شہرِ کلکتہ ہو یا ڈابھیل و بیضاوی شریف
تو جہاں ٹھہرا نہ پیدا ہو سکا کوئی حریف

جس جگہ پہنچا اسے جنت بداماں کر دیا
قوم مسلم کے لئے راحت کا ساماں کر دیا

کرکے قائم انجمن ندوۃ المصنفین کی
عمر بھر دہلی میں کی خدمت خدا کے دین کی

تیمیہؒ اور ابن جوزیؒ کی کتب کے ترجمے
انہماک و شوق سے تو نے بہت اچھے کیے

حق پرست و حق شناس و حق نگر پاکیزہ ذات
خوبیاں کیا ہوں بیاں تجھ میں ہزاروں تھیں صفات

ماہنامہ جاری کردہ جو ترا "برہان" ہے
تشنگانِ علم پیاس کا بڑا احسان ہے

اس رسالے کو سعید احمدؒ نے بخشا وہ وقار
ہو گیا دنیائے علم و فن میں یہ اک شاہکار

درحقیقت تھے رفیقِ کار تیرے جاں نثار
کرکے باہم مشورے کرتے تھے کار بے شمار

اللہ اللہ کس قدر بیدار تھا تیرا شعور
دم بخود افکار رہتے تھے سدا تیرے حضور

تیرے جیسا اب مسلمانوں میں ہے خادم کہاں
اب کہاں ڈھونڈوں تجھے آنکھوں سے آنسو ہیں رواں

بارگاہِ حق میں ہو جائے دعا میری قبول
تیرے مرقد پر قیامت تک ہو رحمت کا نزول

حشر تک باقی رہے گا مفتیؒ دیں تیرا نام
روح کو تیری کمالِ بے ہنر کا صد سلام

تبصرے

تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء

مصنف: مولانا شہاب الدین ندوی

ناشر: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ

قیمت: نامعلوم

صفحات: ۲۷۷

سائنسداں جب کافی مشاہدہ، حقائق جمع کر لیتا ہے تو وہ ان کو ترتیب دے کر ایک فطری قانون اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر اس کے ایک مخصوص ترتیب بندی میں چند حقائق موافق ہوتے ہیں اور زیادہ حقائق مخالف تو اس ترتیب بندی کو مفروضہ کہا جاتا ہے لیکن جس ترتیب بندی میں زیادہ حقائق موافق اور چند حقائق مخالف ہوتے ہیں، تو اس کو نظریہ سے یاد کیا جاتا ہے مگر جس ترتیب بندی میں تمام حقائق موافق ہوتے ہیں تو اس کو ثابت شدہ حقیقت مان لیا جاتا ہے۔

(خان۔ مذہب اور سائنس، ۱۹۸۱)

ارتقاء برسوں سے ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور آج شاہدی حقیقت اس کے خلاف نہیں ملی ہے خان، سائنس اور اجتہاد، ۱۹۷۶) اگرچہ چند غیر یا نیم سائنسداں ارتقاء کے خلاف لکھتے آئے ہیں بغیر کسی شاہدی حقیقت کے۔ اسی بنا پر ذہین اور صاحب مطالعہ مسلم مفکروں نے ارتقاء کی مخالفت نہیں کی ہے۔ خود مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی اور شیخ عبدہ وغیرہم ان مسلم مفکروں میں شامل ہیں۔

مسلمان اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ الہامی کتابیں

بھی خدا کی دین ہیں اور فطری قوانین بھی خدا کے تخلیق کردہ ہیں لہذا ان دونوں میں تضاد غیر ممکن ہے مگر فطری قوانین مشاہدی حقائق پر مبنی ہیں لہذا ان کو غلط قرار دینا ناممکن ہے لہذا الہامی کتابوں میں بیان کردہ واقعات یا قوانین اور مشاہدی حقائق یا فطری قوانین میں اگر تضاد نظر آتے ہیں تو یہ محض الہامی کتابوں کی تفسیرات کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ لہذا ارتقاء کے معاملے میں مسلم مفکرین میں اگر اختلاف ہے تو یہ محض تفسیر کی وجہ سے ہے۔

مذہبی حلقوں کی یہ عام روش ہے کہ وہ الہامی کتابوں کی قدیم تفسیر کو مسلمہ تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف تفسیر کرنے والوں کو اہل الرائے قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات سائنس کی ہر چیز کو خواہ وہ مشاہدی حقیقت ہی کیوں نہ ہو مشتبہ گردانتے ہیں۔ انہیں پس منظر میں ارتقاء کو مفروضہ یا افسانے سے یاد کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء ایک ثابت شدہ حقیقت ہے لیکن یہ تصور کہ ارتقاء کی تمام کڑیاں خود بہ خود وجود میں آتی ہیں اور ان میں خدا کا کوئی منصوبہ کارگر نہیں ہے غیر سائنٹیفک ہے مگر ملحدوں نے اس تصور کو سائنسی عقیدت کی حیثیت دے دی ہے جس کی مخالفت محض مذہبی حضرات ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ غیر جانبدار اور سچے سائنسدانوں کا بھی یہی موقف ہے (خان، دور جدید اور روح، ۱۹۸۵)

مولانا شہاب الدین ندوی صاحب مسلسل یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ علماء حضرات میں مشاہدی حقائق، مفروضہ، نظریہ اور ثابت شدہ حقیقت کے فرق کو واضح کریں۔ (میں نے بھی مندرجہ بالا تینوں کتابوں میں یہی واضح کرنے کی کوشش کی ہے) تاکہ علماء حضرات جدید تعلیم یافتہ حضرات کی نظر میں مضحکہ خیز نہ بنیں بلکہ عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور ان کے اسلامی خیالات

کو جدید تعلیم یافتہ حضرات میں مقبولیت حاصل ہو سکے اور وہ نبی کی وراثت کا
حق صحیح معنوں میں ادا کر سکیں لہذا پوری کتاب میں مولانا کی بھرپور کوشش یہ
رہی ہے کہ یہ ثابت کریں کہ دنیا کا پورا نظام خدا کے منصوبے کے مطابق
چل رہا ہے کہ ملحدوں کی یہ کوشش کہ دنیا کا پورا نظام بغیر خدا کے چل رہا ہے
سازش کا نتیجہ ہے مگر غلطی سے ارتقاء کے خلاف ثبوت فراہم کرنے میں
لگ گئے جو کتاب کا بڑا کمزور پہلو ہو کر رہ گیا ہے

(احسان اللہ)

بقیہ : اسلام کا نظام عدل

COMPLELLED TO MEN ONE THE NAMES OF ABUBAKR AND UMMAR.

THOUGHTHEY WERE MASTER OF A VERET EMRIRE YET THEY BINED. THE LIFE OF PURES.

("HARIJAN" Dated 27/7/37)

"یعنی سادگی کانگریس کی اجارہ داری نہیں۔ میں رام اور کرشن کا حوالہ
بھی اس سلسلہ میں پیش نہ کر سکوں گا کیونکہ ان کی شخصیتیں ماقبل از تاریخ کی ہیں۔ ا...
میں اس ضمن میں ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لینے پر مجبور ہوں کہ باوجود ایک وسیع مملکت کے حا...
ہونے کے ان نے انتہائی سادگی اور فقرانہ زندگی بسر کی۔"

جی ہاں کمال یہی ہے کہ غیر اور پرائے بھی اعتراف کمال اور اقرار حق پر مجبور ہیں

(بشکریہ نصرۃ الاسلام نمبر بابت ماہ نومبر ۱۹۸۴ء

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ صقلیہ۔ تاریخ ملت جلد ہفتم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ نہم سلاطین ہند اول۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب ۵۷ء سے پہلے اور انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، [illegible]

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط۔ امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے برعہد مغلیہ، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔ نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ۔ سرکشی ضلع بجنور۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات۔ لادینی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ بزم عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحئی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، اخبار التنزیل، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

D. (DN) 74 Phone : 262815 December 1986

965—57 Subs 45/- Per Copy Rs. 4-00

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006